اہل محبت واہل سلوک کے لئے قرآنی لائحہ عمل

بیان القرآن سے ماخوذ

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ

ترتیب انتخاب اور تشریح

محمد موسیٰ بھٹو

سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ

۰۰۱ بی - لطیف آباد نمبر ۴ - حیدر آباد

تعارف

اہم تفسیری نکات

(مولانا تھانویؒ کے مسائل السلوک کے حوالے سے گفتگو)

قرآن، اللہ کی ایسی کتاب ہے، جو انسان کے لئے دستور حیات کی حیثیت رکھتی ہے، اور اسے سلیقہ زندگی اور آداب زندگی سے آشنا کرتی ہے، قرآن میں وہ ساری بنیادی تعلیمات اور سارے اصول موجود ہیں، جن سے سیاست، معیشت، معاشرت، معاملات اور پوری اجتماعی زندگی کی پاکیزہ بنیادوں پر تعمیر وتشکیل کا کام ہوسکتا ہے۔ قرآن جہاں انسانی عقل کے لئے رہنمائی کا کام کرتا ہے، وہاں نفس کی تہذیب اور دل وروح کی تسکین کا بھی ذریعہ ہے، قرآن کی مثال اس سمندر کی سی ہے، جس میں قیمتی موتی وجواہر کے ساتھ دنیا میں موجود سارے پانی سے زیادہ پانی کا ذخیرہ موجود ہے، اب یہ انسانوں کا کام ہے کہ وہ سمندر سے موتی وجواہر لے یا پانی کے چند قطرے، سمندر تو پانی سے موجزن ہے، وہ سارا پانی دینے کے لئے بھی تیار ہے۔

قرآن میں انفرادی واجتماعی

زندگی کی بنیادی رہنمائی کا ہونا

اصولی تعلیمات کی حد تک قرآن میں انسان کی اجتماعی وانفرادی زندگی کی رہنمائی کا سارا انتظام موجود ہے، اس کی تفصیل وتشریح اللہ کے رسول کی احادیث اور سیرت پاک میں موجود ہے، اس سیرت پاک کا ایک ایک ورق ہمارے سامنے موجود ہے اور کتابی صورت میں مکمل طور پر محفوظ ہے۔

قرآن وسنت کی سب سے بڑی اہمیت

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ قرآن کی ایک بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس میں ہر دور کے حالات میں رہنمائی کا مکمل انتظام موجود ہے، جب کہ انسانی ذہن میں یہ صلاحیت موجود نہیں ہے، موجودہ دور مسلمانوں کی مظلومیت، بے بسی اور عالمی کفر کے غلبہ کا دور ہے، پھر

اس دور میں جن مسائل نے جنم لیا ہے، ہمارے فقہاء کرام ان مسائل کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے، اس لئے عہد جدید کے مسائل کی رہنمائی بھی ہمیں قرآن وسنت پر غور وفکر کے نتیجہ میں ہی مل سکتی ہے، یہ رہنمائی اس وقت حاصل ہوگی، جب دینی مدارس میں قرآن وسنت سے مسائل اخذ کرنے کا خصوصی اہتمام موجود ہو، مسلمانوں کے عروج کے دور میں وجود میں آنے والی فقہ یقیناً ہمارے لئے قیمتی سرمایہ ہے، اس سرمایہ کو بڑی حد تک پیش نظر رکھنا ناگزیر ہے، لیکن ہمارے لئے اس سے بھی زیادہ اصل سرمایہ قرآن وسنت ہے، اس کے نصوص کی روشنی میں ہم اپنے دور کے نئے پیچیدہ اور دشوار گزار مسائل میں رہنمائی کے لئے بصیرت اور اجتہادی صلاحیتوں کے حامل علماء کرام تیار کرسکتے ہیں، یہ ایسا دینی فریضہ ہے، جس سے عہدہ برآ ہوئے بغیر ہمارے لئے غلامی کے حالات سے نکلنا امر محال ہے۔

لیکن اس سے بھی زیادہ ہمارے لئے اصل اور فیصلہ کن مسئلہ قرآن وسنت کی روشنی اور سلف صالحین کے تتبع میں دینی، اخلاقی، روحانی تربیت اور تزکیہ کا مسئلہ ہے، جو ہمارے لئے موت وحیات کی حیثیت کا حامل ہے، اس سلسلے میں عہد جدید کی فکر سے مرعوبیت نے ہمارے بعض مفکریں اور بعض علماء کو اسلام کی ایسی تشریح کرنے پر اکسایا ہے، جس سے تزکیہ، تقویٰ، اخلاص وبے نفسی، باطنی بیماریوں کی اصلاح، تعمیر سیرت اور شخصیت کی روحانی نشوونما کا کام ثانوی اہمیت کا حامل ہوگیا ہے، جدید مفکرین کے علاوہ ہمارے اکثر علماء کرام اور دینی مدارس کے ہاں بھی تزکیہ اور تقویٰ کے اہتمام کی قابل ذکر حیثیت نہ رہی ہے، جس کی وجہ سے معاشرے کو اخلاقی مفاسد سے بچانے کے لئے درد مندی، فکرمندی اور دعوتی جذبے کے حامل علماء کرام کا غیر معمولی فقدان پیدا ہوگیا ہے۔

ہماری نظر میں یہ زیادہ ترنتیجہ ہے، ذہنی طور پر تزکیہ اور تقویٰ کے کام کے ادراک واہمیت کے فقدان کا۔

قرآن کا، ایمانی زندگی پر

سب سے زیادہ زور ہونا

قرآن جہاں اجتماعی ومعاشرتی زندگی کی اصلاح کا پروگرام پیش کرتا ہے اور انسانی زندگی کے ہر شعبہ کی اصلاح کے لئے دستور العمل پیش کرتا ہے، وہاں قرآن کا سب سے

زیادہ زور فرد کی ایمانی زندگی، اس کے اخلاق کی تعمیر، اس کے باطن کی اصلاح، اس کی دل کی پاکیزگی، نفس کی پاکیزہ بنیادوں پر تعمیر، اس کی تہذیب وتزکیہ، تعلق مع اللہ، اللہ سے والہانہ محبت، صبر وشکر، ذکر وفکر، عبادت ومعرفت، اخلاص وللھیت، تقویٰ وخشیت، دنیا سے استغنا، آخرت کی تیاری کی فکر، اللہ کے بندوں سے محبت، رواداری، تحمل وبربادی، دل وروح کی اللہ کی یاد سے سرشاری اور نفس کی دنیا میں موجود درندوں سے بچاؤ کی تعلیمات وغیرہ ہیں۔

تزکیہ سے عملی اجتماعی زندگی میں

اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی استعداد کا ہونا

تزکیہ وتہذیب نفس، تعلق مع اللہ اور اخلاص وللھیت، اللہ سے محبت اور اس کی معرفت یہ ایسی چیزیں ہیں، جس سے انسانی شخصیت میں اجتماعی ومعاشرتی وعملی زندگی میں قرآنی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی استعداد ابھرتی ہے اور اس کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، یعنی یہ چیزیں اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کے لئے بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں، ایمان کی طاقت، توحید میں رسوخ اور صبغۃ اللہ سے ہی انسانی شخصیت اس قابل ہوتی ہے کہ وہ زندگی بھر کے معاملات میں قرآنی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کے قابل ہو سکے۔

قرآنی تعلیمات کی تشریح وتفصیل پر مشتمل بہت ساری تفاسیر لکھی گئی ہیں، ان میں ایک تفسیر حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ''بیان القرآن'' کے نام سے ہے، جو دوسرے تفاسیر سے اس اعتبار سے مختلف وممتاز ہے کہ اس میں ''مسائل السلوک'' کے نام سے تزکیہ واحسان اور تصوف اور تہذیب نفس، تعلق مع اللہ اور اہل اللہ کی اہمیت، ان کی صحبت کی خصوصیات، اللہ کی محبت کی راہ کے نشیب وفراز اور دل وروح کی تازگی وپاکیزگی، اخلاص وللھیت جیسے موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔

تکبر وانانیت کے جراثیم کی موجودگی میں

اللہ سے قربت کا مسدود ہونا

علمائے ربانی کا بیان کردہ یہ نکتہ بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ بندہ مومن کے سارے انسانی جوہروں سے بہرہ وری اور عبدیت کے آداب کی بجا آوری کا سارا تعلق

تواضع، عاجزی، اپنی انانیت سے دستبرداری اور فنائیت سے وابستہ ہے، اس لئے کہ جس دل میں انانیت اور کبر کے بت مستحکم ہوں گے، ایسا فرد عزازیل (شیطان) کی راہ پر ہی گامزن ہوسکتا ہے۔ وہ دل اللہ سے قریب نہیں ہوسکتا، بظاہر چاہے ایسے افراد میں کتنی ہی رسمی دینداری موجود ہو۔ چنانچہ قرآن میں فرمایا گیا وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ (خوشخبری ہے عاجزی اختیار کرنے والوں کے لئے) حدیث شریف میں فرمایا گیا کہ جو تواضع (عاجزی) اختیار کرتا ہے، اللہ اس کے درجے بلند کر دیتا ہے۔

دوسری حدیث شریف ہے، وہ شخص ہلاک ہو، جس کی طرف اس کی شہرت کی وجہ سے انگلیاں اٹھنے لگیں، یہ شہرت چونکہ اپنے ساتھ انانیت کے جذبات لاتی ہے، اس لئے اس شہرت کو ہلاکت کا موجب قرار دیا گیا، لیکن جس شہرت میں انانیت کی بجائے فنائیت غالب ہو، وہ انعام ہے، جو اللہ کی طرف سے فرد کو عطا ہوتا ہے۔ تواضع کی راہ ایسی ہے، جو بندہ مومن کو سیکھنے سمجھنے، اللہ سے قربت کے مقامات طے کرنے، اللہ کے بندوں کے لئے شفیق ہونے اور اوصاف حمیدہ کا حامل ہونے کا ذریعہ ہے۔

تواضع سے محرومی کے نقصانات

تواضع سے محرومی اور کبر وانانیت کے جراثیم ایسے ہیں، جو بندہ کے لئے اللہ سے دوری، نفسی خرابیوں سے عبارت ہونے، بلکہ نفس کے شیطان کے مسلط ہونے کا ذریعہ بنتی ہے، نیز ایسے افراد کے لئے قرآن وسنت سے حقیقی استفادہ کی راہیں بند کردی جاتی ہیں۔

تصوف واحسان اور تزکیہ کی حامل شخصیتوں یعنی اہل اللہ کا کہنا ہے کہ نیکی اور خیر کے سارے دروازے کھلنے کی چابی یہی ہے، یعنی عاجزی، فنائیت، اپنی ذات کی نفی، تکبر وانانیت سے دستبرداری اور تواضع وعاجزی کے جوہروں کا ہونا۔

بندوں کے بندے ہونے کا سارا راز اس بات سے وابستہ ہے کہ وہ اللہ کے لئے پامال ہوجائے اور اپنی شخصیت کو مٹادے اور فنا کردے، دوسری صورت میں اللہ اور بندے کے درمیاں حجابات قائم رہتے ہیں۔

قران میں تزکیہ کا ذکر ہے، بلکہ اللہ کے رسول ﷺ کے بعثت کا بڑا مقصد تزکیہ بتایا گیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس بھیجتے ہوئے فرمایا گیا ہے "اذْهَبْ إِلَى

فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى" (فرعون کے پاس جاؤ اسے کہو کہ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارا تزکیہ ہو) لیکن فرعون نے تکبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے عاجزی اور تزکیہ کی راہ پر آنے سے انکار کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ انانیت اور تکبر کے بت ایسے طاقتور ہیں کہ وہ فرد وافراد کے لئے تزکیہ کی راہ پر آنے کے لئے حجاب اکبر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

الغرض یہ کہ عبدیت کی راہ اختیار کرنے (جو انسانیت کا سب سے بڑا شرف ہے) اس کے لئے ضروری ہے کہ فرد، نفس کے خلاف سخت مجاہدے کر کے، اسے مہذب بنا لے اور اللہ کے سامنے اپنی ہستی کو مٹا دے، اور تواضع وعاجزی کے اس مقام پر پہنچے، جہاں اس کی شخصیت میں بڑے پن کے اثرات کالعدم ہو جائیں اور وہ اللہ کے بندوں کے سامنے بھی تواضع وعاجزی کا نمونہ بن جائے، تا کہ اس کی ہر ادا اس کی عبدیت کے مظاہرے کا ذریعہ بن جائے۔

شخصیت کو مٹا کر اسے انسانی جوہروں سے بہرہ ور کرنے کا یہ راستہ ایسا ہے، جو رسول اللہ ﷺ کی ختم نبوت کے طفیل علمائے ربانی کے حوالے ہوا ہے، اس لئے فرمایا گیا کہ میری امت کے علمائے (ربانی) کی مثال بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہے۔

حکیم الامت نے ''بیان القرآن'' کے حواشی میں سب سے زیادہ اسی اہم موضوع کو بنیاد بنایا ہے اور راہ محبت وراہ سلوک کے مسائل کو قرآنی آیات کے حوالے سے ثابت کرنے اور پیش کرنے کی کوشش فرمائی ہے، موجودہ دور کے انسان کے لئے اس کام کی اہمیت اس لئے فیصلہ کن ہے کہ وہ عام طور پر کبر وانانیت کا مریض بن چکا ہے، تواضع وعاجزی اس سے رخصت ہو چکی ہے اور دینداری میں بھی عام طور پر عاجزی کے اجزاء بڑی حد تک مفقود ہو گئے ہیں، اس لئے موجودہ دور میں ان حواشی اور اس کی تشریح کا کام وقت کی اہم ضرورت ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے اللہ تعالیٰ نے اس دور میں امت کی اصلاح ورہنمائی کا جو کام لیا ہے، وہ عظیم الشان کام ہے، ایک طرف تو ان کا علمی کام ہے، لگ بھگ ہر اہم موضوع پر انہوں نے ایسا علمی کام کیا ہے، جس کی اس دور میں کوئی مثال نہیں ملتی، ان کا یہ علمی کام انشاء اللہ مزید سو دو سو سال کی رہنمائی کے لئے کافی وشافی

ثابت ہوگا، بالخصوص اصلاح نفس، تزکیہ نفس، تہذیب نفس اور مسلم نفسیات، تصوف کی صحیح خطوط پر تدوین، اخلاق ومعاملات کی بہتری، بدعات کی رد اور قرآن واحادیث سے نئے نئے اہم نکات نکالنے کے حوالے سے ان کا کام مسلم تاریخ کا سب سے بڑا علمی کام ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ مولانا کے اس علمی کام کو وقت کے تقاضوں کے تحت نئے اسلوب میں آسان اور عام فہم انداز میں پیش کیا جائے اور اسے صحیح تشریحات کے ساتھ پیش کرنے کی کوششیں کی جائیں، دکھ کی بات ہے کہ اس سلسلہ میں کافی غفلت کا مظاہرہ ہو رہا ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ خود دیوبند فکر کے علماء کی اکثریت مولانا کے عظیم الشان علمی کام کی اہمیت، افادیت اور اس کی قدر وقیمت سے واقف نہیں، مولانا کی فکر سے ناآشنائی کی وجہ سے ان کے مزاج میں علمی گہرائی اور معاملات کو ہمہ پہلو انداز سے دیکھنے کی صلاحیت کا فقدان محسوس رہا ہے۔

علمی کام کے ساتھ ساتھ خلفاء کی تیاری کا کام

حکیم الامت کے کام کی دوسری نوعیت ان کے تیار کردہ خلفاء اور مجاز بن صحبت کی صورت میں تھی، ہندستان کے ہر علاقہ میں مولانا کے خلفاء موجود تھے، جو زہد، تقوئی، بزرگی، فیض رسانی، توازن واعتدال اور اتباع سنت کے اعتبار سے مثالی بھی تھے تو اپنی ذات میں انجمن بھی، انہوں نے اپنے اپنے علاقوں میں لوگوں کی اصلاح کا بڑا فریضہ سرانجام دیا۔

ذکر وفکر کے مجاہدوں کی اہمیت
اور اس دور میں مولانا تھانویؒ کے حلقہ کی طرف سے اسے ثانوی اہمیت دینا

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ حکیم الامت مولانا تھانویؒ اس دور میں تجدید احیائے دین کی بڑی عظیم شخصیت تھے، لیکن یہ دیکھ کر بڑی اذیت محسوس ہوتی ہے کہ اس دور میں مولانا تھانویؒ کے حلقہ سے وابستہ بزرگوں کی بہت بڑی اکثریت نے تصوف واحسان سے ذکر وفکر کے مجاہدوں کو حذف کر دیا ہے اور تصوف کو نظر کی حفاظت، اصلاح

معاملات پر زور اور خطوط کے ذریعہ رابطہ اور کچھ اوراد تک محدود کردیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ تصوف نام ہی اہل اللہ کی صحبت کے ماحول سے وابستہ ہوکر، ذکر وفکر کے غیرمعمولی مجاہدوں سے کام لینے کا ہے، سارے اکابر بزرگان دین کا اس بات پر اجماع ہے، جو قرآن وسنت کے نصوص سے ماخوذ ہے کہ ذکر وفکر کے مجاہدوں کے بغیر فرد وافراد کی اصلاح نہیں ہوسکتی، خود مولانا تھانویؒ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو جو مقام ملا ہے، وہ ذکر وفکر کے غیرمعمولی مجاہدوں کی برکت سے ہی ملا ہے، ان کے مجاہدے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس دور میں بھی ایسے مجاہدے ہوسکتے ہیں۔

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا تھانویؒ دونوں لگ بھگ سولہ سال تک حالت سکر میں رہے اور آتش عشق میں جلتے رہے، اس دوران ذکر وفکر ہی ان کا سب سے بڑا مشغلہ رہا، دوسرے کاموں سے ان کی طبیعت اچاٹ رہی اور ضروری کام جبری طور پر سرانجام دیتے رہے، حکیم الامت کے ''بیان القرآن'' نے ''مسائل السلوک'' کے حواشی میں ذکر وفکر کے مجاہدوں پر جو زور دیا ہے، وہ بہت زیادہ زور ہے، اور قرآنی آیات کی تشریح میں دو ٹوک طور پر یہ بات دہرائی ہے کہ ذکر وفکر کے غیرمعمولی مجاہدوں کے بغیر تہذیب نفس اور اصلاح نفس کا کام نہیں ہوتا اور سکون وسکینت بھی نہیں مل سکتی۔

لاکھوں بزرگان دین کا آتش عشق میں جلنے کے عمل کا ہونا

اگر معاملات کی اصلاح اور نگاہ کی حفاظت پرزور دینے اور خطوط کے ذریعہ محض بزرگوں سے رابطہ رکھنے سے تزکیہ کا عمل سرانجام ہوتا اور نفس کی فنائیت کا معرکہ سرانجام ہوتا تو لاکھوں بزرگان دین، طویل عرصے تک اللہ کی محبت اور کثرت ذکر وفکر کے ذریعہ آتش عشق میں نہ جلتے، اس سلسلہ میں کتابیں ان کے مجاہدوں کے ذکر سے بھری ہوئی ہیں، بزرگان دین کا اجماع اور قرآن کی بیسیوں آیتیں اور سینکڑوں احادیث اس بات کا واضح اعلان ہیں کہ اللہ کے کثرت ذکر کے بغیر شخصیت کی باطنی اصلاح نہیں ہوسکتی اور اس کی سیرت وکردار میں پاکیزگی پیدا نہیں ہوسکتی، اور حب جاہ وحب مال جیسے امراض سے بچنا اس کے لئے محال ہے اور تعمیر سیرت کے کام کا سارا تعلق ذکر وفکر ہی سے وابستہ ہے۔

آتش عشق کی بھٹی کا ذکر سے جلتے رہنا

ذکر وفکر کے سلسلہ میں اصل زور اللہ کے اسم ذات اور لا الہ الااللہ کے ذکر پر ہے، جو چودہ سو سال سے امت کے سارے بزرگان دین کا معمول اور ان کا ورثہ ہے، عشق وسلوک کے سارے مراحل اسی سے طے ہوتے ہیں، راہ محبت وراہ سلوک تو آتش عشق ہے، آتش عشق کی یہ بھٹی ذکر سے ہی جلتی ہے، یعنی ذکر اس بھٹی کے لئے ایندھن کی حیثیت رکھتا ہے۔

چھوٹے چھوٹے کروڑہا دجال کا پیدا کردہ فساد اور اس سے بچاؤ کی صورت

موجود دور میں جب کہ دجال کے ظہور سے پہلے کروڑہا کی تعداد میں چھوٹے چھوٹے دجال پیدا ہوچکے ہیں، جنہوں نے ابلاغ کے طاقتور ترین ذرائع سے پوری دنیا کی فضا کو ظلمات سے بھر دیا ہے، انسانی شخصیت اور اس کی نفسیات کو سحر زدہ کردیا ہے اور ان کے یہ آلات ہر فرد تک یہاں تک کہ دینی مدارس کے طلبہ تک پہنچ چکے ہیں، ان آلات میں ایسا غلیظ ترین گند اور جنس زدگی کی ایسی بدترین صورتیں موجود ہیں کہ فرد اگر روزانہ آدھ گھنٹے تک ان آلات کے ذریعہ مادی حسن اور جنس زدگی کے مظاہر دیکھے گا تو اس کا نور ایمان مدہم سے مدہم تر ہوتا جائے گا اور وہ فکری انتشار وخلفشار اور دل کی تاریکی سے دوچار ہوئے بغیر نہ رہ سکے گا، اب جبکہ دینی مدارس میں میٹرک تک جدید تعلیم کے اجراء کا عمل بھی شروع ہوچکا ہے تو ایسی صورت میں اللہ کے ذکر کے نور واجزاء حسن اور ذکر کے ذریعہ توانائی کے حصول کی زیادہ شدید ضرورت ہے۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حلقے سے وابستہ بزرگان، جو دینی مدارس کے ذریعہ بھی خدمات سرانجام دے رہے ہیں، ان کے بارے میں ہماری یہ آرزو وتمنا ہے کہ وہ دور جدید کے مادیت کے تیز ترین سیلاب کو دیکھتے ہوئے، دینی مدارس میں ظاہری تعلیم کے ساتھ اللہ سے محبت ومعرفت کی فضا پیدا کرنے اور عشق کے اجزاء سے بہرہ وری کے کام کو فیصلہ کن اہمیت دینا فرمائیں اور اس کا خصوصی اہتمام فرمائیں، بالخصوص آخری دو تین سال کے طلبہ کے لئے راہ سلوک کے کام کو نصاب کی سی اہمیت سے اختیار فرمائیں، اس لئے کہ اس کے بغیر نفس پرستی کی ہولناک قوتوں سے بچنا اور مادیت کے سیلاب سے

حفاظت کا کام امر محال ہے۔

بالخصوص اس دور میں جہاں دینی علوم کی سخت ضرورت ہے اور کسی حد تک جدیدیت سے آشنائی کی بھی، وہاں اللہ سے عشق ومحبت اور معرفت کی اس سے زیادہ ضرورت ہے، اس لئے کہ تزکیہ (جو دین کا حاصل ہے) اس کا سب سے مؤثر ذریعہ اللہ سے محبت ومعرفت ہی ہے اور اللہ کی یہ معرفت اللہ کے ذکر اور صحبت اہل اللہ کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتی، حقیقت یہ ہے کہ بالخصوص اس دور میں اللہ سے محبت اور ذکر کے مزاج کی پختگی کا کام ایسا ہے، جو دینی تعلیم کے حصول کی طرح ناگزیر ہے، اس لئے کہ معاشرے کے ہمہ گیر فتنوں سے بچاؤ، دنیا کی حرص وہوس سے حفاظت، اسلامی شریعت پر عمل پیرا ہونے کی استعداد، ظاہر وباطن میں یکسانیت، مادی حسن پر فریفتگی سے بچاؤ، نگاہوں کی حفاظت، قلب کے مفتی کی بیداری، محبت ومعرفت کے اجزاء سے بہرہ وری، معاشرے کی اسلامی خطوط پر تبدیلی کے کام کی استعداد اور مزاج کے خلاف باتیں سننے کا حوصلہ وغیرہ ان ساری چیزوں کا تعلق اللہ کے ذکر کے استحکام سے وابستہ ہے۔

ذکر وفکر کے مجاہدوں کی قیمت پر اصلاح معاملات پر زور ہونا

حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ کی شخصیت سے متعلق موجودہ دور کے ان بزرگوں کی اکثریت میں غالباً ایک غلط فہمی یہ پیدا ہوئی ہے کہ چونکہ ان کی کتابوں بالخصوص ان کی ملفوظات میں اصلاح معاملات اور معاشرتی امور کی بہتری پر سب سے زیادہ زور ہے، اس سلسلہ میں زیادہ اصرار کے ساتھ ساتھ حکیمانہ نکات بھی موجود ہیں، اس معاملہ میں مولانا بہت زیادہ حساس تھے، یہاں تک کہ ڈانٹ ڈپٹ سے بھی کام لیتے تھے، جب کہ ذکر کے معاملہ میں ان کے یہاں اتنا اصرار اور سختی موجود نہیں ہے، چنانچہ اس سے یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ ذکر وفکر کے مجاہدوں کے مقابلہ میں اصلاح معاملات کی اہمیت مقدم ہے، جب معاملات میں درستگی پیدا ہوجائے گی اور معاشرتی امور میں شریعت سے ہم آہنگی ہوجائے گی اور نگاہ کی حفاظت ہوجائے گی تو اس سے اصل مقصد حاصل ہوجائے گا اور ذکر کے مجاہدوں کی اہمیت باقی نہ رہے گی۔

اس عاجز کی نظر میں یہی وہ غلط فہمی ہے، جس کی وجہ سے حکیم الامت کی تیسری نسل

کے سلسلہ کے بزرگوں کی طرف سے ذکر کے مجاہدوں کے کام کو ثانوی حیثیت دی گئی ہے، اور اب چوتھی نسل کے بزرگوں کے یہاں تو ذکر کی اہمیت کے ادراک میں بھی کمی واقع ہورہی ہے۔

ہم حکیم الامت کے سلسلہ کے موجودہ بزرگوں سے معافی کے خواہاں ہیں کہ ہم ان کے سامنے اپنی حیثیت سے بڑھکر گفتگو کررہے ہیں، جو ایک اعتبار سے گستاخی کے ضمن میں بھی شامل ہوسکتی ہے، لیکن یہ گستاخی یا یہ جسارت نہ چاہتے ہوئے بھی ہم سے اس لئے ہورہی ہے کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ مجاہدوں کی کمی یا اس کے نہ ہونے کی وجہ سے ان کے حلقہ سے وابستہ افراد کی اصلاح کا عمل متاثر ہے اور جدیدیت کے ہولناک طوفان سے بچاؤ کی صورتیں مسدود ہورہی ہیں، امید ہے کہ ہماری اس جسارت کو اخلاص، دردمندی وفکرمندی پر مشتمل ہونے کی وجہ سے اسے محسوس نہ کیا جائے گا اور اسے ہمارے دلی اضطراب پر محمول سمجھ کر اس پر غور وفکر کیا جائے گا۔

تجدید احیائے دین کی شخصیتوں کی ایک اہم خصوصیت

اس مغالطے کے سلسلہ میں ہم ایک بات تو یہ عرض کریں گے کہ تجدید احیائے دین کی شخصیتوں کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ان کے دور میں امت جن سنگین، مسائل ومعاملات اور اخلاقی نوعیت کی جن خرابیوں میں مبتلا ہوتی ہے، ان کی اصلاح ان کے اہداف میں شامل ہوتی ہے، وہ ان خرابیوں کی ایک ایک کرکے نشاندہی کرتے ہیں، اور ان سے بچنے کے لئے تدابیر بتانے کے ساتھ ساتھ ان پر زیادہ زور دیتے ہیں، تاکہ افراد معاشرے میں ان خرابیوں سے بچاؤ کے سلسلہ میں فکرمندی اور حساسیت پیدا ہوسکے۔

ذکر وفکر کے مجاہدوں کا تصوف واحسان کی بنیادوں میں شامل ہونا

اس سلسلہ میں دوسری گذارش جو ہم کریں گے، وہ یہ ہے کہ اصلاح معاملات پر زور دینے کا مطلب تصوف واحسان کی اصل بنیاد ذکر وفکر کے مجاہدوں کی نفی یا ان کی قدر وقیمت اور اہمیت میں کمی ہرگز نہیں ہوتی، اس لئے کہ تجدید احیائے دین کی ہر شخصیت، اسلام کی اس روح سے پوری شرح صدر کے ساتھ آشنا ہوتی ہے کہ اللہ کا ذکر ایسی چیز

ہے، جس کا کوئی بدل ہی نہیں، نیز ذکر کی قیمت پر اصلاح معاملات کا فریضہ سرانجام ہی نہیں ہوسکتا، اس لئے بھی کہ ایمان کے بعد اسلام کی ساری عمارت ذکر وفکر کے مجاہدوں ہی پر کھڑی ہے، قرآن وسنت میں جن چیزوں پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے، ان میں ذکر کو پہلی یا دوسری ترجیح حاصل ہے، "یا ایھا الذین آمنوا لذکر اللہ ذکراً کثیراً" یا "**وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ**" حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر نبی کو فرمایا جارہا ہے: "**اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوكَ بِاٰيَاتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ**" (اے موسیٰ تم اور تیرے بھائی میری آیتیں لے کر فرعون کے پاس جاؤ، لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے ذکر سے غافل ہوجاؤ) "**وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ**" (اور اس شخص کی بات نہ مان جس کا دل ہمارے ذکر سے غافل ہے اور وہ خواہشات کا پیروکار ہے۔)

اس آیت سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ذکر سے غافل دل خواہشِ نفس کی پیروی سے نہیں بچ سکتی، قرآن کی یہ اور اس طرح کی بیسیوں آیتیں ہیں اور بے شمار احادیث ہیں، جن میں ذکر پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ذکر دین کے مقاصد میں شامل ہے، نیز ذکر کے بغیر قلب میں وہ نور، وہ حسن اور وہ توانائی پیدا نہیں ہوسکتی، جس سے اللہ کی رضامندی کا جذبہ غالب ہوسکے اور اصلاح معاملات کی بہتر اور پاکیزہ صورت پیدا ہوسکے، اخلاص وللھیت کا احساس طاقتور ہوسکے، نیز شریعت پر عمل پیرا ہونے میں آسانی پیدا ہوسکے۔

دین کے سارے معاملات اور ساری تعلیمات کو اجاگر کرنا اور اس پر زور دینا، ایک اعتبار سے بہت ضروری ہے، اس کی اہمیت سے انکار نہیں، لیکن جب یہ سارے کام ذکر کی قیمت پر ہوں یعنی ذکر کی فیصلہ کن اہمیت کو ثانوی حیثیت دینے پر ہوں، تو اس طرح کی تلقین قیل وقال سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، نفس کی خوفناک قوت سے اسلامی شریعت ہضم کرانا اور ایمان کو دل کی گہرائیوں میں جاگزین کرنا، یہ ذکر کے مجاہدوں ہی پر منحصر ہے، اس لئے قرآن میں فرمایا گیا: "**وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ**" (جو شخص اللہ کے ذکر سے اندھا ہوجائے، ہم اس پر شیطان مسلط کردیتے ہیں سو وہ اس کے ساتھ رہتا ہے اور وہ ان کو راہ (راست) سے روکتے رہتے ہیں اور (جب کہ) وہ خیال کرتے ہیں کہ وہ راہ (راست) پر

ہیں۔)

حکیم الامت اور ان کے خلفاء کا ذکر وفکر کے غیر معمولی مجاہدوں سے گذرنا

اس سلسلہ میں تیسری اہم بات جو ہم عرض کریں گے، وہ یہ ہے کہ جب حکیم الامت مولانا تھانویؒ خود ذکر وفکر کے مجاہدوں کے غیر معمولی حالات سے گزرے اور انہوں نے اپنے خلفاء کو بھی ذکر وفکر کے غیر معمولی مجاہدوں سے گذارا تو ان کا یہ عمل خود بتاتا ہے کہ مجاہدوں کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں، ذکر وفکر کے مجاہدوں میں اضطراری مجاہدے (جو بالخصوص بے پناہ قبض کی صورت میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں) وہ تو ازخود شامل ہوجاتے ہیں، جس سے نفس کی قوت پامال ہوتی رہتی ہے۔

قرآنی حواشی میں مجاہدوں کے کام پر غیر معمولی زور ہونا

چوتھی بات یہ ہے کہ حکیم الامت نے قرآنی حواشی میں ذکر وفکر کے مجاہدوں پر جو زور دیا ہے، وہ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے کافی ہے کہ ان کی نظر میں مجاہدوں کے بغیر محض معاملات پر زور دینے سے تہذیب نفس کا عمل تکمیل پذیر نہیں ہوتا، اور فرد وافراد سے پاکیزہ اعمال کا صدور محال ہوتا ہے۔

''مسائل السلوک'' کے مطالعہ سے یہ بات دو اور دو چار کی طرح واضح ہوتی ہے کہ حکیم الامت نے جس طرح اللہ کی محبت اور ذکر پر غیر معمولی زور دیا ہے کہ اگر ان کے حلقہ سے وابستہ افراد اس سلسلہ میں خصوصی اہتمام فرمائیں اور مدارس کے ماحول میں عشق کی حرارت وگرمی کی تیزی کی صورت پیدا فرمائیں تو ہم یقیناً معاشرے کو ایسے عالم وباعمل اور عارف علماء فراہم کرسکتے ہیں، جو اللہ کی محبت کے رنگ میں رنگ کر معاشرے کو مادیت کے سیلاب سے بچانے میں فیصلہ کن کردار ادا کرسکتے ہیں، ورنہ محض ظاہری علوم اور میٹرک تک انگریزی تعلیم سے مدارس سے نکلنے والے علماء کرام نہ صرف یہ کہ معاشرے کو جدیدیت کے تیز تر سیلاب سے بچانے کے سلسلہ میں کوئی خاص کردار نہ کرسکیں گے، بلکہ ان کے لئے خود بھی اس سیلاب سے بچنا دشوار ہوگا۔

مولانا تھانویؒ کی کتاب کے حوالے سے یہ دردمندانہ التجا کی گئی ہے، اللہ کرے یہ

آواز، صدا بصحرا ثابت نہ ہو۔

یہاں اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ہماری زیر نظر کتاب میں تفسیری نکات کی پیشکش یا ہماری دوسری کتابوں میں اصلاح نفس، خود احتسابی، معرفت، اخلاقی رزائل وغیرہ کے حوالے سے جو بھی مواد موجود ہے، وہ سب اس عاجز کے شیخ ومربی حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰؒ کی صحبت ہی کا فیض ہے، اس عاجز کو ان کی ۷اسال تک مسلسل صحبت حاصل رہی، جس سے اپنے نفس کے مکر وفریب اور اس کی واردات کے حوالے سے بہت سے حقائق کا علم بلکہ مشاہدہ ہوا، نفس کی ان حالتوں کے مشاہدے کی وجہ سے انسانی نفسیات، فرد وافراد کی اصلاح کے حالات ومراحل کو سمجھنے کا موقعہ ملا، اپنی علمی کم مائگی کے باوجود حکیم الامت جیسی تجدید احیائے دین کی ممتاز شخصیت کے کام کو تشریح کے ساتھ پیش کرنا، یہ اہل اللہ کا فیض نظر ہی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سیہ کار کے اس کام کو اپنے ہاں قبولیت کا شرف عطا فرمائے۔ (آمین)

''مسائل السلوک'' کا انتخاب اور اس کی تشریح پیش کرنے کی ایک تو ضرورت اس لئے تھی، تاکہ اصلاح نفس کے حوالہ سے قرآن کی روشنی میں حکیم الامت نے جو لائحہ عمل پیش فرمایا ہے، اسے نئے اسلوب میں یاددہانی کے لئے پیش کیا جائے، اس کا دوسرا مقصد اپنی ذاتی اصلاح بھی ہے کہ مولانا تھانوی کی تحریروں سے مجھے ایک طرح کا عشق ہے، ان کی تحریریں میرے ایمان وعشق میں جوش پیدا کرنے کا ذریعہ بنتی ہیں، ''مسائل السلوک'' پر کام کرنے کے دوران اگرچہ اس عاجز کی ذہنی تکان بڑھی ہے (جو کافی عرصہ سے تھی) لیکن اس سے میرے ایمان ویقین میں تازگی بھی ہوئی ہے، یہ مسائل السلوک میرے لئے مستقل مطالعہ کا ذریعہ بھی ہیں، کتابی صورت میں آنے سے مجھے اس سے آسانی سے استفادہ کا موقعہ ملتا رہے گا۔ (انشاء اللہ تعالیٰ)

اس عاجز نے حضرت مولانا حافظ فضل الرحیم صاحب کے ''تسہیل بیان القرآن'' سے بھی ایک حد تک استفادہ کیا ہے، موصوف بڑی فاضل شخصیت ہیں، جامعہ اشرفیہ لاہور کے مہتمم ہیں، اس عاجز سے محبت کا تعلق رکھتے ہیں، ان سے ہمارا ایک اہم مشترکہ تعلق یہ ہے کہ مولانا تھانویؒ اور مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ہم دونوں کی محبوب شخصیتیں

ہیں، ان دونوں کے فکر پر کام کرنا ہم دونوں کے اہداف میں شامل ہے۔

موصوف نے ''تسہیل بیان القرآن'' کو بہت سہل انداز اور سلیقہ سے جدید اسلوب میں پیش فرمایا ہے، ان کے سامنے جدید طبقات ہیں، جنہیں موصوف ''بیان القرآن'' کے مفہوم وروح سے آشنا کرانا ضروری سمجھتے ہیں، چنانچہ انہوں نے ''تسہیل بیان القرآن'' میں مولانا کے اپنے الفاظ کو پیش نظر رکھنے سے زیادہ ان کے مفہوم ومطلب کو پیش فرمایا ہے، جب کہ اس عاجز کی کوشش یہ ہے کہ اس انتخاب میں مولانا کے اپنے الفاظ ہوں، البتہ ہر مشکل لفظ کو سہل لفظ میں تبدیل کردیا جائے، تاکہ مولانا کے اپنے الفاظ کی تاثیر بھی قائم رہے اور مشکل الفاظ کی آسانی کی وجہ سے جدید افراد کے لئے انکے فہم کی صورت بھی پیدا ہو۔

ہمیں جہاں بھی مولانا کے دقیق حواشی کو آسان الفاظ میں پیش کرنے میں دشواری پیش آئی ہے، وہاں ہم نے حضرت مولانا حافظ فضل الرحیم صاحب کے ''تسہیل بیان القرآن'' سے استفادہ کیا ہے، جس کے لئے ہم ان کے ازحد ممنون بھی ہیں تو دعاگو بھی۔

اللہ تعالیٰ ان کو اجر عظیم عطا فرمائے اور انہیں سعادت دارین نصیب فرمائے۔

میں اپنے مخلص ساتھی وعزیز انوار الحسن صاحب کا ازحد ممنون ہوں کہ انہوں نے زیر نظر کتاب کے پروف پر محنت کی، اس کی ترتیب کو درست کیا، موصوف ہماری دوسری کتابوں اور بیداری کی پروف ریڈنگ میں بھی معاونت کرتے رہتے ہیں، وہ ہمارے کام کو اپنا کام سمجھکر ہر ممکن حد تک تعاون کرتے رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں اجر عظیم عطا فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ (آمین)

۱۲ مارچ ۲۰۱۸ء

محمد موسیٰ بھٹو

مقدمہ

اللہ کے طالب کے حالات اور اس کا حاصل مشاہدہ

اللہ کے طالب کی چاہت صرف ایک ہے، وہ اللہ کے قرب کے مقام کا حصول اور اللہ کے وصال کی حالت ومنزل ہے، بندہ مومن کی ساری مشقتوں کا ہدف یہی ہوتا ہے، اللہ کے وصال کی منزل ایسی چیز نہیں ہے، جو گری پڑی ہو، جسے ایک لمحہ میں اٹھایا جائے، بلکہ یہ کام دنیا کے سارے کاموں سے زیادہ مشکل ترین ہے، جو کام مشکل ہوتا ہے، اس کے لئے مجاہدے اور کاوشیں بھی زیادہ ہوتی ہیں، جس طالب نے اللہ کے وصال کا دعویٰ کیا ہے، اس دعویٰ کے لئے اسے ففروا الی اللہ (اللہ کی طرف دوڑو) کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے، اور اس منزل کے حصول کے لئے اپنی ساری توانائیوں کو صرف کرنا پڑتا ہے، اس کے بغیر اللہ نہیں مل سکتا، اور اس کا قرب حاصل نہیں ہوسکتا۔

ویسے بھی مومنوں نے اپنی جان ومال کو جنت کے بدلے میں فروخت کردیا ہے، "ان اللہ اشتریٰ من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنة" اللہ نے اپنے قرب ووصال کی قیمت یہ رکھی ہے کہ اس کے لئے جتنے بھی مجاہدے کئے جاسکتے ہیں اور اس کی راہ میں جتنا بھی خون جگر خرچ کیا جا سکتا ہے اور فرد اپنی بساط کے مطابق جتنی بھی کاوشیں کرسکتا ہے کرے، ایسے طالبوں کے لئے ہی اللہ کا وعدہ ہے، "والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا" (جو ہمارے لئے مجاہدے کرتے ہیں، ہم ان کو راستے نکال کردیتے ہیں،) یہ اللہ کا وعدہ ہے، جو اس نے اپنے حقیقی طالبوں کے ساتھ کیا ہے، لیکن یہ مجاہدے ان تھک ہوتے ہیں اور خون کا آخری قطرہ تک اس کے لئے استعمال ہوتا ہے، ان مجاہدوں کے دوران ادھر ادھر دیکھنے سے پرہیز کرنا چاہئے، ان مجاہدوں میں تسلسل واستقامت ہونی چاہئے، ان مجاہدوں میں دنیا، دولت اور مادی مفادات کی آمیزش نہ ہونی چاہئے، اللہ کی ہستی مقدس اور پاک ہے، وہ طالب سے بھی پاکیزہ احساسات وجذبات اور اخلاص کا اعلیٰ درجہ چاہتی ہے، جس نے اللہ کے وصال کا دعویٰ کیا ہے، اسے قدم قدم پر آزمائشوں سے گذارا جاتا ہے، یہ آزمائش نامساعد مالی حالات کی صورت میں بھی ہوتی ہے، تو کبھی صحت

کی خرابی اور بعض اوقات اپنوں اور غیروں سب کی مخالفت کی صورت میں بھی ہوتی ہے، یہ آزمائش سب سے کٹ کر، محض اللہ کے لئے یکسو ہوجانے کی صورت میں ہوتی ہے تو کیفیات کی مسلسل سلبی وبحالی کی صورت میں بھی۔

جو طالب آزمائشوں کی اس بھٹی سے گذرنے کے لئے تیار نہ ہو، وہ اللہ کے وصال کے دعویٰ میں صادق نہیں ہوسکتا، اس طرح کے افراد کو دنیا میں سے کچھ حصہ دے کر ان کا معاملہ دنیا میں ہی نمٹایا جاتا ہے، اور انہیں اللہ کے قرب ووصال کی نعمت عظمٰی سے محروم رکھا جاتا ہے۔

چونکہ ایسے افراد قرب ووصال کے لئے صبر واستقامت سے اس راہ میں چلنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، انہیں بزرگ بننے کی جلدی ہوتی ہے، اس لئے اس طرح کے افراد کے لئے بزرگی کی راہیں ہموار کردی جاتی ہیں، اور اوراد ووظائف کے ذریعہ انہیں تسخیری صلاحیتیں بھی دے دی جاتی ہیں، بعض کو کشف کی صلاحیت دے دی جاتی ہے، لیکن اپنے وصال کے مقامات اور قرب کے اجزاء سے انہیں بہرہ ور نہیں کیا جاتا۔

اس دور میں بزرگی کے نام پر جو مظاہر ہورہے ہیں اور شان وشوکت کے جو مناظر عام ہیں، اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ طالبوں نے دعویٰ تو وصال کا کیا تھا، لیکن نفس نے انہیں اغویٰ کرکے، بزرگی کے نام پر دنیا داری کی راہ پر لگادیا اور ذکر وفکر کے مخلصانہ مجاہدوں میں ملاوٹ شامل کردی۔

اللہ کے طالب کو لاحق خطرہ

حقیقی طالب (طالب صادق) اس دور میں بھی موجود ہیں، لیکن وہ عام طور پر پیش منظر میں ہمیں نظر نہیں آتے، سبب یہ ہے کہ وہ محبوب کی ایسی اداؤں سے آشنا ہیں کہ انہیں خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ اگر راہ سلوک میں بزرگی اور شہرت کے میلانات شامل ہوگئے تو کہیں وہ محبوب کے در سے دھکے دے کر نکالنے اور انہیں دولت ودنیا کے حوالے نہ کردیا جائے، چنانچہ اللہ کے حقیقی طالب شہرت ونام وری کے روایتی طور طریقوں سے خائف رہتے ہیں، ان پر فنائیت غالب رہتی ہے، وہ محبوب کے علاوہ کسی اور طرف دیکھنے کے روادار ہی نہیں ہوتے، اگر محبوب انہیں شہرت دیتے بھی ہیں تو وہ اس شہرت میں بھی اپنی تربیت اور

دوسروں کی تربیت کے کام سے غافل نہیں ہوتے۔

اللہ کے طالب کے لئے
حسن کے اجزاء کا سب سے زیادہ قیمتی وعظیم ہونا

اللہ کا حقیقی طالب محبوب کے جس حسن سے آشنا ہے، حسن کے یہ اجزاء اس کے لئے اتنے قیمتی اور عظیم ہوتے ہیں کہ اس کی نظر میں دنیا اور سارا مادی حسن اس کے مقابلہ میں بے معنی و بے حیثیت و بے وقعت ہوجاتا ہے، وہ محبوب کی معیت ہی میں رہنا چاہتا ہے، اور اس کی اطاعت کو زندگی کے اہداف میں شامل کرتا ہے، وہ محبوب کے ساتھ اخلاص کی حالت میں ارتقا پر ارتقا کا خواہشمند ہوتا ہے اور اس کے لئے آخری حد تک کوشاں بھی، چونکہ اخلاص کے درجات بلند سے بلند تر ہیں اور قرب کی حالت بھی ایسی ہے کہ فرد اللہ سے جتنا قریب ہوتا ہے، اسے محسوس ہوتا ہے کہ قرب کی آخری حد تک پہنچنا، اس کے بس کی بات نہیں، تاہم قرب کے جتنے بہتر سے بہتر مقامات اسے حاصل ہوسکتے ہیں، وہ تو حاصل ہوں۔

اللہ کے طالب کی کسی مقام، مرتبہ اور حیثیت کی عدم چاہت

اللہ کا حقیقی طالب کوئی مقام، مرتبہ اور کوئی حیثیت نہیں چاہتا، اسے محبوب جس حالت میں بھی رکھتا ہے، اس پر وہ مطمئن رہتا ہے، اسے جو کھلایا جاتا ہے، وہ کھاتا ہے، جہاں بٹھا دیا جاتا ہے، وہ بیٹھ جاتا ہے، اسے جو پہنایا جاتا ہے وہ پہنتا ہے، اسے اگر غربت کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ اسے محبوب کی ادا سمجھ کر، اس پر راضی رہتا ہے، اسے اگر بیماری کی حالت میں رکھا جاتا ہے، تو وہ اسے محبوب کی رضا سمجھ کر صبر وشکر ادا کرتا ہے، اسے اگر لوگوں کی طرف سے تحقیر وتنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے تو وہ اس پر صبر سے کام لیتا ہے، اس کی حالت اس غلام کی سی ہوتی ہے، جو مالک کی مرضی کو اپنی مرضی سمجھ کر، اس پر راضی رہتا ہے، اسے اگر کوئی بے توقیر کرتا ہے تو وہ اسے اپنے گناہوں کی معافی کا ذریعہ سمجھتا ہے، کوئی ڈراتا دھمکاتا ہے تو وہ اسے بھی محبوب کی حکمت سمجھ کر، اس پر چوں چرا نہیں

کرتا، اسے اگر مزاج کے خلاف واقعات پیش آتے ہیں یا مسلسل مصائب سے واسطہ پڑتا ہے اور کیفیات کے زیروزبر سے گزرنا پڑتا ہے تو وہ ان ساری چیزوں کو محبوب کی ادا سمجھ کر، ان پر صبر کا مظاہرہ کرتا ہے اور ان ساری چیزوں کو وہ اپنے گناہوں کی معافی اور درجات میں ترقی کا موجب سمجھتا ہے۔

اللہ کے طالب کی یہ حالت محبوب کی ہستی میں اپنی ہستی کو گم کرنے کے نتیجہ میں ہی مستحکم ہوتی ہے۔

مادیت پرستی کے حالات میں
طالب صادق حقیقی صوفی کا پیش منظر سے ہٹ جانا

آج اگر معاشرے میں بظاہر ایسے صوفی نظر نہیں آتے تو اس میں قصور صوفی کا نہیں، بلکہ معاشرے کا ہے، اس لئے کہ زمانہ کے انقلاب نے معاشرے کے طرز فکر، رنگ ڈھنگ، بلکہ طرز حیات کو خالص مادی نوعیت میں تبدیل کردیا ہے، افراد معاشرہ کو اس طرح کے صوفی کی ضرورت لاحق ہے، جو اس کے جائز وناجائز مادی کاموں کے لئے دعا کرے، اسے تعویذ دے، اسے وظائف بتائے، تاکہ اس کی مادی زندگی بہتر سے بہتر ہوجائے، چنانچہ فنائیت کے حامل صوفی یعنی اللہ کے طالب صادق کونوں کھدروں میں پناہ لئے ہوئے ہیں، چونکہ وہ مادی دنیا کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں، انہیں اپنی تربیت وتزکیہ اور تزکیہ کے طلب گار افراد کی تربیت کے کاموں سے دلچسپی ہے اور اس طرح کے افراد کے غیر معمولی فقدان کی وجہ سے وہ اپنے دین وایمان کی حفاظت کی خاطر پیش منظر سے ہٹ گیا ہے، اس تک حقیقی طلب رکھنے والا فرد ہی رسائی حاصل کرسکتا ہے، مالداری کے رجحانات کے حامل افراد اس طرح کے صوفی تک رسائی حاصل نہیں کرسکتے، اگر وہ رسائی حاصل کر بھی لیں تو وہ حقیقی طلب سے محرومی کی وجہ سے اس کے فیوض وبرکات سے محروم ہی رہیں گے۔

اللہ کے طالب کا نفسی قوتوں کے سلسلہ میں مشاہدہ

اللہ کا طالب جو نفس کو اللہ کے لئے فنا کرنے کی راہ پر گامزن ہوتا ہے، نفسی قوتوں

کے سلسلہ میں اس کا تجربہ ومشاہدہ یہ ہے کہ نفس میں فساد پھیلانے اور اللہ کی زمین کو فساد سے بھرنے کی غیرمعمولی قوت وصلاحیت موجود ہے، یہ نفس باتوں، گفتگو، تقاریر اور مطالعہ سے مہذب نہیں ہوتا، عالم ہو، دانشور ہو یا خطیب وفلاسفر، وہ کتنا ہی فلسفہ جھاڑیں اور وعظ ونصیحت کی کتنی ہی عمدہ گفتگو فرمائیں، جب تک وہ نفس میں موجود فساد کے جراثیم اثرات کے اخراج کے لئے اہل اللہ کی صحبت اور ذکر وفکر کے مجاہدوں سے کام نہ لیں گے، ان کی باطنی اصلاح کی صورت پیدا نہ ہوسکے گی، (الا ماشاء اللہ) مولانا رومی کا یہ قول کہ ہر شخص میں فرعون بننے کی پوری صلاحیت وقوت موجود ہے، مگر اقتدار ووسائل نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس کا اعلان اور عملی مظاہرہ کرنے سے قاصر ہے، عدم اقتدار وعدم وسائل کی مجبوری کی وجہ سے وہ عملاً ایسا نہیں کرتا یا حضرت مجددؒ کا یہ قول کہ نفس کی فنائیت سے پہلے طالب کا نفس شیطان سے زیادہ شریر ہوتا ہے۔

اکابر بزرگوں کے یہ نکات اللہ کے ہر طالب کے اپنے ذاتی مشاہدات وواردات کی کہانی ہیں، اس لئے ایسے افراد جو اللہ کے کثرتِ ذکر سے غافل ومحروم ہوں یا جو اسے غیر ضروری سمجھتے ہوں، جنہیں اپنے نفس پر اعتماد ہے کہ ان کا نفس مہذب ہو چکا ہے، اس لئے کہ دوسروں کی اصلاح وتربیت کے کام کا ہدف یا غلبہ دین کا کام ان کا ہدف ہے، ایسے افراد بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں، قرآن وسنت اور اکابر بزرگان کی تصریحات کے باوجود اللہ کے ذکر کے کام کو معمولی سمجھنا، سب سے بڑی خود فریبی ہے، اللہ کے طالب کی حالت تو یہ ہوتی ہے کہ وہ روزانہ نفس کے درندے سے حالت مقابلہ میں رہتا ہے، ذکر کا نور ہی اس میں نفس کے درندے سے معرکہ آرائی کی صلاحیت وقوت پیدا کرتا ہے، چونکہ نفسی قوتوں کو مطیع کرکے، اللہ ورسول کی اطاعت میں دینے کا کام دین کے مقاصد میں شامل ہے اور یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جب تک نفس کی قوت موجود ہے، تب تک مخلصانہ طور پر اللہ ورسول کی اطاعت اور اس میں استقامت ممکن نہیں، اس لئے اہل اللہ کی صحبت اور ذکر وفکر کا اہتمام ناگزیر ہے، اس کے بغیر نہ تو فرد کو دنیا میں سکون وسکینت کی نعمت حاصل ہوسکتی ہے اور نہ ہی اس کی نفسی قوتیں مطیع ہوسکتی ہیں، آخرت کا معاملہ بھی خطرے میں ہی نظر آتا ہے۔

نفس کی طرف سے پیدا ہونے والے مغالطے

ذکر وفکر کے مجاہدوں کے سلسلہ میں عام طور پر ہر فرد میں نفس کی طرف سے ایک مغالطہ یہ پیدا کیا جاتا ہے کہ ذکر وفکر خاص لوگوں کا کام ہے، یہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے، دوسرا مغالطہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ ذکر وفکر کے مجاہدوں سے معاشی سرگرمیاں متاثر ہوں گی اور روزگار کے لئے ہونے والی جدوجہد متاثر ہوگی۔

یہ دونوں باتیں نفس کا فریب ہیں، نفس کا اپنی الوہیت چاہنا (جسے دل کی گہرائیوں سے سمجھنا ضروری ہے) نفس چاہتا ہے کہ اس کی شخصیت پر اس کی خداوندی اور الوہیت قائم رہے اور اس کی شخصیت پر خواہشات کا جادو غالب رہے، اس لئے نفس کی طرف سے اس طرح کے مغالطے دے کر، فرد وافراد کو اللہ کے ذکر سے دور کیا جاتا ہے اور خالص مادی نوعیت کا ماحول بھی اس میں فرد کا معاون بن جاتا ہے، دنیادار دوستوں کے اثرات تو اس معاملہ میں اس کے لئے زنجیر بن جاتے ہیں۔

قرآن میں ذکر کے سلسلہ میں سب سے زیادہ تاکید ہے۔ یا ایھاالذین آمنو الذکر اللہ ذکرا کثیراً (اے اہل ایمان! اللہ کا کثرت سے ذکر کرو) "واذکر اللہ کثیراً لعلکم تفلحون۔" (اللہ کا کثرت سے ذکر کرو تاکہ تم فلاح حاصل کرو۔)

فاعرض عن من تولیٰ عن ذکرنا ولم یرد الی الحیوۃ الدنیا (ان سے منہ موڑ لو جنہوں نے ہمارے ذکر سے منہ موڑ لیا ہے، (اس لئے کہ) ان کی چاہت دنیا کی زندگی (بہتر مستقبل) کی ہے۔)

جہاں تک ذکر کے مجاہدوں سے معاشی تنگی کا مغالطہ ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ رزق اور روزی کے سارے وسائل اللہ کے ہاتھ میں ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار کی روزی کا ذمہ لیا ہے، "وما من دابۃ الا علی اللہ رزقھا" ایک حدیث شریف میں ہے کہ یہ دنیا اللہ کے ذکر سے ہی قائم ہے، جب دنیا میں ایک فرد بھی اللہ اللہ کرنے والا موجود نہ ہوگا تو دنیا کا بستر گول کردیا جائے گا، جب دنیا کی بقا ہی اللہ سے وابستہ ہے تو سمجھنا چاہئے کہ دنیا میں سب سے زیادہ خوش قسمت انسان اللہ اللہ کرنے والا ہی ہے، اللہ اللہ کرنے والا اللہ کا دوست ہوتا ہے، اللہ اپنے دوست کو ضروری حد تک روزی سے کیسے محروم

رکھ سکتا ہے، جب سارے وسائل اللہ کے ہاتھ میں ہیں تو اللہ وسائل کو حکم دیتا ہے کہ وہ اس کے بندے کی طرف جائیں، لیکن چونکہ بندے کے لئے اللہ کی حکمت یہ ہے کہ اس کے پاس زیادہ وسائل جانے کی وجہ سے اس کی مادی مصروفیات میں اضافہ ہوگا، اس طرح ذکر کے سلسلہ میں اس کی یکسوئی متاثر ہوگی، پھر عام لوگوں کے لئے غلط معیار اور مثال قائم ہوگی، اس لئے بندے کے لئے اللہ کی حکمت یہ ہوتی ہے کہ اس کے پاس زیادہ وسائل نہ ہوں، اسے ضروری حد تک وسائل مہیا کئے جائیں، تاکہ وہ دوسروں کی محتاجی کے بغیر یکسوئی سے میرے ذکر وعبادت واطاعت اور دوسروں کی تربیت کا کام کر سکے۔

ذکر کے بغیر مزاج کے اعتدال کا قائم نہ رہنا

اللہ کے طالب کا ایک بڑا مشاہد یہ ہوتا ہے کہ ذکر کے مجاہدے (جس سے اللہ کی محبت کے جذبات ارتقا پذیر ہوتے ہیں) اسے فیصلہ کن اہمیت نہ دینے سے فرد کی شخصیت اور اس کے مزاج کا اعتدال قائم نہیں رہتا، اس کی روح پیاسی رہتی ہے، اس کا دل اذیت کے احساسات سے سرشار ہوتا ہے، وہ ذہنی دباؤ کا شکار ہوجاتا ہے، اسے نفساتی بیماریاں گھیرے رہتی ہیں، وہ اشتعال، جھنجھلاہٹ، ضد، نفرت، کدورت، دوئی ودورنگی اور احساس کمتری یا احساس برتری کے امراض میں مبتلا رہتا ہے، وہ خود اعتادی سے محروم ہوجاتا ہے، وہ اپنے آپ پر قابو پانے کی صلاحیت سے بے بہرہ ہوجاتا ہے، علم، معلومات اور ذہانت کے باوجود وہ اس طرح کی بہت ساری روحانی واخلاقی بیماریوں میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

افراد کی یہ بیماریاں اتنی بڑھ جاتی ہیں کہ پورا معاشرہ ان بیماریوں میں جکڑ جاتا ہے، اس طرح معاشرہ بیمار معاشرے میں تبدیل ہوجاتا ہے، نفسا نفسی کی فضا پیدا ہوجاتی ہے، فرد پر ایک ہی فکر غالب ہوتی ہے کہ کسی بھی طرح دولت کمائی جائے، دولت کمانے کے لئے اللہ کی مخلوق کو لوٹا جاتا ہے، اس لوٹ مار سے دولتمند بظاہر تو خوشحال ہوجاتے ہیں، لیکن باطنی طور پر وہ شدید انتشار وخلفشار سے دوچار ہوجاتے ہیں، اس لئے کہ اللہ کی غریب مخلوق کی آہیں انہیں بے سکون کردیتی ہیں، بلکہ ان کی نیندیں حرام ہوجاتی ہیں۔

نفسا نفسی کی اس فضا سے پورے معاشرے میں تہلکہ برپا ہوجاتا ہے، گھر گھر میں افرادِ معاشرہ کے ظلم وستم اور لوٹ مار پر ماتم برپا ہونے لگتا ہے، یہ ساری صورتحال صرف

اور صرف اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ دل اور روح کو اس کی اصل غذا سے محروم رکھا جاتا ہے اور فطرت سلیمہ اور ضمیر کے لطیف احساسات کو کچل دیا جاتا ہے۔

ایسے افراد اور معاشروں کو اس کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جاتا ہے، تاکہ وہ اپنے اعمال کی کچھ سزا اسی دنیا میں بھگتیں، تاکہ شاید وہ بیدار ہوجائیں اور سنبھل جائیں اور اللہ کے ذکر اور عبادت واطاعت کی راہ پر آکر، اللہ کے حسن وجمال سے بہرہ وری کی راہ پر گامزن ہوں۔

اللہ کے طالب کا بے پناہ خوشی وبے پناہ غم سے دوچار ہوتے رہنا

اللہ کے طالب صادق کو جہاں بسط (بے پناہ خوشی) کے حالات سے واسطہ پڑتا ہے، وہاں قبض وبے چینی کے حالات سے بھی گزرنا پڑتا ہے، جب اس پر بسط کی حالت طاری ہوتی ہے تو وہ حلاوت کے احساسات سے سرشار ہوجاتا ہے، ایسی حلاوت جس کا عقلِ محض کے ذریعہ تصور کرنا بھی مشکل ہے، یہ حلاوت دراصل محبوب جمالی کے عکس کے نتیجہ میں اسے حاصل ہوتی ہے، جب اس پر قبض طاری ہوتا ہے تو اس قبض سے نفس پر گویا ماتم کی کیفیت غالب ہوجاتی ہے، بسط کے بعد قبض اور قبض کے بعد بسط ہر طالب کو عرصہ تک ان حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔

اس سے طالب صادق پر نفس کی مکر وفریب کی ساری واردات عیاں ہوجاتی ہیں اور بالآخر اسے نفس مطمئنہ کی سعادت عظمیٰ حاصل ہوجاتی ہے۔

افراد کی نفسیات سے آشنائی کے ملکہ کا حاصل ہونا

نفس کے مکر وفریب کی ان ساری واردات سے گذرنے اور اسے مکمل طور پر اللہ اور اس کے رسول کے تابع بنانے کے بعد وہ جہاں عوام وخواص کی نفس کی حالت سے آشنا ہوجاتا ہے، وہاں اس کی زبان گنگ بھی ہوجاتی ہے، وہ سراپا حیرت بن جاتا ہے کہ اللہ نے انسانی نفس کی ساخت میں کتنی خوفناک گھاٹیاں رکھیں ہیں اور اسے انسانیت کے خلاف کتنا خونخوار بنایا ہے، اگر مجاہدوں کے ذریعہ نفس کی اس ساخت میں تبدیلی نہیں ہوتی (اور عام طور پر نہیں ہوتی) تو لگ بھگ ہر فرد دوسرے افراد کے لئے حسد، کینہ، بغض، عناد اور

تحقیر جیسے جذبات سے مغلوب رہنے لگتا ہے، اور عملی زندگی میں ہر سطح پر اس کا مظاہرہ بھی ہوتا رہتا ہے، طالب صادق، نفس کے ان مشاہداتی حالات سے گزرنے کے بعد اللہ کی شکر ادائیگی سے قاصر ہوتا ہے کہ اس نے اسے اپنے فضل خاص سے کتنی خوفناک قوت کے چنگل سے نجات دلائی اور اس کی سرکشی کے زور کو توڑا۔

اللہ کے طالب کی خلوت نشینی اور اس کی نوعیت

اللہ کا طالب زندگی کا قابل ذکر حصہ خلوت نشینی میں رہتا ہے، یعنی بظاہر وہ اہل دنیا کے ساتھ ہوتا ہے، لیکن عملاً اس کا دل محبوب میں اٹکا رہتا ہے، محبوب کے ذکر کے لئے اس کی بے چینی عروج پر ہوتی ہے، اس دوران دو چیزیں اس کی خصوصیات میں شامل ہوتی ہیں، ایک کم گوئی، دوسری غیر ضروری میل جول سے پرہیز، زیادہ گفتگو اور زیادہ میل جول سے اسے بیزاری ووحشت ہونے لگتی ہے، اسے کم گوئی کی ضرورت اس لئے درپیش ہوتی ہے، تاکہ ایک تو وہ کثرت ذکر کے نور کی برکت سے گفتگو کے سلیقہ سے آشنا ہوسکے کہ کم سے کم الفاظ میں اپنا مدعا کس طرح بیان کیا جا سکتا ہے، دوم یہ کہ متوسط صوفی کا نفس طاقتور ہوتا ہے، وہ حب مال وحب جاہ اور حسد جیسے جذبات سے عبارت ہوتا ہے، اگرچہ وہ مبتدی طالب سے سو بار افضل ہوتا ہے، تاہم اس کی نفسی قوتیں مشتعل ہوتی ہیں، زیادہ گفتگو سے وہ اپنی بزرگی ومجاہدوں کے بارے میں ریا اور حسد جیسے جذبات کے اظہار سے بچ نہیں سکتا، اس لئے زیادہ گفتگو اس کی اصلاح کی راہ میں شدید مزاحم ثابت ہوتی ہے، جب بھی نفس کی اکساہٹ پر اس سے کثرت گوئی کا مظاہرہ ہوا، اس کے دل کا نظام درہم برہم ہوجاتا ہے، دل کا مفتی اسے فوراً ملامت کرنے لگتا ہے کہ تمہاری گفتگو میں ریا اور اپنی بزرگی کی آمیزش شامل تھی۔

اس کے لئے زیادہ میل جول سے پرہیز کرنا، اس لئے بھی ضروری ہے کہ ابھی وہ اس قابل نہیں ہوا کہ دوسروں کے حب جاہ وحب مال کے اثرات سے محفوظ ہوسکے اور ان کے دلوں میں موجود نفس اور مادیت کے اثرات کو روک سکے اور ان پر اپنی روحانیت کے

اثرات ڈال سکے۔

متوسط طالب کی ایک اہم چاہت

چنانچہ حالتِ توسط میں اللہ کے طالب کو کثرت ذکر ازخود ان دونوں چیزوں سے باز رکھنے کا ذریعہ بنتا ہے، متوسط طالب کی صرف یہی چاہت ہوتی ہے کہ اس کا زیادہ سے زیادہ وقت ذکر وفکر کے مجاہدوں میں صرف ہو، تاکہ وہ اصلاح نفس کے عمل میں پیش قدمی کرسکے اور محبت کی راہ میں ارتقا کرسکے، کم بولنے اور کم ملنے کے یہ دو اصول ایسے ہیں، جس کے بغیر متوسط طالب راہ سلوک میں ارتقا نہیں کرسکتا، بلکہ ضرورت سے زیادہ گفتگو اور میل جول سے وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے دن بھر کے ذکر وفکر کے اثرات ان غیر ضروری چیزوں کی نظر ہوگئے، اس لئے متوسط صوفی کی ایک بڑی علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ راہ سلوک وراہ محبت میں ارتقا میں حائل زیادہ گفتگو اور زیادہ میل جول سے پرہیز اختیار کرتا ہے، اگر وہ پرہیز نہیں کرتا تو اس سے جبراً پرہیز کرایا جاتا ہے، اس لئے کہ یہ دونوں چیزیں راہ سلوک کے بنیادی تقاضوں واصولوں میں شامل ہیں، راہ محبت، اصولوں کی خلاف ورزی کی متحمل نہیں ہوتی۔

آخر میں زیادہ گفتگو اور زیادہ میل جول کا نقصاندہ نہ ہونا

جب متوسط طالب صحیح اور بہتر گفتگو کے سلیقہ سے آشنا ہوجاتا ہے اور نفسی جذبات پر اسے بڑی حد تک قابو حاصل ہوجاتا ہے تو اس کے بعد اسے دوسروں کی تربیت کے مقام پر فائز کیا جاتا ہے، اگر وہ ذہنی وعلمی صلاحیتوں کی کمی کی وجہ سے دوسروں کی تربیت نہ بھی کرسکے تو بھی زیادہ گفتگو اور زیادہ میل جول اس کے لئے نقصان دہ نہیں ہوتی، اب اس کے نفس میں اتنی تبدیلی برپا ہوچکی ہوتی ہے اور اس میں اتنی استعداد پیدا ہوچکی ہوتی ہے، کہ وہ اپنا مدعا کم سے کم الفاظ میں بیان کرسکتا ہے، نیز وہ ضروری حد تک میل جول کی صلاحیت سے بھی آشنا ہوجاتا ہے اور اس صلاحیت کا حامل بھی ہوجاتا ہے، بلکہ اب اس کی

مزید ترقی افراد کو اللہ کی محبت سے آشنا کرنے کے دعوتی کام سے وابستہ ہے، ظاہر ہے اس کے لئے لوگوں سے رابطہ اور گفتگو ناگزیر ہوتی ہے۔

طالب صادق کو ایک زندگی کے بدلے میں سونئی زندگیوں کا حاصل ہونا

اللہ کا طالب جب نفس کی ان گھاٹیوں سے گزر جاتا ہے، تو وہ اللہ کے قرب کے مقامات حاصل کرلیتا ہے، اس طرح اسے ایک نئی طاقتور ایمانی زندگی نصیب ہوتی ہے، جسے مولانا رومی نے سونئی زندگیوں سے تشبیہ دی ہے کہ اللہ کی طرف سے طالب کو ایک زندگی کی قربانی دے کر سونئی زندگیاں عطا کی جاتی ہیں، یہ زندگی ایسی ہوتی ہے، جس میں اللہ کی رضا پر راضی رہنے کی نفسیات غالب ہوتی ہے، طالب کے لئے اسلامی شریعت پر عمل پیرا ہونا آسان ہوجاتا ہے، اس کا دل مادی دنیا کے حوالے سے سرد ہوجاتا ہے، شہرت کے جذبات پامال ہوجاتے ہیں اور وہ حلاوت سے سرشار رہنے لگتا ہے۔

قرآن نے بھی بندہ مؤمن کو اس نئی زندگی کی خوش خبری سنائی ہے، "**للـــذيـن احسنـوا فی هـٰذه الـدنيا حسنه ولدار الآخرة خير**" (نیکوکاروں کو اس دنیا میں بھی اچھی زندگی حاصل ہوگی تو آخرت میں تو اس سے زیادہ بہتر زندگی)

"**يثبت الـلـه الـذيـن آمنو باالقول الثابت فی الحيوٰة الدنيا وفی الآخرة**" (اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو ثابت قدم رکھے گا اس قول ثابت کی برکت سے، دنیا میں بھی تو آخرت میں بھی) یہاں قول ثابت سے مراد کلمہ طیبہ ہے، کلمہ طیبہ جب حال بن جاتا ہے، اور زندگی کا سارا نقشہ اسی کے مطابق متشکل ہونے لگتا ہے، تو اللہ کی طرف سے استقامت اور ثابت قدمی کی نعمت عظمیٰ عطا ہوتی ہے، "**انـا لننصر رسلنا والذين آمنوا فی الحيوٰة الـدنيا ويوم يقوم الاشهاد**" (ہم اپنے رسولوں اور مؤمنوں کی ضرور مدد کریں گے دنیا کی زندگی میں بھی تو اس دن بھی جب شاہد کھڑے ہوں گے)

قرآن میں اس طرح کی اور بھی آیات موجود ہیں۔

عہد جدید کے صوفی کی آرزو

عہد جدید کا حقیقی صوفی دل میں یہ آرزو رکھتا ہے (جس کی تکمیل کی اسے بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی) کہ اسے ذہین و باصلاحیت علمی افراد حاصل ہوں، جن میں وہ اللہ کی محبت وعشق کی گرمی منتقل کردے، تاکہ وہ علمی وذہنی صلاحیتوں سے کام لے کر عہد جدید کے انسان کو معنوی زندگی سے آشنا کرسکیں اور ان کی بہتر طور پر تربیت کرسکیں، لیکن ذہین وباصلاحیت علمی شخصیتیں عام طور پر نفسی قوتوں اور مادیت کی زنجیروں میں اس طرح کس دی گئی ہیں کہ ان کے لئے مادیت کی ان زنجیروں کو توڑ کر، محبوب حقیقی کی محبت سے سرشار ہونا غیر معمولی طور پر دشوار ہوگیا ہے، بدقسمتی سے وہ اس راہ پر کسی طور بھی آنے کے لئے تیار نہیں۔ (الا ماشاء اللہ)

جب تک اللہ مقصود نہیں بنتا، دعوتی کاموں میں خیر وبرکت پیدا نہیں ہوتی

اسلامی دعوت اور اسلامی تحریک کو کام کے جو افراد مل سکتے ہیں، وہ اللہ کی محبت کے رنگ میں رنگ جانے اور نفس کی فنائیت کے مراحل سے گزرنے کے ذریعہ سے ہی مل سکتے ہیں اور یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں، جس کے بغیر نہ تو دعوتی کام خیر وبرکت کا باعث ثابت ہوسکتا ہے، اور نہ ہی معاشرے اور ریاست میں غلبہ اسلام کی صورت پیدا ہوسکتی ہے، اس لئے کہ ذکر وفکر کے مجاہدوں کے ذریعہ نفس کی فنائیت اور اللہ کی محبت کے غلبہ کے بغیر دوئی ودورنگی دور نہیں ہوسکتی، دوئی ودورنگی کا مطلب یہ ہے کہ اللہ بھی ہو اور ساتھ ساتھ نفس کی کچھ چاہتیں بھی ہوں، اللہ بھی ہو، ساتھ ساتھ شہرت ونام وری کے احساسات بھی ہوں، اللہ بھی ہو اور حب جاہ وحب مال کے جذبات بھی ہوں، جب تک نفس کی فنائیت کے ذریعہ اللہ مقصود نہیں بنتا، تب تک دعوتی اور غلبہ دین کے کاموں میں اخلاص وللھیت پیدا نہیں ہوسکتی، چونکہ نفس کی فنائیت کا کام مشکل ترین کام ہے، اس لئے افراد، عام طور پر اس راہ میں آکر فنائیت کے مراحل سے گذرنا نہیں چاہتے اور پھر وہ اس کے لئے عقل

کے ذریعہ بہت سارے دلائل سامنے لاتے ہیں، حالانکہ ہمارے لئے سلف صالحین کی راہ پر عمل پیرا ہونا ہی اصل چیز ہے اور قرآن میں بھی اس کی تاکید ہے، سلف صالحین کی راہ یہی ہے کہ پہلے اللہ کی محبت کے ذریعہ نفس کی فنائیت ہو، اس کے بعد دعوتی اور غلبہ دین کا عمل، اس لئے کہ ان کاموں میں حقیقی اخلاص، بے نفسی اور للھیت اس کے بعد ہی پیدا ہوسکتی ہے۔

اللہ کی محبت کے ذریعہ نفس کی فنائیت کا کام ایسا ہے، جو اہل اللہ کی صحبت سے ہی حاصل ہوسکتا ہے، اہل اللہ کو یہ سعادت سلف کی صحبت سے ہی حاصل ہوتی رہی ہے، اور سلف کو یہ نعمت صحابہ کرام کے ذریعہ حاصل ہوئی ہے اور صحابہ کرام کو یہ سعادت اللہ کے رسول کی صحبت سے عطا ہوئی ہے۔

اللہ کے طالب کو آزمائشوں میں
ثابت قدمی کے ذریعہ نعمتوں کا حاصل ہونا

طالب صادق یہ سمجھتا ہے کہ محبوب کی کوئی ادا ایسی نہیں ہے، جو حکمت سے خالی ہو، وہ صوفی کو صافی (پاک وصاف) حالت میں رکھنا چاہتا ہے، اس لئے وہ آزمائشوں کے ذریعہ اس کی مسلسل تربیت کرتا رہتا ہے، طالب صادق کو محبوب کی طرف سے جو بھی نعمتیں عطا ہوتی ہیں، وہ سب آزمائشوں میں استحکام کے ذریعہ ہی عطا ہوتی ہیں، اللہ کے حقیقی طالب کو اس بات کی بڑی فکر دامنگیر ہوتی ہے کہ وہ اپنی ساری توانائیوں کے استعمال کے باوجود محبوب حقیقی کی نہ صرف یہ کہ کوئی قدر نہ کرسکا، بلکہ اس قدر کا ذرا بھی حق ادا نہ کرسکا، اس ہستی کے احسانات اتنے زبردست ہیں کہ وہ ان میں سے کسی ایک بھی احسان کا زندگی بھر کے مجاہدوں کے باوجود حق ادا نہیں کرسکتا، کجا کہ اس کے سارے احسانات کی حق ادائیگی کی صورت پیدا ہو۔

ادھر محبوب کو طالب صادق کی یہ ادا ایسی پسند ہے کہ اس کی فنائیت کی وجہ سے وہ اسے اپنی بارگاہ میں مقربین میں شامل کرلیتا ہے، طالب صادق، دوران سلوک بالخصوص

حالتِ توسط میں محبوب کے غمِ فراق میں ایسی آزمائشوں سے گزر چکا ہوتا ہے کہ یہ آزمائشیں آگ وخون کا دریا عبور کرنے کے مترادف ہوتی ہیں، محبوب، صوفی کے اس حوصلہ وہمت ومستقل مزاجی کو دیکھ کر بالآخر اسے حالت وصال عطا فرماتا ہے، صوفی کا اصل مقصود بھی یہی ہوتا ہے، حالتِ وصال کے بعد اس پر جو بھی آزمائشیں آتی ہیں، صوفی ان کو محبوب کی عطا سمجھتا ہے، اور اب محبوب سے اس کی امیدیں بہت زیادہ بڑھ جاتی ہیں، اس لئے کہ جب اس نے اپنے حقیقی طالب کو اپنے فضل خاص سے دورانِ سلوک آگ اور خون کے دریا سے پار کردیا ہے تو باقی زندگی بھی وہ اسے انشاء اللہ حوصلہ، ہمت اور استقامت عطا فرمائے گا اور میدان حشر میں بھی اسے محروم نہ رکھے گا اور وہاں اسے رسوائی سے بچالے گا۔

یہ ہے حقیقی صوفی کی کہانی، لیکن صوفی کے حالات، اس کی واردات اور محبوب کے لئے اس کی فدا کاری اور محبوب کے ساتھ اس کے زار ونیاز کی اداؤں کو غیر صوفی نہیں سمجھ سکا، چاہے وہ کتنی ہی عقل دوڑائے۔

زیر نظر کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ راہ سلوک وراہ محبت قران وسنت ہی سے ماخوذ ہے، (احادیث سے سلوک کے مسائل پر مولانا کی کئی سو صفحات پر مشتمل الگ سے کتاب موجود ہے) حقیقی تصوف قرآن وسنت سے باہر نہیں، لیکن سوچنے سمجھنے کی ضرورت ہے، خود رائی سے بلند ہوکر حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ان تفسیری نکات کو پڑھیں گے تو انشاء اللہ حقیقی تصوف کے حوالے سے ہونے والی ساری غلط فہمیاں دور ہوں گی، فہم قرآن کے حوالے سے ہمارے لئے یہ نکات راہ عمل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اہم تفسیری نکات

(اہل محبت واہل سلوک کے لئے قرآنی لائحہ عمل)

بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ. (سورۃ البقرہ، آیت نمبر۴)
جو آپ پر اتارا گیا ہے اور آپ سے پہلے اتارا گیا ہے (اس پر یقین رکھتے ہیں)۔

سالک کا صرف اپنے شیخ کی اتباع کرنا

اسی پر یہ قیاس کیا جائے گا کہ اعتقاد تو تمام مشائخ اہل حق کے ساتھ ویسا ہی رکھے،جیسا اپنے شیخ کے ساتھ رکھتا ہے، مگر اتباع صرف اپنے شیخ کی کرے، جس کی تربیت میں اس نے اپنے آپ کو دیدیا ہے۔

تشریح:

سارے مشائخ اہل حق، روشنی کے مینار کی حیثیت رکھتے ہیں،وہ اپنی نفسی قوتوں کو فنا کر کے، دنیاوی مال ومتاع سے دستبردار ہوچکے ہیں، وہ آخرت کو مقصود بناچکے ہیں، وہ اپنے نفس کے تزکیہ میں بڑی حد تک کامیاب ہو چکے ہیں، اس لئے سارے مشائخ کے ساتھ حسن ظن اور عقیدت رکھنا اور انہیں رسول اللہ ﷺ کا نائب سمجھنا ضروری ہے۔ لیکن اپنی اصلاح اور تزکیہ کے سلسلہ میں اسے دوسروں کی طرف رجوع ہونے کی بجائے صرف اپنے شیخ کی طرف رجوع ہوتے رہنا چاہئے، اس لئے کہ بیک وقت دو معالجوں سے علاج نہیں کرایا جاتا، اس سے بیماری کے مزید پیچیدہ ہوجانے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ نیز اس سے اصل شیخ کی طالب سے توجہ میں بھی کمی آجاتی ہے، بلکہ اصل شیخ کے دل میں احساس رنجیدگی پیدا ہوتی ہے،جس سے طالب کی اصلاح خطرہ میں پڑجاتی ہے۔ (مرتب)

فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ. (سورۃ البقرہ، آیت نمبر۱۰)
(ان کے دلوں میں مرض ہے)۔

قلبی امراض کا اثبات

اس میں قلبی امراض کا اثبات ہے کہ وہ گناہ ہیں، اہل اللہ کے کلام میں اس پر زور ہے۔

تشریح:

قلبی بیماریاں ایسی ہیں کہ اگر بر وقت ان کے علاج کی فکر نہ کی گئی تو یہ بیماریاں طاقتور صورت اختیار کر جاتی ہیں اور فرد وافراد کو اخلاقی وروحانی امراض کا شکار بنا کر، اپنی ذات اور معاشرے کے لئے باعث فساد بنا دیتی ہیں۔ قلبی بیماریوں کی سنگینی کی صورت میں افراد کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ سب کچھ سننے اور سمجھنے کے باوجود عملاً گونگے اور بہرے ہوتے ہیں اور نصیحت کی کوئی بات ان پر اثر انداز نہیں ہوتی،اس لئے کہ قلب کی صلاحیت مضمحل ہو چکی ہے اور نفسی قوتیں قلب پر غالب ہو چکی ہیں۔

جب قلب بُری طرح امراض کا شکار ہوجائے تو صحت کے امکانات مسدود ہوجاتے ہیں،انسانوں کی اکثریت سنگین قلبی بیماریوں کی وجہ سے ہی اللہ سے غافل رہی ہے اور سرکشی ونافرمانی کی راہ پر گامزن رہی ہے۔

قلب کی بیماریوں سے بچاؤ کی صورت یہی ہے کہ فطرت سلیمہ کی حفاظت کی جائے اور ضمیر کی قوت کو ہر صورت میں برقرار رکھا جائے،اسے مردہ ہونے سے بچایا جائے۔

قلب کی سلامتی بہت بڑی نعمت ہے۔ **إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ.** (مرتب)

كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِن ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوا هَٰذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِن قَبْلُ وَأُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا. (سورۃ البقرہ، آیت نمبر۲۵)

(جب کبھی دیئے جائیں گے ان کو ان بہشتوں میں سے کسی پھل کی غذا تو وہ ہر بار یہی کہیں گے یہ تو وہی ہے جو ہمیں اس سے پہلے ملا تھا)۔

جنت میں ملنے والی لذتوں کا اطاعات اور معارف کی لذت کے مثل ہونا

اس آیت میں ایک احتمال یہ ہے کہ رزق سے مراد طاعات ومعارف ہوں، جنہیں اصحاب فطرت اور عقل سلیم کے حامل افراد ظاہری رزق سے زیادہ لذیذ سمجھتے ہیں اور جنت

میں ان کے عوض ان کو جو جزا ملے، وہ لذت میں ان طاعات ومعارف کے مشابہ ہو۔

تشریح:

اللہ کے مقبول بندوں کو اس دنیا میں مجاہدوں کی بدولت اطاعت اور معارف میں جو لذت حاصل ہوتی ہے، وہ ایسی لذت ہے کہ جنت میں انہیں جو رزق ملے گا، وہ اسی لذت کے مشابہ ہوگا۔

جب عبادت اور اطاعت کا ملکہ راسخ ہونے لگتا ہے تو دل وروح کو اپنی اصل غذا ملنے لگتی ہے، اس طرح ان کی خوشی، مسرت وحلاوت بے پناہ ہوجاتی ہیں۔ اس عبادت واطاعت کے مقابلہ میں دنیا کی ساری نعمتیں اور حلاوتیں ان کے لئے ہیچ ثابت ہوتی ہیں۔ اللہ کے مقبول بندے ایک اعتبار سے آخرت کی جنت سے پہلے اس دنیا کی جنت میں داخل ہوتے ہیں، جو سکون، سکینت، بے فکری اور حلاوت کی جنت ہوتی ہے۔ آخرت میں ملنے والی نعمتوں اور ثمرات کو دیکھکر وہ پکار اٹھیں گے کہ یہ تو وہی پھل ہیں، جو دنیا میں انہیں مخلصانہ عبادت واطاعت اور ذکر وفکر اور معارف کی صورت میں حاصل تھے۔

اس سے عبادت واطاعت کی حلاوت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

جنت میں حاصل ثمرات کے شوقین افراد کے لئے اس دنیا میں یہ موقعہ حاصل ہے کہ وہ آخرت کی جنت سے پہلے اس دنیا کی جنت میں داخل ہوں، یہ جنت، اللہ کی عبادت واطاعت اور ذکر وفکر کے مجاہدوں کے ذریعہ ہی حاصل ہوسکتی ہے۔

خوش نصیب ہیں، وہ افراد جو اللہ کی دی ہوئی زندگی کو عبادت واطاعت کی حلاوت میں بسر کرتے ہیں۔ قابل رحم ہیں، وہ افراد جو عبادت کی حلاوت سے محروم ہوکر، دنیا وآخرت دونوں زندگیوں میں اذیت، حسرت، اضطراب اور ذہنی وقلبی سکون سے محرومی کے جہنم سے دوچار رہتے ہیں اور رہیں گے۔ (مرتب)

وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً. (سورۃ البقرہ، آیت نمبر۳۰)

(اور جس وقت ارشاد فرمایا آپ کے رب نے فرشتوں سے کہ میں ضرور بناؤں گا زمین میں ایک نائب)۔

مجاہدوں کے ساتھ علم وفہم کا ہونا بھی ضروری ہے

کسی کو قائم مقام بنایا جائے تو اس کے لئے علم وفہم شرط ہے اور یہ بدعمل بھی نہ ہو، محض مجاہدہ کافی نہیں ہے کہ یہ کام بڑی ذمہ داری سے کرتا ہے، علم وفہم نہیں تو وہ خلافت کے لئے کسی کام کا نہیں، اسی لئے مشائخ جب کسی کے اندر یہ چیز پاتے ہیں کہ وہ علم وفہم والا ہے اور مختلف طبائع والوں کو مختلف طریقوں سے لے کر چل سکتا ہے تو ایسے شخص کو اس کے لئے منتخب کرتے ہیں۔

تشریح:

خلافت کے لئے پہلی شرط اللہ کے لئے ذکر وفکر کے مجاہدے ہیں، تاکہ نفسی قوتیں پامال ہوجائیں اور اللہ ورسول کی مخلصانہ اطاعت کے سلسلہ میں نفسی حجابات دور ہوجائیں، اس کے بعد دوسری بنیادی شرط علم وفہم ہے، اگر علم وفہم نہیں ہے تو مختلف مزاج کے حامل لوگوں کی ان کے مزاج کی مناسبت سے تربیت کرنے کی صلاحیت کا پیدا ہونا دشوار ہوتا ہے۔

اگرچہ مجاہدوں سے بھی بصیرت پیدا ہوتی ہے، لیکن اس کے باوجود تجربہ، مشاہدہ اور علم وفہم کا ہونا ناگزیر ہے، اس کے بغیر بزرگ کے لئے اپنے دور کے حالات کے فہم اور لوگوں کی ذہنیت کو سمجھنا دشوار ہوتا ہے اور تربیت میں بھی مشکلات درپیش ہوتی ہیں۔ (مرتب)

وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ. (سورۃ البقرہ، آیت نمبر۳۵)

(اور نزدیک نہ جاؤ اس درخت کے)۔

مشائخ کی بعض جائز کاموں کے سلسلہ میں حکمت عملی

جس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو درخت کے قریب جانے سے روک دیا تھا، حالانکہ اس کا قرب گناہ نہیں تھا، بلکہ کھانا گناہ تھا، لیکن یہ حکم اس لئے دیا، تاکہ اس کے کھانے سے محفوظ رہیں۔ اسی طرح بعض دفعہ مشائخ بھی بعض جائز کاموں سے روک دیتے ہیں۔ ناجائز سے بچنے کے لئے۔ مثلاً مشائخ اپنے مرید کو زیادہ

کھانے سے روک دے، اگرچہ زیادہ کھانا ممنوع نہیں، لیکن اس سے شیخ چاہتا ہے کہ اس کا گناہوں کی طرف میلان نہ ہو۔

تشریح:

گناہوں کے راستے بند کرنا انتہائی ناگزیر ہے، ورنہ گناہوں کی دلدل میں پھنسنے کی راہ ہموار ہوتی ہے، مثلاً راشی افسروں اور قوم کا مال کھانے والے سیاستدانوں کے ساتھ مل کر کام کرنا باعث خطرہ ہے، اس لئے کہ ایسا کرنا، طالب کے حب مال وحب جاہ کا ذریعہ بن سکتا ہے، بلکہ اکثر ایسا ہی ہوتا رہا ہے، اس لئے شیخ ایسی ملازمت اور ایسی سیاست، جس سے طالب کا دین خطرے میں ہو اور گناہوں میں مبتلا ہونے کی راہ ہموار ہو، وہ طالب کو اس سے منع کر کے، اس کے حفاظت دین کی صورت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اگرچہ ایسی ملازمت اور سیاست، بجائے خود غلط نہ ہو، لیکن چونکہ اس میں خطرے کے بہت زیادہ امکانات ہیں، اس لئے شیخ کی یہ تدبیر بعض اوقات بہت ضروری اور حکمت پر مبنی ہوتی ہے۔ (مرتب)

فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا. (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۳۶)

(پس لغزش دیدی آدم وہوا کو شیطان نے اس درخت کی وجہ سے)۔

قرب خداوندی کے باوجود غلطی سے محفوظ نہ ہونا

جس طرح حضرت آدم علیہ السلام باوجود کامل ہونے کے غلطی کر بیٹھے، اسی طرح کوئی شخص جو قرب خداوندی حاصل کر چکا ہو، اس کا غلطی سے مامون ہونا بھی ضروری نہیں، لیکن اس میں اور حضرت آدم علیہ السلام میں فرق یہ ہے کہ وہ تو کفر سے محفوظ تھے۔ اور توبہ بھی بہت بہترین کی، لیکن یہ شخص کفر سے بھی مامون نہیں اور ویسی توبہ بھی ناممکن ہے۔

تشریح:

شیخ، بزرگی کے جس قدر بلند مقام پر فائز ہوجائے، اگر اس نے موت تک غیرمعمولی احتیاط سے کام نہیں لیا اور اصولوں پر سختی سے قائم رہنے میں سستی وکمزوری کا مظاہرہ کیا تو وہ گرنے کے خطرے سے بچ سکے، مشکل ہے، مثلاً بزرگ نے اگر مالداروں اور سرمایہ داروں سے دوستانہ تعلقات استوار کر لئے تو آہستہ آہستہ اس کی

شخصیت پر ان کا رنگ غالب آئے بغیر رہ سکے مشکل ہے، اسی طرح اگر اس نے ایک بار شہرت کی راہ اختیار کی اور اس کے لئے منصوبہ بندی سے کام لیا تو وہ شہرت کے خطرے سے دوچار ہوگا، اس طرح وہ انبیاء کرام اور سلف صالحین کی زہد، دنیا سے استغنا اور شہرت سے بے نیازی کی راہ سے دور ہو کر، دنیاداری کی راہ پر گامزن ہوسکتا ہے۔ اس لئے منتہی صوفی کو بھی سخت احتیاط کی ضرورت ہے۔ (مرتب)

وَأَوْفُوا بِعَهْدِي أُوفِ بِعَهْدِكُمْ. (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۴۰)

(اور پورا کرو تم میرے عہد کو، پورا کروں گا میں تمہارے عہد کو)۔

وفا اور اس کے اثرات

وفا کے مرتبوں میں نہایت وسعت ہے، پس ہماری طرف سے اول کلمہ شہادت کی ادائیگی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جان ومال کی حفاظت اور ہماری طرف سے آخر میں فنا ہے، یہاں تک کہ فنا سے بھی فنا ہوجانا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے صفات واسماء سے آراستہ کرنا، پس وفا کی تفسیر میں جو مختلف چیزیں آئی ہیں، وہ توسط کے اعتبار سے ہیں اور وہ بکثرت ہیں، یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ پہلا مرتبہ یہ ہے کہ ہماری طرف سے توحید افعال ہے اور اوسط توحید صفات اور آخر توحید ذات، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ معارف واخلاق ہیں، جو ہر مرحلہ کے سالک کو اس کے مرتبہ کے مطابق عطا کئے جاتے ہیں۔

تشریح:

اس حواشی میں راہ سلوک کے باریک نکات بیان ہوئے ہیں کہ کلمہ اور ذکر پر محنت کے نتیجہ میں اللہ کی طرف سے جان ومال کی حفاظت کا وعدہ فرمایا گیا ہے اور ہماری طرف سے آخر میں فنا کے مقام تک رسائی حاصل کرنا ہے۔ فنا کا مطلب نفسی قوتوں اور خواہشات کے زور کو توڑ کر، انہیں اللہ کے تابع بنانا ہے اور پھر فنا سے فنا ہوجانا ہے۔ یعنی اپنے فنا ہونے کے احساس کا معدوم ہوجانا ہے، طالب پر ہمہ وقت یہی فکر غالب رہے کہ اصل تو اللہ کی ہستی ہے، میں اور میرا وجود تو بس اس کا مرہون منت ہے، اس کے نتیجہ میں اللہ کی طرف سے اپنی صفات واسماء سے آراستہ کرنے کی

نعمت عظمیٰ عطا ہوتی ہے۔

وفا کی جو مختلف تفسیریں ہوئی ہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ ہر مرحلہ کے حامل سالکوں کو ان کے درجہ اور مقام کی مناسبت سے نوازا جاتا ہے۔ متوسط صوفی کو اس کے حالات کی مناسبت سے عطا کیا جاتا ہے، جب کہ منتہی صوفی اپنی ہستی کو مکمل طور پر فنا کر چکا ہوتا ہے، اس لئے اسے آخر میں توحید ذات کی نعمت عطا کی جاتی ہے۔

یہاں ایک بزرگ کا یہ مقولہ اہمیت کا حامل ہے کہ اس نے کہا کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ میری مرضی سے ہو رہا ہے۔ اس سے پوچھا گیا کہ وہ کس طرح؟ اس نے کہا کہ میری مرضی اللہ کی مرضی میں مدغم ہوگئی ہے، اس لئے اللہ کی مرضی گویا میری ہی مرضی ہے۔ راہ سلوک کے آخر میں سالک کو یہ مقام نصیب ہوتا ہے، یہ بڑے اہل اللہ کی باتیں ہیں۔ ہم تو بس حسرت ہی کر سکتے ہیں کہ اللہ سے وفا اور اللہ کی معرفت کے کچھ اجزاء ہی اگر ہمیں حاصل ہوسکیں تو ہماری خوش نصیبی ہوگی۔ (مرتب)

وَاِذْ وَاعَدْنَا مُوسَى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً. (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۵۱)

(اور جب کہ وعدہ کیا تھا ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا)۔

چلے کی اصل آیت

یہ آیت اہل سلوک کے چلے کی اصل ہے، اگرچہ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ ہے، لیکن اس کو نقل کرکے، اس پر انکار نہیں کیا گیا تو یہ ہمارے لئے حجت ہوگیا، خصوصاً جب کہ اس کے بارے میں حدیث بھی آئی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص چالیس روز تک اللہ کے لئے یکسو ہوکر عبادت اختیار کرے تو علم کے چشمے اس کے قلب سے (جوش زن ہوکر) اس کی زبان سے ظاہر ہوتے ہیں۔ (رواہ رزین)

تشریح:

صوفیاء کے یہاں ذکر وفکر کے لئے گوشہ نشینی اور چلہ کا سلسلہ مروج رہا ہے، گوشہ نشینی سے جب یکسوئی سے عبادت اور ذکر وفکر ہو تو اس سے عبادت اور ذکر وفکر کا ملکہ راسخ ہونے لگتا ہے اور ملکہ کے رسوخ سے اسلامی شریعت پر عمل پیرا ہونا آسان ہوجاتا ہے اور

قلب، اللہ کی محبت سے سرشار ہوکر، اس سے نور پھوٹنے لگتا ہے، فاسد دور میں جب کہ مادہ پرستی کا غلبہ ہو، اس میں یکسوئی پیدا کرنے اور عبادت وذکر وفکر کی عادت کو مستحکم کرنے اور للھیت کے لئے ایک چلہ ناکافی ثابت ہوتا ہے، اس کے لئے طویل عرصہ صرف کرنا پڑتا ہے، اس لئے کہ فاسد ماحول کے اثرات سے فضا ظلمات چھاجاتی ہے، اس ظلمات کے اثرات سے مکمل طور پر بچاؤ اور قلب کو انوار سے سرشار کرنے کے لئے غیر معمولی یکسوئی کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ (مرتب)

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَى كُلُوْا مِن طَيِّبَاتِ. (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۵۷)

(ہم نے سایہ فگن کیا تم پر ابر کو اور پہنچایا تمہارے پاس ترنجبین اور بٹیریں کھاؤ نفیس چیزوں سے)۔

گناہوں کے باوجود نعمتوں کا حاصل ہونا مہلت ہے

اس میں دلیل ہے کہ گناہوں کے باوجود نعمتوں کا جاری رہنا یہ ڈھیل ہے اور باعث خطرہ اور بہت سے جاہل صوفی اس بارے میں دھوکہ میں ہیں کہ وہ کثرت مال اور منصب کو مقبولیت کی علامت سمجھتے ہیں۔

تشریح:

گناہوں کے باوجود اگر نعمتیں اور راحتیں حاصل ہیں تو یہ دراصل ابتلا وآزمائش کی صورت ہے۔ فرد اگر جلد ہی سنبھل کر گناہوں کو ترک کردے تو یہ ابتلا وآزمائش، انعام میں تبدیل ہوجاتی ہے، دوسری صورت میں فرد کو ڈھیل دیدی جاتی ہے، اور سامان راحت اور آسائشوں کے دروازے اس کے لئے مزید کھول دیئے جاتے ہیں، اس طرح اس کے لئے بظاہر نعمتیں، بباطن عتاب کی صورت پیدا کردی جاتی ہے، جب وہ کسی طرح بھی سنبھلنے کے لئے تیار نہیں ہوتا تو اچانک اس کی پکڑ ہوتی ہے، ایسی سخت پکڑ کہ بچاؤ کے سارے راستے مسدود کردیئے جاتے ہیں، اللہ ہمیں اس طرح کے عتاب سے بچالے۔ (مرتب)

قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنَى بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ . (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۶۱)

(آپ نے فرمایا کیا تم ادنیٰ چیزوں کو اعلیٰ درجہ کی چیزوں کے بدلے میں لینا چاہتے ہو)۔

مصائب پر صبر نہ کرنے کی سزا اور روزی کی تلاش کا مسئلہ

اس آیت سے دو مسئلے معلوم ہوتے ہیں، اول جو لوگ اللہ کے فیصلوں پر راضی نہیں ہوتے، اس کی نعمتوں پر شکر ادا نہیں کرتے اور مصائب پر صبر نہیں کرتے تو ایسے لوگوں کے مقدر میں ذلت لکھ دی جاتی ہے۔ جیسے بنی اسرائیل کے ساتھ ہوا، دوم ایسا شخص جسے اللہ پر توکل ہو اور اس کو بغیر کسی دنیاوی سبب کے روزی مل رہی ہو، تو اس کو روزی کی تلاش میں بھاگنا نہیں چاہئے اور وہ شخص جس کو ذریعہ معاش ہو، وہ بلا کسی ضرورت کے اس کو ترک نہ کرے، یہ حق تعالیٰ کی ناخوشی کا سبب ہے۔

تشریح:

اللہ کے فیصلوں پر راضی نہ ہونا اور مصائب کے وقت صبر وشکر سے کام نہ لینا، اللہ کے عتاب کو دعوت دینے کے مترادف ہے، جب یہ زندگی امتحان گاہ کی حیثیت رکھتی ہے تو مسائل ومشکلات تو زندگی کا حصہ ہیں، اللہ کی مرضی سمجھکر، ان پر صبر کرنا، بندہ مومن کی خصوصیت ہونی چاہئے، اس آیت سے دوسرا مسئلہ جو واضح ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ جن افراد کو اللہ کی طرف سے بغیر اسباب کے روزی میسر ہے، انہیں مزید روزی کے لئے تگ ودو سے بچنا چاہئے، اللہ کی اس نعمت کا شکر ادا کرکے، اپنا وقت ذکر وفکر اور خدمت دین میں صرف کرنا چاہئے اور جسے ذریعہ معاش میسر ہے، اسے بلا سبب اسے ترک نہ کرنا چاہئے، اس لئے کہ اس فرد کے لئے اللہ کی حکمت یہی ہے کہ اس کی روزی ظاہری ذریعہ سے وابستہ ہو۔ (مرتب)

ذَلِکَ بِمَا عَصَواْ وَّكَانُواْ يَعْتَدُون. (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۶۱)

(اور یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے اطاعت نہ کی اور دائرہ سے نکل نکل جاتے تھے)۔

ایک گناہ کے بعد دوسرے گناہ کا سرزد ہوجانا

ذالک ان کے قتل اور کفر کی طرف اشارہ ہے، اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو چیز ان

کے لئے آیات کے کفر اور انبیاء کے قتل کا باعث ہوئی اور حدود سے تجاوز تھا اور ایک گناہ دوسرے گناہ کا سبب ہوجایا کرتا ہے، یہاں تک کہ معاملہ کفر تک پہنچ جاتا ہے، اسی لئے کسی گناہ کو ہلکا نہ سمجھا جائے۔

تشریح:

گناہ کی ''خصوصیت'' ہے کہ وہ اپنے ساتھ تاریکی لاتا ہے اور دل میں حجابات پیدا ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔ نیز گناہ کی وجہ سے طبیعت میں نیک اعمال کی امنگ کمزور ہونا شروع ہوجاتی ہے، اگر فرد نے بروقت اس کا تدارک نہ کیا تو بالآخر وہ وقت آنے لگتا ہے کہ جب فرد سے گناہوں کا ادراک وشعور سلب ہونے لگتا ہے، گناہوں کے سلسلہ میں خوداحتسابی کا عمل ضروری ہے، ورنہ گناہ کی وجہ سے جب منفی عادت غالب ہوجاتی ہے تو اس سے جان چھڑانا بہت زیادہ مشکل ہوتا ہے، مثلاً اگر نماز نہ پڑھنے یا جماعت سے نماز نہ پڑھنے کا گناہ صادر ہورہا ہے اور اس گناہ کی عادت مستحکم ہوگئی تو اس عادت سے نجات حاصل کرنا غیرمعمولی طور پر دشوار ہوجاتا ہے، اس لئے بروقت سنبھلنے کی ضرورت ہے، اللہ ہمیں اس حالت سے بچائے۔ (مرتب)

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَواْ مِنكُمْ فِيْ السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُواْ قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ فَجَعَلْنَاهَا نَكَالاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ . (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۶۵ - ۶۶)

(اور تم ان لوگوں کا حال جانتے ہی ہو جنہوں نے تم میں سے تجاوز کیا تھا، دوبارہ ہفتہ کے دن کے سو ہم نے ان کو کہدیا کہ تم ذلیل بندر بن جاؤ پھر ہم نے اس (واقعہ کو) ان لوگوں کے لئے عبرتناک بنادیا جو اس قوم کے معاصر تھے اور ان لوگوں کے لئے بھی جو ان کے زمانے کے بعد آتے رہے اور ڈرنے والوں کے لئے موجب نصیحت ہے)۔

احکامات کو اسی طرح بجالانا

اس قصہ سے عارف کو یہ سمجھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے عبادات کو خاص حالتوں، طریقے، اور خاص اوقات میں مقرر فرمایا ہے، تاکہ ان کی طبعی ظلمات (تاریکیاں) دور ہوں، جو شخص (عبادات کے سلسلہ میں) ان طریقوں کی رعایت نہیں کرتا، اس کی نور کی

استعداد زائل ہوجاتی ہے اور وہ اصحاب سبت کی طرح مسخ ہوجاتا ہے اور جس جانور کے اوصاف اس میں راسخ ہوں، اس کی طبیعت اسی طرح کی بن جاتی ہے، اگرچہ اس امت میں صورت کا مسخ ہوجانا (مٹ جانا) نہ ہو، اس لئے فرد کو شرعی دواؤں سے اپنی انسانیت کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

تشریح:

اللہ کے مقرر کردہ سارے اعمال، انسانی سیرت وکردار کی پاکیزگی اور اللہ سے بندے کے استحکام کا ذریعہ ہیں۔ حیلوں بہانوں سے ان اعمال میں تخفیف کرنا یا ان سے فرار کے راستے تلاش کرنا، اللہ کے عتاب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ اس آیت میں بنی اسرائیل کا قصہ بیان فرمایا گیا ہے کہ ہفتہ کا دن ان کے لئے عبادت کے لئے مقرر کیا گیا تھا، اس دن مچھلی کا شکار کرنا ان کے لئے ممنوع تھا، لیکن انہوں نے اس کی خلاف ورزی کی اور جال ڈال کر مچھلی پھنسانی شروع کی، اس پر اللہ کی طرف سے ان کی صورتیں مسخ کی گئی اور تین دن کے بعد وہ سب مر گئے۔

اللہ کی اطاعت سے بغاوت کا لازمی نتیجہ حیوانی صفات کے غلبہ کی صورت میں ہی ظاہر ہوتا ہے، اس لئے کہ اس صورت میں نفسی قوتیں اور خواہشات طاقتور ہوجاتی ہیں۔ نفسی قوتیں اور خواہشات، حیوانیت کی بدترین صورت ہے۔ (مرتب)

إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاء ۔ (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۶۹)

(وہ ایک زرد رنگ کا بیل ہو)۔

صوفیاء کرام کا نفس کو گائے کی صورت میں تشبیہ دینا

صوفیائے کرام نفس کو گائے کی صورت میں تشبیہ دیتے ہیں اور اس تشبیہ میں مزید قوت پیدا ہوسکتی ہے، جب اسے زرد گائے سے تشبیہ دی جائے، اس لئے کہ نفس کی روشنی بھی زرد ہی کہی جاتی ہے۔

تشریح:

ان آیات میں بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا، جس پر انہوں نے حجتیں نکالنا شروع کیں، یہ دراصل ان کی نفس پرست قوتوں کے اظہار کی صورت تھی، وہ

گائے ذبح کرنے سے فرار کی راہ اختیار کرنا چاہتے تھے۔ نفس کی یہی ''خصوصیت'' ہے کہ وہ اللہ کے احکام کی ادائیگی اور اطاعت کے سلسلہ میں بہت زیادہ کوتاہ واقع ہوا ہے، بلکہ اللہ کی اطاعت سے بغاوت پر تلا ہوا ہے۔ اہل تصوف کی نظر میں نفس کی روشنی زرد ہے، ان کو زرد گائے کا ذبح کرنے کا حکم دیا گیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مقصود نفسی قوتوں کو ذبح کرنا، پامال کرنا اور اللہ کے لئے اسے آخری حد تک ذلیل کرنا ہے۔ اللہ کے احکامات کی اطاعت چونکہ نفس پر سب سے زیادہ بھاری ہے، اس لئے نفسی قوتوں کو تابع کرنے کے لئے اطاعت ضروری ہے، اگرچہ اطاعت بجائے خود مقصود بھی ہے۔ (مرتب)

أَن يُنَزِّلُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ عَلَىٰ مَن يَشَاء ۔ (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۹۰)

(اللہ اپنے فضل سے جس بندہ پر اس کو منظور ہو نازل فرمائے)۔

وہبی احوال کا محض اللہ کا فضل خاص ہونا

اس میں دلیل ہے اس پر کہ احوال موہوبہ (خصوصی عطا) محض فضل ومشیت سے میسر ہوتے ہیں، اس میں مجاہدہ کو کچھ دخل نہیں۔

تشریح:

نبوت جیسا منصب ایسا ہے، جس میں مجاہدوں کو عمل دخل حاصل نہیں، نبوت تو خیر دنیا میں اللہ کا سب سے بڑا انعام ہے، عالم ربانی کو دوسروں کی تربیت کے مقام پر فائز ہونا، یہ کام بھی ایسا ہے، جو اللہ کے فضل خاص کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ یہ ایک اعتبار سے وہبی چیز ہے، دوسرے اعتبار سے اس میں کسب (محنت) کو عمل دخل ہے، کسب کو اس اعتبار سے کہ سالک کو غیر معمولی مجاہدوں سے کام لینا پڑتا ہے، وہبی اس اعتبار سے کہ یہ راہ محض مجاہدوں سے طے ہونے والی نہیں، اللہ فضل خاص فرماتا ہے تو سالک کی تکمیل ہوتی ہے، اس لحاظ سے یہ وہبی ہے۔

اللہ کے اس طرح کے انعامات کے بارے میں حسد وجلن کا مظاہرہ کرنا کہ یہ مقام فلاں شخص کو کیوں ملا، جب کہ اس کے اصل مستحق ہم تھے، یہ تکبر کی نفسیات ہے اور اللہ کی عطا پر اعتراض کی بھی۔ ایسے افراد اللہ کے ہر طرح کے فیوض وبرکات سے محروم رہتے ہیں۔ کچھ چیزیں وہبی ہوتی ہیں، جو مجاہدوں سے حاصل نہیں ہوسکتی، وہ محض اللہ

کی مشیت کے تحت ہوتی ہیں۔ نبوت انہی خاص انعامات میں شامل ہے۔ (مرتب)

مَن کَانَ عَدُوّاً لِّلّٰہِ وَمَلآئِکَتِہِ وَرُسُلِہِ وَجِبْرِیْلَ وَمِیْکَالَ فَإِنَّ اللّٰہَ عَدُوٌّ لِّلْکَافِرِیْنَ. (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۹۸)

(جو شخص اللہ کا دشمن ہو اور فرشتوں کا اور پیغمبروں کا اور جبریل کا اور میکائیل کا تو ایسے کافروں کا اللہ تعالیٰ دشمن ہے)۔

اہل اللہ کی عداوت کا اللہ کی دشمنی کا ذریعہ ہونا

اس آیت میں دلیل ہے کہ اہل اللہ کی عداوت، اللہ کی عداوت کا سبب ہے۔

تشریح:

اہل اللہ سے عداوت کا ایک بڑا نقصان جو ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ ایسے افراد وہ چاہے کتنے ہی اہل علم کیوں نہ ہوں، ان سے دین کا حقیقی فہم سلب کردیا جاتا ہے، وہ دین کے نام پر اپنی خود ساختہ فکر پیش کرکے، لوگوں کو اس کی طرف بلانے میں مصروف ہوجاتے ہیں، یا دین کی جزوی چیزوں کو دین کے فرائض ومقاصد میں شامل کرکے معاشرے میں گروہ بندی کو مستحکم کرتے ہیں، اہل اللہ چونکہ قرآن وسنت کے سلف صالحین کے تسلسل کے امین ووارث ہوتے ہیں اور وہ نور نبوت کے اجزاء سے بہرہ ور ہوتے ہیں، نیز تزکیہ کے حامل ہوتے ہیں، اس لئے ان کی دشمنی، اللہ کی دشمنی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ (مرتب)

یَا أَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُواْ لاَ تَقُولُواْ رَاعِنَا وَقُولُواْ انظُرْنَا . (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۱۰۴)

(اور اے ایمان والو تم راعنا مت کہا کرو، اور انظرنا کہا کرو)۔

ادب شیخ کی تعلیم

اس آیت میں ادب شیخ کی بھی تعلیم ہے، یعنی جس امر میں ادب شیخ میں خلل پڑنے کا بھی شبہ ہو، اس سے بچنا چاہئے۔

تشریح:

شیخ چونکہ طالب کی جملہ روحانی واخلاقی بیماریوں کی اصلاح اور اس کے تزکیہ کا ذریعہ ہے، اس لئے شیخ کے ادب کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

تزکیہ ایسی چیز ہے، جس سے دنیا وآخرت کی جملہ سعادتیں وابستہ ہیں، مربی ومزکی جو طالب کے لئے اتنی سعادتوں کا حامل ہو، اس کے ادب وآداب اور اس سے محبت سے طالب کے تزکیہ کی بہتر سے بہتر صورت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ ادب وآداب اور محبت میں جتنی کمی ہوگی، طالب کی روحانی واخلاقی ترقی میں اسی مناسبت سے سست رفتاری ہوگی۔ (مرتب)

وَقَالُواْ لَن یَدْخُلَ الْجَنَّۃَ إِلاَّ مَن کَانَ ھُوداً أَوْ نَصَارَی تِلْکَ أَمَانِیُّھُمْ قُلْ ھَاتُواْ بُرْھَانَکُمْ إِن کُنتُمْ صَادِقِیْنَ بَلَی مَنْ أَسْلَمَ. (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۱۱۱-۱۱۲)

(اور یہودی اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ جنت میں ہرگز کوئی نہ جائے گا سوائے ان لوگوں کے جو یہودی ہوں یا نصرانی ہوں، یہ دل بہلانے کی باتیں ہیں، آپ کہیے کہ اپنی دلیل لاؤ، اگر تم سچے ہو، ضرور دوسرے لوگ جائیں گے اور جو کوئی شخص اپنا رخ اللہ کی طرف جھکا دے)۔

کامیابی کے دارومدار کا محنت پر ہونا

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فلاح کا تعلق کوششوں سے ہے، نسب سے نہیں، اس لئے کہ فریقین (یعنی یہود ونصاریٰ) کا بڑا دعویٰ یہی نسب (نسبی سلسلہ) تھا، اس لیے کہ منی دعویٰ یقین کا یہی نسب کا تھا، جیسے ہمارے زمانہ میں مشائخ کی اولاد کی حالت ہے۔

تشریح:

تقویٰ، بزرگی اور کامیابی کا تعلق مجاہدوں سے ہے، نہ کہ بزرگ کے خاندان میں پیدا ہونے اور بزرگی کی مسند پر فائز ہونے سے، اگر ذکر وفکر اور عبادت کے لئے محنت وکوشش اور مجاہدے نہیں ہیں تو بزرگ کی خاندانی نسبت کام نہیں آسکتی، تقویٰ، بزرگی اور کامیابی کا سارا انحصار ذاتی محنت ومجاہدے ہی پر منحصر ہے۔ بدقسمتی سے اس دور میں یہ اہم نکتہ نظر انداز ہوا ہے اور بزرگ سے خاندانی نسبت کی بنا پر ان کی اولاد کو ان کی مسند پر فائز کرکے، ان کی طرف تزکیہ وتقویٰ کے حصول کے لئے رجوع کیا جاتا ہے، اللہ کی سنت ہے کہ نفس کی فنائیت کے مجاہدوں کے بغیر حقیقی فیض حاصل نہیں ہوتا اور لوگوں کی قابل ذکر حد تک تزکیہ کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ (مرتب)

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيراً وَنَذِيراً وَلاَ تُسْئَلُ عَنْ أَصْحَابِ الْجَحِيمِ . (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۱۱۹)

(ہم نے آپ کو سچا دین دے کر بھیجا ہے کہ خوشخبری سناتے رہئے اور ڈراتے رہئے، اور آپ سے دوزخ میں جانے والوں کی باز پرس نہ ہوگی)۔

اصلاح نہ چاہنے والوں کے درپے نہ ہونا

یہ آیت اصل ہے، ہمارے حضرات صوفیہ کی اس عادت کی کہ جو شخص اپنی اصلاح نہ چاہے، اس کے درپے نہیں ہوتے۔

تشریح:

اہل اللہ اگرچہ لوگوں کی اصلاح کے حریص ہوتے ہیں کہ ان کا تزکیہ ہو اور انہیں سکون قلبی کی نعمت حاصل ہو اور وہ پاکیزہ اخلاق کے حامل ہوں، لیکن عام طور پر لوگوں کی جو حالت ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ نفس انہیں مادی دنیا پر فریفتہ کردیتا ہے، اس سلسلہ میں ان کی عادتوں کا نظام اتنا خراب ہوجاتا ہے کہ اہل اللہ کی خواہش وتمنا وکوششوں کے باوجود وہ راہ محبت وراہ سلوک کی طرف آنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، چنانچہ اہل اللہ کسی کے درپے نہیں ہوتے، دوچار بار کہنے کے بعد وہ خاموش ہوجاتے ہیں۔ ان کی یہ خاموشی بھی بزبان حال ان کے لئے پیام ہوتی ہے کہ بندہ خدا، اپنی خالق ہستی کی قدر کرو اور قیمتی وقت کو دنیا کے کھیل وتماشہ میں برباد نہ کرو، زندگی کی یہ نعمت اللہ کی عبادت اس کی معرفت اور اس سے والہانہ محبت اور اس کی مخلصانہ اطاعت کے لئے ملی ہے، اس قیمتی زندگی کو مادی راحت کے سامان کے حصول کی جدوجہد میں ضایع اور برباد نہ کرو، یہ دائمی زندگی کے خسارے کا سودا ہے۔ (مرتب)

قَالَ إِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَاماً قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِيْ قَالَ لاَ يَنَالُ عَهْدِيْ الظَّالِمِيْنَ. (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۱۲۴)

(اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تم کو لوگوں کا پیشوا بنادوں گا انہوں نے عرض کیا کہ میری اولاد میں سے بھی کسی کو۔ ارشاد ہوا کہ میرا عہد خلاف ورزی کرنے والوں کو نہ ملے گا)۔

عمل کی خرابی کے باوجود خلافت نہیں ملتی

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلافت عمل کی خرابی کے ساتھ جمع نہیں ہوتی۔

تشریح:

اعمال کی درستگی کے بغیر اہل اللہ کے ہاں خلافت کی روایت موجود نہیں رہی ہے اور اعمال کی درستگی آسان کام نہیں، اس کے لئے عرصہ تک اہل اللہ کی صحبت اور ذکر وفکر کے مجاہدوں کی ضرورت ہوتی ہے، نفسی قوتوں کی پامالی اور نفس مطمئنہ کا حصول غیر معمولی مشقتوں کا طالب ہے، اس مقصد کے لئے زندگی کا قابل ذکر حصہ صرف ہوجاتا ہے، غیر معمولی مجاہدوں کے بعد اگر اللہ کا فضل خاص ہوتا ہے تو فرد دوسروں کی اصلاح وتزکیہ کے مقام پر فائز ہوتا ہے۔ اعمال کی درستگی میں دولت کی آرزوں کا ہونا اور بزرگی کے پردے میں اس کے حصول کی کاوشوں کا ہونا بھی شامل ہے۔ جب تک ظاہری وباطنی اعمال کی درستگی کی صورت پیدا نہیں ہوتی، اس وقت تک سالک خلافت کا اہل نہیں ہوتا، ایسے فرد کو خلافت دینا، اسے ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہے، اس لئے کہ ایسا شخص خلافت کو عام طور پر شہرت اور دولت کے حصول کے لئے استعمال کرتا ہے، اور اس سے بچنا اس کے لئے بہت زیادہ دشوار ہوتا ہے۔ آج کل خلافت مانگنے کا رواج پیدا ہوگیا ہے، جو بجائے خود نااہلی کی علامت ہے، خلافت طلب کرنے کے نتیجہ میں فرد کو اس کے نفس کے حوالے کردیا جاتا ہے۔ (مرتب)

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولاً مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُواْ تَعْلَمُونَ . (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۱۵۱)

(جس طرح ہم نے تم لوگوں میں تم ہی سے ایک (عظیم الشان) رسول بھیجا جو تمہیں ہماری آیتیں پڑھکر سناتے ہیں اور تمہارا تزکیہ کرتے ہیں اور تم کو حکمت کی باتیں سکھاتے ہیں اور تم کو ایسی باتیں تعلیم کرتے ہیں جن کی تمہیں خبر بھی نہیں تھی)۔

کتاب وسنت کے ساتھ ایک اور تعلیم کا اثبات اور اس کی ضرورت

یہ اس پر دلیل ہے کہ کتاب وسنت کی تعلیم کے بعد تعلیم کی ایک اور قسم بھی ہے اور صحبت سے وابستہ ہے اور وہ تعلیم اولیاء اللہ کی صحبت سے حاصل ہوتی ہے (وہ تزکیہ کی تعلیم

ہے)۔

تشریح:

تزکیہ کی نسبت شخصیت کی طرف ہے، کتاب کی طرف نہیں، حضور ﷺ کے بعد ان کے صحبت یافتہ صحابہ کرام نے تابعین کا تزکیہ کیا، تابعین میں جو تزکیہ کے حامل ہوئے، انہوں نے تبع تابعین کا تزکیہ کیا، تزکیہ کا یہ عمل امت میں اسی طرح مسلسل جاری ہے۔
قرآن میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے مقاصد کے سلسلہ میں چار جگہ اس طرح کی آیت آئی ہے کہ وہ انہیں آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کا تزکیہ کرتے ہیں اور کتاب کی تعلیم دیتے ہیں اور حکمت سکھاتے ہیں۔ یہ کام ایسے ہیں، جو آپ ﷺ کے بعد حافظوں، عالموں، مفسروں، محدثوں اور مزکیوں کی طرف منتقل ہوئے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن وسنت کی تعلیم کے ساتھ ساتھ تزکیہ کے لئے مزکیوں اور مربیوں کی طرف رجوع ہونا پڑتا ہے، اس کے بغیر تزکیہ نہیں ہوتا، یہ امت کا تسلسل ہے، اس تسلسل کی جب بھی مخالفت ہوئی اور تزکیہ کے بغیر قرآن وسنت کی راہ پر گامزن ہونے کا دعویٰ کیا گیا تو اس سے معاشرے میں حب جاہ، حب مال اور حرص وہوس جیسے امراض پیدا ہوئے، جس کی وجہ سے معاشرہ فساد سے دوچار ہوا، اس دور میں یہ فساد اس لئے بڑھ گیا ہے کہ ایک تو تزکیہ واحسان وتصوف کے نام پر جعلی صوفیوں کا غلبہ ہوگیا ہے، دوسرے یہ کہ حقیقی اہل اللہ سے تزکیہ کے حصول کے کام کو غیرضروری سمجھا گیا ہے، بعض مفسروں نے اس آیت کی تشریح میں یہاں تک لکھا ہے کہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آیتوں کے سنانے، کتاب اور حکمت کی تعلیم کا بھی اصل مقصد تزکیہ ہے، اس لئے کہ اگر تزکیہ نہ ہوگا تو دین کے نام پر نفسانفسی کا غلبہ ہوگا اور نفسی قوتوں کے غلبہ کی موجودگی میں علم نفع رسانی کا ذریعہ نہ بن سکے گا، اس اعتبار سے قرآن کی یہ آیت بہت اہم ہے۔ تزکیہ کے حوالے سے یہ نکتہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ عقائد کی صحت اور اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہوئے بغیر تزکیہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، تزکیہ کے بغیر فرد کی مثال دل کے اندھے کی سی ہوتی ہے کہ وہ صحیح حقائق ومعارف اور دین کے اصل تقاضوں سے آشنا نہیں ہو پاتا، دین کے تقاضے ایک ہوتے ہیں، اسے نظر دوسرے آتے ہیں۔ دین کا مطالبہ ہوتا ہے کہ اللہ کے ذکر کے نور

سے باطن کو منور کیا جائے اور قرآن میں موجود نور تک رسائی حاصل کی جائے۔ نفسی قوتوں کو مکمل طور پر اللہ اور اس کے رسول کے تابع کیا جائے، جب کہ دل کی بینائی سے محروم افراد دین کے تقاضوں کو خارجی زندگی میں تلاش کرنے لگتے ہیں یا ظاہر پر اتنا زور دیتے ہیں کہ باطن کو بھلا دیتے ہیں اور باطنی اصلاح کو غیرضروری سمجھتے ہیں، اس طرح دل کی بینائی اور تزکیہ سے محرومی کی وجہ سے وہ زندگی بھر قرآن وسنت کی روح تک پہنچنے میں ناکام رہتے ہیں۔

تزکیہ ایسی نعمت عظمٰی ہے، جو اپنے ساتھ تقویٰ، حکمت اور بصیرت لاتا ہے، تزکیہ فرد کو دنیاوی کثافتوں سے بچاکر، آخرت کی دائمی زندگی کے بارے میں حساس بنا دیتا ہے، تزکیہ، فرد میں حقیقی دینی حمیت پیدا کرتا ہے، جس سے وہ قیل قال سے بلند ہو کر، دنیا میں دین کے حوالے سے اپنا حقیقی کردار ادا کرنے کے لئے بے چین ہوجاتا ہے۔ تزکیہ کے بغیر فرد پر قرآن وسنت کے الفاظ تو جاری ہوتے ہیں، لیکن وہ قرآن وسنت میں پوشیدہ حقائق ومعارف اور نفسی قوتوں کو مہذب بنانے کے سلسلہ میں قرآن کے حقیقی پیغام کے فہم سے قاصر ہوتا ہے۔ سبب وہی ہے کہ جب دل کی آنکھیں بیدار نہیں ہوتی تو فرد اور قرآن وسنت میں موجود نور کے فہم کے درمیان حجابات پیدا ہوجاتے ہیں۔ ان حجابات کی وجہ سے ایک تو اس کی تعمیر شخصیت کا کام متاثر ہوتا ہے، دوم یہ کہ وہ سلف صالحین کے تسلسل سے ہٹ جاتا ہے، سوم یہ کہ اسلامی تعلیمات پر پوری طرح عمل پیرا ہونے کے بارے میں اس میں حلاوت، چستی اور مستعدی پیدا نہیں ہو پاتی، چہارم یہ کہ باطنی بُرائیوں سے ناآشنائی کی وجہ سے وہ سیرت وکردار کے اعتبار سے اسلام کی صحیح عکاسی کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔

تزکیہ سے محرومی کے کتنے بڑے نقصانات ہیں، جو فرد وافراد کو بھگتنے پڑتے ہیں۔

تزکیہ ایسی گری پڑی حالت نہیں ہے کہ جو ازخود حاصل ہوجائے یا مطالعہ سے تزکیہ کی سعادت اور اس کی حقیقت حاصل ہوجائے، بلکہ تزکیہ کے لئے کسی اللہ والے کے سامنے خودسپردگی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اور اس سے نفس کی ساری بیماریوں کا علاج کرانا پڑتا ہے، تاکہ باطنی حجابات دور ہوں اور دل کی بینائی کی بحالی کی صورت پیدا ہو سکے۔

افسوس کی بات ہے کہ ظاہری علم کے اکثر حاملین تزکیہ کے حوالے سے ان سارے نکات پر غور وفکر کے لئے تیار نہیں ہوتے، اس لئے کہ وہ تزکیہ کے سلسلہ میں اہل اللہ سے

رجوع ہونے کے لئے تیار نہیں اور اس سلسلہ میں اسلام نے تزکیہ کو جو حیثیت دی ہے، وہ اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں، وہ عالموں، حافظوں، مفسروں ومحدثوں کی اسلامی حیثیت کو تو سمجھتے ہیں، لیکن مزکیوں ومربیوں کی حیثیت سے انکاری ہیں، جس کے نتائج اسلام اور ملت کے نام پر معاشرے میں تعصب، انتشار اور نفسی خرابیوں کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔

تزکیہ کے اعتبار سے معاشرے کی جو المناک صورتحال ہے، وہ ازحد تشویشناک ہے، ایک طرف تو تزکیہ وتصوف واحسان کے نام پر دھمال، رقص، مرد وعورتوں کی مخلوط مجالس، اچھل کود، بے قابو ہونا، بزرگ کے کرنٹ سے گر پڑنا، بے ہوش ہوجانا، دولت جمع کرنا اور شان مان کی زندگی بسر کرنا جیسی بہت ساری خرابیاں ہیں، جن کا مظاہرہ عام ہے اور دوسری طرف ہمارے جدید وقدیم درسگاہوں میں تزکیہ کی اہمیت اور اس کے اہتمام کی صورت لگ بھگ ختم ہوگئی ہے، جس کی وجہ سے ہماری اجتماعی زندگی نفسانفسی، دولت کے حصول کی جدوجہد، ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور اپنی برتری ثابت کرنے جیسے فساد سے اٹ گئی ہے۔ زوال پذیر دور میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ ملت کا ہر ادارہ زوال کے اثرات کی زد میں ہوتا ہے، دریا کا بہاؤ جس رخ میں ہوتا ہے، یہ امید رکھی جائے کہ دریا کے پانی کی کچھ لہریں اس رخ سے دوسری سمت میں رواں ہوں مشکل ہوتا ہے، یہی حالت قوموں کی بھی ہوتی ہے کہ وہ نفسانفسی کے جس رخ پر چل پڑتی ہیں، اس سے دوسری سمت میں چلنا ان کے لئے دشوار ہوتا ہے، لیکن اسلام تو جہاں ملی مسائل میں رہنمائی کا دین ہے، وہاں وہ فرد کی اپنی ذاتی نجات اور دائمی نجات کا دین بھی ہے، اس لئے فرد وافراد کو اللہ کے دائمی عتاب سے بچنے کے لئے کوشاں ہوکر، اپنے تزکیہ کی فکر کرنا، سارے کاموں سے زیادہ اہم کام ہے۔

تزکیہ کے حوالے سے یہ نکتہ واضح ہونا بھی ضروری ہے کہ تزکیہ کے بغیر باطن میں گند کا بہت بڑا ڈھیر موجود ہوتا ہے، جو اخلاص، للھیت اور بےنفسی کی راہ میں حائل ہونے کے ساتھ اعمال کے صادر ہونے کی راہ میں بھی رکاوٹ بنتا ہے، چنانچہ تزکیہ کے بغیر فرد کی گفتگو، اس کے اعمال، اس کی عبادت اور اس کی اطاعت میں نفس کی شدید آمیزش شامل ہوتی ہے، جو فرد کے اعمال کے وزن کو گرانے کا موجب بنتی ہیں بلکہ اللہ کے عتاب کا

باعث بنتی ہے، صحبت صالحہ اور کثرت ذکر کے نور کے ذریعہ باطن میں موجود گند کے اس بہت بڑے ڈھیر کو نکالے بغیر فرد کے اعمال خطرے سے دوچار ہوتے ہیں، اس کی عبادت رسمی نوعیت کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ اور وہ ریا، حسد، ضد، گفتگو برائے گفتگو، بحث برائے بحث، بلکہ اپنی شخصیت اور اپنی رائے کو اونچا کرنے کے لئے دین اور دینی مسائل کے حوالے سے دوسروں سے الجھتا رہتا ہے اور یہ ساری چیزیں اس کا زندگی بھر کا وظیفہ بن جاتی ہیں۔

تزکیہ کے بغیر سیرت وکردار میں پاکیزگی، صبر، برداشت، بردباری، نرمی، محبت وشفقت جیسی صفات بھی پیدا نہیں ہوتی۔

تزکیہ کی یہ ایسی مسلمہ اہمیت ہے کہ اگر اسے سمجھا جائے تو فرد پر سب سے زیادہ اپنی فکر غالب ہوجائے اور دوسروں کے اسلام وایمان کو مشکوک سمجھنے کی اس کی ادا کالعدم ہوجائے۔

تزکیہ، صحبت اہل اللہ اور ذکر کے نور سے ہوتا ہے۔ تزکیہ سے پہلے چونکہ اعمال میں روح اور اخلاص کا غیر معمولی فقدان ہوتا ہے، اس لئے اہل اللہ سے اپنا تزکیہ کرائے بغیر خدمت دین کے نام پر ہونے والے کاموں میں مفاسد پیدا ہونا شروع ہوجاتے ہیں، تعصب، گروہ بندی، دوسروں کی تحقیر، اپنی برتری، دوسروں سے مالی مفادات وابستہ کرنا، جذبہ شہرت اور ریا وغیرہ یہ ساری چیزیں تزکیہ کے فقدان کا نتیجہ ہوتی ہیں چنانچہ صحبت اہل اللہ اور کثرت ذکر سے پہلے خدمت خلق، خدمت دین کے کاموں میں بہت زیادہ مصروفیت فرد کے لئے سخت ضرر رساں ہے، یہ بالکل ایسے ہے جیسے معدے کی سخت خرابی کی حالت میں مرغن غذاؤں کا استعمال کیا جائے، مرغن غذاؤں کی خاصیت ہی قوت کا حاصل ہونا ہے، لیکن معدے کی خرابی کی وجہ سے یہی مرغن غذائیں فرد کی بیماری میں اضافہ کا باعث بن جاتی ہیں۔ یہی صورتحال یہاں بھی ہے۔

اس لئے اہل اللہ، طالب کا سب سے پہلے تزکیہ کرتے ہیں، جب قابل ذکر حد تک اخلاص وبےنفسی پیدا ہوجاتی ہے، سیرت میں پاکیزگی آجاتی ہے تو اس کے بعد اس کا خدمت دین اور نفلی عبادات اور قرآن سے تعلق استوار کرادیتے ہیں، اہل اللہ کے ہاں اصلاح کی یہی ترتیب ہے، جس میں غیر معمولی حکمت عملی کارفرما ہے، اس نکتہ

کو نہ سمجھنا اور ضد کا مظاہرہ کرنے والوں کا تو کوئی علاج ہی نہیں۔ (مرتب)

فَاذْكُرُونِیٓ أَذْكُرْكُمْ ۔ (سورۃ البقرہ، آیت نمبر۱۵۲)

(ان نعمتوں پر مجھے یاد کرو تو میں تمہیں یاد رکھوں گا۔)

ذکر سے تشویش کا نہ ہونا

یہ ذکر اللہ کا اصل ثمرہ (اور برکت) ہے کہ اگر اس کا دھیان غالب ہو، (یعنی ذکر کا استحضار ہو) تو کبھی تشویش نہ ہو۔

تشریح

یہ آیت ذکر کی قدر و قیمت کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے سلسلہ میں نہایت اہم آیت ہے، یہ آیت بندہ مؤمن کو جھنجھوڑ کر، اسے اللہ کے ذکر پر ابھارنے و اکسانے کا موجب بن سکتی ہے، بندہ کے ذکر کرنے سے اللہ اس کا ذکر کرے، بندے کے لئے اس سے بڑی سعادت اور خوش خبری اور کیا ہوسکتی ہے، کہاں خاکی انسان، کہاں کائنات کی عظیم خالق ہستی، اس کی طرف سے بندہ پر یہ سب سے بڑا انعام ہے کہ اس کے ذکر کرنے سے اللہ اس کا ذکر کرتا ہے، فرد اگر اللہ کی طرف سے اس خوش خبری پر غور وفکر سے کام لے تو اس کی حالت یہ ہوجائے کہ وہ اللہ کے ذکر پر ٹوٹ پڑے اور دل وجاں سے اس کا ذکر کرنے لگے اور اپنی شخصیت کو ذکر میں فنا کردے، بلکہ ذکر کے علاوہ اس کے سارے تفکرات کالعدم ہوجائیں، ذاکر کی طرف سے اللہ کو یاد کرنا اور اس کا ذکر کرتے رہنا، ایسی بات ہے، جس سے بندہ خوشی و مسرت کے احساسات سے جس قدر سرشار ہوجائے، کم ہے۔

کثرت ذکر سے ایک تو فرد کی زندگی سراپا خیر وبرکت سے عبارت ہوجاتی ہے، دوم یہ کہ اس پر اللہ کی مدد ونصرت کا دوسرا قانون لاگو ہوتا ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنے اوپر اللہ کی نوازشوں کی بارش محسوس کرنے لگتا ہے، تیسرے یہ کہ غلبۂ ذکر کے نتیجہ میں کوئی پریشانی وتشویش باقی نہیں رہتی۔

تشویش، پریشانی، دکھ وغم اور مصیبتوں کے احساسات تو دراصل ذکر سے دوری، محرومی اور غفلت کا نام ہے، اس لئے کہ غلبۂ ذکر کے نتیجہ میں ہر فرد پر اللہ کی طرف سے سکون وسکینت کا نزول ہوتا رہتا ہے اور نفسی قوتوں کی پامالی کا عمل بھی جاری رہتا ہے، پھر

غلبۂ ذکر، محبوب حقیقی کے ساتھ محبت کے لطیف وپاکیزہ احساسات اپنے ہمراہ لاتا ہے، اللہ کا ذکر فرد کو روحانی اور وجدانی طور پر دوسری دنیا (جو مادی تفکرات سے بالکل محفوظ دنیا ہے) میں لے جانے کا ذریعہ ہے۔

ذکر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ فرد اپنی ساری امیدیں اور توقعات محبوب حقیقی سے وابستہ کردیتا ہے، اس اعتبار سے وہ لوگوں سے گویا ایک طرح سے منقطع ہوجاتا ہے، یعنی ان سے توقعات ومفادات وابستہ کرنے سے محفوظ ہوجاتا ہے، فقر کی زندگی سے اس کی طبعی مناسبت پیدا ہوجاتی ہے، وہ روحانی، وجدانی، نفسیاتی اور ذہنی طور پر اللہ کی معیت میں رہتا ہے، وہ ہر طرح کے خوف وہراس سے بلند ہوجاتا ہے، اسے صرف ایک ہی خوف لاحق ہوتا ہے کہ کہیں محبوب اس سے روٹھ نہ جائے، اللہ اسے اپنے ذکر کی کثرت سے مادی دنیا کے اثراتِ بد سے بچا لیتا ہے، دنیا میں اس کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہوتا، جو اس کے اضطراب اور سخت تشویش کا ذریعہ ہو، ذاکر کی صبر وشکر کی نفسیات پختہ ہوجاتی ہے، وہ اللہ کے بندوں سے حسن ظن رکھتا ہے، وہ سب کی خیر خواہی، بھلائی اور ان کی دنیا وآخرت کی کامیابی کا آرزومند ہوتا ہے، اور دعا گو بھی، محبت ورواداری اس کے مزاج کا حصہ بن جاتی ہے، وہ نہ دینے سے خوش ہوتا ہے اور دینے سے اسے خوشی نہیں ہوتی، وہ احسان کے بدلے میں دعائیں دیتا ہے، وہ لوگوں کے قصور معاف کردیتا ہے۔

ذکر کی حلاوت اسے دنیا کی ساری حلاوتوں سے بے پرواہ و بے نیاز کردیتی ہے، اس کے دل اور ذہن پر قیمتی سے قیمتی نکتے القا ہوتے رہتے ہیں، جو دنیا کے معاملات سے عہدہ برآ ہونے کے سلسلہ میں اس کے لئے معاون ثابت ہوتے ہیں، اسے ایسے علم سے آشنا کیا جاتا ہے، جو قرآن وسنت کی روح اور اس میں موجود نور سے مطابقت رکھتا ہے، اس کی فطرت سلیمہ میں موجود علوم اس کے سامنے آتے رہتے ہیں، جس سے قرآن وسنت پر عمل پیرا ہونے میں اسے آسانی درپیش ہوتی ہے۔

مجلس میں اللہ کا ذکر کرنے والوں کا اللہ فرشتوں کی مجلس میں ذکر کرتا ہے، ذکر، محبوب سے محبت کے ارتقا کا ذریعہ بنتا ہے اور اس کی انسانیت نوازی کے احساسات کے فروغ پذیری کا بھی۔

زندگی اصل میں نام ہی ذکر کا ہے اور مردگی نام ہے ذکر سے محرومی کا، اس لئے کہ

ذکر سے محروم افراد ڈپریشن، فکری انتشار، اشتعال، ضد، انانیت اور حسد وضد جیسی بیماریوں میں مبتلا ہوکر، موت کے سے حالات سے دوچار ہونے لگتے ہیں، آج مادہ پرستی کی جو وبا پھوٹ پڑی ہے، جنس زدگی نے معاشرے کو جس طرح تلپٹ کردیا ہے کہ چھوٹی بچیاں تک اس کا شکار ہورہی ہیں اور جبری زنا کے بعد وہ قتل کردی جارہی ہیں اور رشتوں کا تقدس ختم ہورہا ہے، بھائی کے ہاتھوں بہن کی عزت وعصمت محفوظ نہ رہی ہے، اس کا بنیادی سبب ذکر میں موجود نور وحسن سے محرومی، ماحول کی تاریکی اور مادی حسن پر فدائیت ہی ہے۔

کثرت ذکر، فاسد سے فاسد عادتوں کے خاتمہ اور بہتر سے بہتر عادتوں اور پاکیزہ اعمال کے استحکام کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔

ذکر، محبوب سے قربت کے مراحل طے کرنے کا ذریعہ ہے، یہاں تک کہ محبوب، بندے کا پاؤں بن جاتا ہے، جس سے وہ چلتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہے، جس سے وہ کام کرنے لگتا ہے، اس طرح کی ایک حدیث شریف موجود ہے، جس میں نفلی عبادات کا ذکر ہے، لیکن نفلی عبادات کی افضل شکل ذکر ہی ہے۔

ذکر کے اتنے فوائد وثمرات کے باوجود اللہ کے ذکر کی طرف نہ آنا اور اس سے غفلت کا ہونا، یہ ایسی بات ہے جو افرادِ معاشرے کو ہر طرح کے فتنہ وفساد اور ہر قسم کے ناپاکیزہ احساسات ومنفی جذبات سے دوچار کرنے کا موجب بن جاتی ہے۔

ذکر سے محرومی دراصل محبوب کی طرف سے سزا کی بدترین صورت ہے، اس لئے کہ اس سے فرد کی شخصیت جہاں سنگین داخلی بحران کا شکار ہوتی ہے، وہاں معاشرے کے لئے وہ شخصیت وبال بلکہ زہر قاتل بن جاتی ہے، دوسروں کو اذیت پہنچانے سے خوشی محسوس کرنا، دوسروں کی تحقیر اور گلا وغیبت میں وقت ضایع کرنا اور انتقام لینے کے جذبات کا غالب ہونا، مادی حسن کے مناظر میں کھوجانا، مادہ پرست انسانوں کی بے حیائی اور بے غیرتی کے مناظر پر فریفتہ ہونا، جنس اور پیٹ کو معبود بنانا وغیرہ، یہ ساری چیزیں ذکر سے محرومی ہی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

مغربی انسان نے اپنے سارے علوم وفنوں سے اللہ کے تصور کو نکال دیا ہے، اس کی وجہ سے مغربی انسان کو مکمل طور پر بے رحم مادی قوتوں کے حوالے کردیا گیا ہے، ہم نے مغرب کی تقلید میں اپنے نظام تعلیم سے ہر ممکن حد تک اللہ کے تصور کو نکالنے کی کوشش کی

ہے، اس کی وجہ سے ہمارا جدید انسان بھی مادہ پرست ہوتا جارہا ہے۔

ہمارے دینی مدارس نے ظاہری دینی علوم ہی کو سب کچھ سمجھ لیا ہے، اللہ کے ذکر پر محنت کے ذریعہ دلوں کی شادابی کے کام کو طلبہ کے ذاتی رحم وکرم پر چھوڑ دیا ہے، ہمارے اکثر صوفیاء کرام نے ذکر کے مجاہدوں کو ختم کرکے، اسے چند اوراد تک محدود کردیا ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ معاشرے کو اللہ کے کثرت ذکر کے ذریعہ اللہ کی محبت میں رنگے ہوئے افراد بہت کم مل پاتے ہیں، چنانچہ ذکر پر عدم محنت کی وجہ سے علماء اور صوفیاء کی باتوں میں تاثیر باقی نہیں رہی، افراد معاشرہ سے ذکر کی قدر وقیمت اور اہمیت کا احساس سلب کردیا گیا ہے، اس وقت انسانیت کو درپیش بحران ہو یا مسلم امت کو درپیش مسائل، ان سب کا بنیادی سبب ایک ہی ہے اور وہ ہے کہ اپنی سب سے بڑی محسن اور خالق ہستی کو بھلا دینے کا، محبوب حقیقی کو بھلا دینے کی انسانیت کو جتنی بھی سزا ملے، وہ کم ہے، اس کی سب سے بڑی سزا تو یہی ہے کہ انسان کو نفس کے سب سے طاقتور درندے کے حوالہ کردیا جاتا ہے، جو فرد وافراد کو سب سے لڑا کر، ان پر اپنی انانیت کو غالب کرنے کا ذریعہ بنتا ہے، نیز سزا کی ایک بدترین صورت یہ ہے کہ مادی خوشحالی کے کام کو مقصد زندگی کی حیثیت دے کر اپنی بیشتر صلاحیتیں، توانائیاں اور قیمتی وقت اس میں صرف کرنے کے جنون میں مبتلا کردیا گیا ہے، یہ گویا مٹی کے ڈھیر جمع کرنے کا کام ہے، جس میں افراد کو لگا دیا گیا ہے۔

آج ہم اگر اپنے ہی معاشرے کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ لگ بھگ ہر فرد ایسی اذیت سے دوچار ہوگیا ہے، جس نے اس کی زندگی اجیرن بنادی ہے، آج سے پچاس سال پہلے اس طرح کی اذیت کا تصور کرنا بھی دشوار تھا، نفسی قوتوں کو بے لگام کرنے اور محبوب حقیقی کو بھلانے اور اس کے ذکر کو کوئی اہمیت نہ دینے کی یہی سزا ہے، جو افراد اور قوموں کو ملتی ہے، آخرت میں اس کی جو سزا ملے گی، وہ ناقابل تصور ہوگی، سنبھلنے، بیدار ہونے اور اللہ کے ذکر کا سہارا لینے کی سخت ضرورت ہے، افراد معاشرہ کو ہر طرح کے بحران سے بچانے اور خود اعتمادی سے سرشار کرنے کی واحد صورت یہی ہے، بدقسمتی سے جدید انسان، مادی سرگرمیوں اور مادی کثافتوں میں مبتلا انسان اور جدید فکر کے حامل افراد کی صحبت کے نتیجہ میں ذکر کے حوالے سے کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں، مادی جدوجہد یا علوم وفنون کی سرگرمیاں اس کے سامنے اتنی مزین اور خوبصورت بنا کر پیش کردی جاتی ہیں

کہ وہ ان سرگرمیوں میں محو ہوگیا ہے، چونکہ مادے کی بے رحم طاقتوں کی خصوصیت یہی ہے کہ وہ دل وروح کو بیمار کردیتی ہیں، عقل کو فکری انتشار کا شکار بنادیتی ہیں، نفسیات کو بحران سے دوچار کردیتی ہیں اور نفس امارہ کو فرد پر مسلط کردیتی ہیں، اللہ کا ذکر ایسی چیز ہے جو فرد وافراد پر مادیت، مادی قوتوں اور نفس وشیطان کی ہر یلغار سے بچاکر اسے سکون وسکینت سے بہرہ ور کرنے کا ذریعہ بنتا ہے، جدید انسان کا یہ اٹل فیصلہ کہ وہ کسی بھی صورت میں مادیت کے بتوں کے سامنے سجدہ ریزی کرنے اور اس میں اپنی توانائیاں خرچ کرنے سے باز آکر ذکر کی طرف نہیں آئے گا، ان کا یہ فیصلہ ایسا ہے، جو ان کی تباہی کا موجب ہے اور ان کی توانائیوں کو دیمک کی طرح چاٹ جانے اور انہیں اندر سے کھوکھلا کرنے کا ذریعہ بھی۔

صوفیاء کے یہاں ذکر وفکر کے لئے گوشہ نشینی اور چلہ کا سلسلہ مروج رہا ہے، گوشہ نشینی سے جب یکسوئی سے عبادت اور ذکر وفکر ہو تو اس سے عبادت اور ذکر وفکر کا ملکہ راسخ ہونے لگتا ہے اور ملکہ کے رسوخ سے اسلامی شریعت پر عمل پیرا ہونا آسان ہوجاتا ہے اور قلب، اللہ کی محبت سے سرشار ہوکر، اس سے انوار پھوٹنے لگتے ہیں، فاسد دور میں جب کہ مادہ پرستی کا غلبہ ہو، اس میں یکسوئی پیدا کرنے اور عبادت وذکر وفکر کی عادت کو مستحکم کرنے اور للھیت کے لئے ایک چلہ ناکافی ثابت ہوتا ہے، اس کے لئے طویل عرصہ صرف کرنا پڑتا ہے، اس لئے کہ فاسد ماحول کے اثرات سے فضا ظلمات سے پُر ہوجاتی ہے، اس ظلمات کے اثرات سے مکمل طور پر بچاؤ اور قلب کو انوار سے سرشار کرنے کے لئے غیر معمولی یکسوئی کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ (مرتب)

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الأَمْوَالِ وَالأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ. (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۱۵۵)

(اور ہم تمہارا امتحان کریں گے کسی قدر خوف سے اور فاقہ سے اور مال وجان اور پھلوں کی کمی سے)۔

مجاہدہ اضطراری کا نافع ہونا

اس میں دلالت ہے کہ مجاہدہ اضطراریہ بھی نافع ہوتا ہے۔

تشریح:

اضطراری مجاہدہ میں کیفیات کا حاصل نہ ہونا، قبض وبے چینی کا ہونا، اعمال کے لئے

نفس کی آمادگی کا نہ ہونا، جبر کرکے نفس سے اعمال سرانجام دلانا جیسی چیزیں شامل ہیں۔ لگ بھگ ہر سالک کو ان حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، بلکہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ قبض وبسط کے ادلتے بدلتے حالات میں گذر جاتا ہے، ان کے دل پر آئے دن حشر برپا ہوتا رہتا ہے۔ دل یکساں حالت میں نہ رہنے کی وجہ سے وہ شدید حالت اضطراب میں رہتے ہیں وہ مالی اعتبار سے فقر کی حالت میں رہتے ہیں، اس فقر کو وہ محبوب کی عطا سمجھتے ہیں اور اس پر وہ خوش رہتے ہیں۔ (مرتب)

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ اللّهِ أَندَاداً يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللّهِ. (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۱٦۵)

(اور ایک طرح کے لوگ وہ ہیں جو اللہ کے علاوہ دوسروں کو بھی شریک قرار دیتے ہیں اور ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ سے ضروری ہے)۔

غیر اللہ کے ساتھ تھوڑی محبت کا ہونا

اس میں دلیل ہے کہ غیر اللہ کی محبت اللہ کی محبت کے منافی نہیں، جیسا کہ لفظ اشد سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی درجہ میں دوسرے سے بھی محبت ہے۔

تشریح:

اس آیت میں اللہ کے ساتھ والہانہ محبت، شدید ترین محبت کا ذکر ہے کہ مؤمن اللہ سے والہانہ محبت رکھتے ہیں۔ یہ ایمان کی سب سے بڑی علامت ہے، اس لئے کہ محبت کی وجہ سے اللہ ورسول کی اطاعت آسان ہوجاتی ہے۔ اللہ سے والہانہ محبت دراصل انسانی فطرت کا ناگزیر تقاضا ہے، فرد کے سارے تقاضے اور سارے جذبات اسی محور کے گرد گھومتے ہیں، اس کا واضح ثبوت اور علامت یہ ہے کہ جب فرد میں اللہ کی حقیقی محبت پیدا ہوجاتی ہے تو انسانی زندگی میں سکون، توازن، اعتدال اور حقیقی انسانی جوہر پیدا ہوجاتے ہیں، اللہ سے والہانہ محبت کے زیر اثر اسلامی شریعت پر عمل پیرا ہونے کی استعداد بھی حاصل ہوجاتی ہے، اس لئے اہل اللہ کا سب سے زیادہ زور اللہ سے محبت کے والہانہ جذبات کو بیدار کرکے، انہیں ارتقا تک پہنچانے پر ہے۔

اللہ سے والہانہ محبت ایسی چیز ہے، جس میں ساری صفات وسارے کمالات موجود

ہیں، یہ محبت جب ارتقا پذیر ہوتی ہے تو فرد وافراد کو اللہ سے متصل کردیتی ہے، ان کی روحانی پرواز کو اونچا کردیتی ہے، ان میں شجاعت، بہادری، اور ایثار وقربانی جیسی صفات پیدا کردیتی ہے۔ اللہ سے والہانہ محبت، فرد کو انسانی جوہروں سے بہرہ ور کردیتی ہے، نفس سے معرکہ آرائی کے کام کو آسان بنا کر، اس کے لئے اسلامی شریعت کو سہل بنادیتی ہے۔ اللہ سے والہانہ محبت فطری صلاحیتوں کو اجاگر کرکے، فطرت میں موجود پاکیزہ احساسات اور سلیمہ جذبات بلکہ نور ایمانی کو طاقتور بنادیتی ہے، جسے ایک حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ بچہ فطرت سلیمہ پر پیدا ہوتا ہے۔

اللہ سے والہانہ محبت، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کو حلاوت کا مسئلہ بنا دیتی ہے۔ یہ محبت دوسری ساری محبتوں کو اس کے تابع کردیتی ہے۔ اللہ سے والہانہ محبت، حکمت وفراست کے موتیوں کو اپنے ساتھ لاتی ہے۔ جب یہ محبت دب جاتی ہے اور اس پر مادی محبت غالب آجاتی ہے تو وہ سارا فساد برپا ہوجاتا ہے، جو دولت پر جان نچھاور کرنے، دوسروں کی تحقیر کرنے، دوسروں پر اپنی برتری ثابت کرنے اور مخالفوں کے وجود کو برداشت نہ کرنے وغیرہ جیسی بیماریوں کی صورت میں پیدا ہوتا ہے۔

اللہ کی یہ محبت، دل وروح کی سب سے طاقتور ترین خصوصیت ہے۔ اس سے دل وروح کے ساز بجنے لگتے ہیں، ان میں جان آجاتی ہے، وہ طاقتور ہوجاتے ہیں اور نفس وشیطان ومادی ماحول سے مقابلہ کے سلسلہ میں فرد کی قوت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

محبت کو ایک شعلہ سے بھی مثال دی جاسکتی ہے، جب دل میں ذکر وفکر کے ذریعہ یہ شعلہ بھڑک اٹھتا ہے تو شیاطین اور نفسی قوتیں فرار اختیار کرلیتی ہیں۔

اللہ سے والہانہ محبت کمزور سے کمزور فرد کو بھی اٹھا کر کھڑا کردیتی ہے، اور ان کے فاسد جذبات کی بنیاد کو منہدم کردیتی ہے۔ اللہ سے والہانہ محبت ایک ایسا کرنٹ ہے کہ جب وہ دل تک پہنچتا ہے اور اسے پوری طرح روشن کردیتا ہے تو دل محبوب کے لئے فدا ہونے لگتا ہے اور فرد دنیا وسامان دنیا سے بے نیاز ہوجاتا ہے۔

اللہ سے والہانہ محبت اپنے ساتھ وہ خزانے لاتی ہے، جس کے مقابلہ میں دنیا بھر کے خزانے بے معنی ہوجاتے ہیں۔ اللہ سے والہانہ محبت اللہ کے بندوں سے محبت، شفقت، ان کی حالت زار پر رحم، اپنی دولت اور اپنے علم میں ان کو حصہ دار بنانے کا جذبہ

لانے کا موجب بنتی ہے۔ اسی بنا پر امت کے ایک بڑے صوفی نے کہا ہے کہ صوفی اللہ سے محبت کے اس مقام پر فائز ہوتا ہے، جہاں اس کی جان ومال اس کی اپنی نہیں ہوتی، نیز لوگوں کے لئے اس کی جان ومال جائز ہے۔ ہر بڑے صوفی کے اپنی جان ومال کے بارے میں یہی احساسات رہے ہیں۔

اللہ سے والہانہ محبت اللہ کی ہستی کو اپنے ساتھ لاتی ہے، حدیث شریف کے مطابق جو اللہ کا ہوجاتا ہے، اللہ اس کا ہوجاتا ہے۔

اللہ کی محبت مادی دنیا، اس کے مسائل اور اس کے احساسات اور اس کی فکرمندی کو کالعدم کرنے کا ذریعہ بنتی ہے اور کاموں میں آسانی پیدا ہونے کا ذریعہ بھی۔ "**وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مِنْ أَمْرِهِ يُسْراً**" اللہ سے والہانہ محبت فرد کے لئے ایسی خوشی، مسرت اور حلاوت کا ذریعہ بنتی ہے، جو مادی لذتوں کو بے معنی بنادیتی ہے۔

اللہ کی محبت فرد کو معرفت کے ایسے علوم سے آشنا کردیتی ہے، جسے قرآن وسنت میں پوشیدہ نور سے مشابہت دی جاسکتی ہے۔ یہ علوم دراصل فطرت سلیمہ کا حصہ ہیں، جسے نفسی حجابات دبا دیتے ہیں، اللہ سے والہانہ محبت کے نتیجے میں ظاہری علوم حقیقت کا روپ اختیار کرلیتے ہیں۔

اللہ سے والہانہ محبت فرد کو انسانیت کے حقیقی درد سے آشنا کردیتے ہیں کہ وہ توحید اور اللہ کی محبت سے محروم افراد کی حالت زار پر خون کے آنسو بہانے لگتا ہے اور اس سلسلہ میں ہر ممکن حد تک اپنا کردار ادا کرنے کے لئے کوشاں رہتا ہے۔

اللہ سے والہانہ محبت کے بعد دوسری محبتیں اپنے اپنے دائرے اور حدود میں رہنے لگتی ہیں، اس سے متجاوز نہیں ہوتی۔

اللہ کی جس والہانہ محبت کی خصوصیات بیان کی گئی، وہ مجاہدوں کی طالب ہے اور وقت چاہتی ہے۔ جب تک فرد روز مرہ زندگی کا قابل ذکر وقت دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا، یہ والہانہ محبت پیدا نہیں ہوتی۔ روزانہ قابل ذکر وقت دینے کے ساتھ صبر، حوصلہ اور استقامت کا مظاہرہ بھی کرنا پڑتا ہے، تاکہ محبت اپنا ارتقائی سفر طے کرکے، فرد کی زندگی کے سارے پہلوؤں کو تبدیل کرنے کا ذریعہ بن سکے۔

اللہ سے والہانہ محبت کے یہ ثمرات ایسے ہیں، جو حقیقی دولت کے خزانوں اور

لازوال خوشی ومسرت وحلاوت کے آرزو مندوں کو مجاہدوں اور مسلسل مجاہدوں کے لئے اکسانے وابھارنے کا موجب ہیں۔ راہ محبت دشوار گذار ضرور ہے۔ لیکن اس وقت تک، جب تک اس محبت کے رازوں سے آشنائی نہیں ہوتی اور محبت کا ملکہ کسی حد تک مستحکم نہیں ہوتا، قرآن نے مومنوں کی تو خاصیت ہی یہی بتائی ہے کہ وہ اللہ سے والہانہ محبت رکھتے ہیں۔

جب مومنوں کی سب سے بڑی صفت اور خصوصیت اللہ ہی سے والہانہ محبت بتائی گئی ہے تو راہ محبت میں چلنے سے بہانے تراشنا، سستی وغفلت کا مظاہرہ کرنا، اس کام کے مقابلہ میں دنیا کے چھوٹے چھوٹے کاموں کو اہمیت دینا، یہ اہل ایمان کے لئے نازیبا بات ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عشق کے بغیر نہ تو نفسی قوتیں مطیع ہوتی ہیں اور نہ ہی اللہ ورسول کی اطاعت میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔

راہ محبت کے ثمرات ابتدا ہی سے شروع ہوجاتے ہیں، اگرچہ سالکوں کو اس کا احساس نہ ہو، بالکل اسی طرح جس طرح بچوں کو بالغ پن کے راستے پر جانے کا احساس نہیں ہوتا، چونکہ شروع میں سالک کو نفسی قوتوں، شیاطین اور بے رحم مادی طاقتوں سے شدید مقابلہ درپیش ہوتا ہے، اس لئے وہ اس اڈھیر بن میں رہتا ہے کہ شاید وہ محبت کی راہ میں آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹ رہا ہے، راہ محبت کا سفر ہی ایسا ہے کہ اس سفر کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے طالب کو اپنی رائے سے دستبردار ہوکر، شیخ کی رائے پر اعتماد کرنا پڑتا ہے، اس لئے کہ شیخ اس راہ کے سارے مدوجزر سے گذر چکا ہے، اس لئے وہ بڑی حکمت سے طالب کو اس راہ کے نشیب وفراز سے گذار کر، اللہ کے فضل سے قرب ووصال کی منزل تک پہنچادے گا۔

اللہ سے محبت کے سلسلہ میں یہ نکتہ سمجھنا ضروری ہے کہ جب دل اس محبت سے محروم ہوتا ہے تو اس کے نتیجہ میں دل کی بینائی بتدریج ختم ہونے لگتی ہے، آنکھیں حقیقت کو دیکھنے سے قاصر ہوجاتی ہیں، کان حقیقت کی باتیں سننے سے انکاری ہوجاتے ہیں۔ باطنی حسن اور باطنی ادراک سلب ہوجاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی علامت یہ ہوتی ہے کہ دنیا مقصود ومحبوب ہوجاتی ہے، دنیا کی زندگی کے مقابلہ میں آخرت کی زندگی بے وقعت ہوجاتی

ہے۔ بڑے سے بڑا علم اور بڑی سی بڑی ذہانت بھی دل کی بینائی کی بحالی میں کوئی کردار ادا کرنے سے قاصر رہتی ہے۔

فرد عام طور پر اپنے آپ کو اسلام پر عامل اور اس کا علمبردار سمجھتا ہے، یہ سمجھنا ایک حد تک بجا بھی ہے، لیکن اللہ کی راہ محبت میں چل کر، نفسی قوتوں کو شکست دیئے بغیر ایسا اسلام، قبولیت اسلام کے دائرہ تک محدود ہوتا ہے، ایمان، دل کی گہرائیوں میں بمشکل ہی داخل ہوتا ہے، اللہ کی والہانہ محبت جب دل کو نفسی بتوں کی پرستش کے اثرات سے نجات دلانے میں کامیاب ہوتی ہے، اس کے بعد ہی ایمان کی حقیقت دل میں جاگزیں ہوتی ہے اور حقیقی توحید اور اس کے اثرات غالب ہوتے ہیں۔

ان نکات سے ظاہر ہوتا ہے کہ غلبۂ اسلام کی ہر ایسی تحریک اور توحید کی طرف دعوت دینے والی ایسی جماعتیں جن میں اللہ سے والہانہ محبت کے مراحل سے گزرنے کا انتظام واہتمام نہ ہو، وہ دوئی ودورنگی سے دوچار ہوتی ہیں، یہ دوئی ودورنگی اللہ کی محبت کے مراحل طے کئے بغیر دور نہیں ہوسکتی۔

حکیم الامت مولانا تھانوی نے لکھا ہے کہ میں نے ایک اُمی (ان پڑھ) بزرگ سے پوچھا کہ اللہ سے والہانہ محبت کیسے پیدا ہوگی، انہوں نے کہا، اپنے دونوں ہاتھوں کو کچھ دیر کے لئے رگڑو، میں نے ہاتھوں کو رگڑا تو ہاتھوں میں گرمی پیدا ہوئی، فرمایا کہ اللہ کی محبت اسی طرح پیدا ہوتی ہے کہ ذکر کرتے رہو، یہ ذکر تمہارے لئے ایک دن اللہ سے والہانہ محبت کا ذریعہ بن جائے گا اور اللہ سے عشق ومحبت کا تعلق اسی طرح ہی مستحکم ہوگا۔

یہ بہت اہم نکتہ ہے جسے سمجھنے سے راہ محبت میں چلنے والے سالکوں کو حوصلہ ملتا ہے، اس نکتہ کے استحضار سے ان کی ساری مشکلات آسان ہونے لگتی ہیں۔

اللہ کی جس محبت کے بے پناہ ثمرات ہیں، جن میں سے کچھ کا ذکر کیا گیا، وہ ظاہر ہے اتنی آسانی سے حاصل نہیں ہوسکتی، اس کے لئے وقت کی قربانی دیئے بغیر چارہ کار نہیں۔ نعمت جتنی بڑی ہوتی ہے، اس کے لئے مجاہدے بھی اتنے ہی بڑے ہوتے ہیں، یہ بنیادی اور اصولی نکتہ ہے۔

كَذَالِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ ۔ (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۱۶۷)

(اللہ تعالیٰ اسی طرح ان کی بداعمالیوں کو ارمان کے ساتھ ان کو دکھا دیں گے)۔

اعمال کی شکل وصورت کا ہونا

بعض تفاسیر سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اعمال کی شکل وصورت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ بروز قیامت ان اعمال کو ان کی شکل وصورت کے ساتھ سامنے لائیں گے اور ان کو تولا جائے گا۔

تشریح:

اعمال کی شکل وصورت کا ہونا، بندہ مومن کے لئے بہت زیادہ فکرمندی کی بات ہے کہ گناہ اصل شکل میں ظاہر ہوں گے مثلاً فرد نے چوری کی ہوگی تو چوری کے سامان کے ساتھ موجود ہوگا، زنا کیا ہوگا تو وہاں زنا کے عمل کی صورت میں نظر آئے گا۔

فرد اگر گناہوں کی شکل وصورت کے ہمراہ اللہ کے حضور پیش ہونے کا استحضار اور مراقبہ کرے تو اس کے سامنے اپنا انتہائی وحشتناک منظر آئے گا۔ یہ مراقبہ انشاء اللہ فرد کے لئے گناہوں سے بچاؤ کے لئے ڈھال بن جائے گا۔(اللہ ہم سب کے ساتھ آسانی کا معاملہ فرمائے)۔ (مرتب)

صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ. (سورۃ البقرہ، آیت نمبر١٧١)

(یہ کفار بہرے ہیں، گونگے ہیں اور اندھے ہیں)۔

روحانی ادراک کا اثبات

اس میں روحانی ادراک وصلاحیتوں کا اثبات ہے۔

تشریح:

روحانیت اور روحانی صلاحتیں انسانی شخصیت کا خاصہ ہیں، اس لئے کہ انسانی شخصیت روح ہی سے عبارت ہے، روح رخصت ہوجاتی ہے تو سارا انسانی جسم موجود ہونے کے باوجود وہ سننے، بولنے اور دیکھنے کی صلاحیتوں سے قاصر ہوجاتا ہے، بلکہ روح سے محروم جسم لاش کی صورت اختیار کر جاتا ہے، جب فرد وافراد روحانی صلاحیتوں اور روح کی ضروریات سے عاری ہوجاتے ہیں تو انسانی جسم کی موجودگی کے باوجود روح گویا ایک

طرح سے مردگی کا شکار ہوجاتی ہے۔

روحانی ادراک اور روحانی تقاضے کیا ہیں؟

وہ یہ ہیں کہ روح محبوب کا مشاہدہ چاہتی ہے، جو اسے ذکر وفکر اور محبوب کی عبادت واطاعت ہی سے حاصل ہوسکتا ہے، جس سے روح کی کسی حد تک تشفی ہوتی ہے، ذکر وفکر اور عبادت میں انہماک جس قدر بڑھتا ہے، روح کی تسکین وتشفی میں اسی قدر اضافہ ہوتا جاتا ہے، روح کی اصل غذا ہی یہی ہے، جب روح کو اس کی غذا نہیں ملتی تو وہ مشتعل ہوجاتی ہے اور انسانی شخصیت میں وہ ساری خرابیاں پیدا ہوجاتی ہے، جو روح پر نفس کے غلبہ کی صورت میں پیدا ہوجاتی ہیں، انسانی معاشرے کا سارا فساد روح کو اس کی مطلوبہ غذا نہ ملنے کی وجہ سے ہی پیدا ہوتا ہے۔

آج انسانی معاشرہ درندوں سے بدتر حالت سے دوچار ہوگیا ہے، قتل وغارت گری، بے گناہ انسانوں کی ہلاکت جیسے جرائم عام ہوگئے ہیں، نفسانی اور ذہنی بیماریوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ یہ سارا فساد روح کو لاحق بیماریوں کی وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ افراد معاشرہ نے روح کو اس کی اصل غذا دینا بند کردی ہے۔ روح محبوب کے مشاہدے سے کم حالت پر راضی نہیں ہوسکتی۔ روح کے مشاہدے کی یہ حالت کثرت ذکر سے ہی حاصل ہوسکتی ہے، جس کا قرآن واحادیث میں زور ہے۔ (مرتب)

وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ. (سورۃ البقرہ، آیت نمبر١٧٧)

(اور مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں)۔

عاشقوں کا صرف اللہ سے محبت رکھنا

اگر حبہ میں ضمیر سے مراد مال ہو تو آیت دلیل ہے،اس بات کی کہ مال کی محبت ہرحال میں نقصاندہ نہیں، اگر اللہ کی طرف مراد ہو تو آیت دلیل ہے عاشقوں پر کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہیں (اور خرچ بھی محض اسی کی محبت سے کرتے ہیں) غیر اللہ سے محبت بالذات نہیں کرتے، اگرچہ وہ ثواب ہی ہو۔

تشریح:

اگرچہ مال کے لئے کسی حد تک کوششیں ضروری ہیں، تاکہ ضروریات زندگی کے

لئے کسی کی محتاجی نہ ہو، لیکن عاشقوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ انہیں تو بس اللہ محبوب ہی کی فکر دامنگیر ہوتی ہے، ان کے لئے اللہ سے والہانہ محبت ہی سرمایہ حیات ہوتی ہے۔ اللہ محبوب سے محبت ان کے مزاج کا اس طرح حصہ بن جاتی ہے کہ اس کے بغیر انہیں سکون وچین ہی نصیب نہیں ہوتا۔

محبوب کے لئے ان کے مجاہدے اور فدا کاری ایسی ہوتی ہے، جسے بڑے سے بڑے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں، اس سلسلہ میں ان کی ادائیں حیرت انگیز ہوتی ہیں، دنیا کی محبت میں مستغرق افراد ان کی ان اداؤں کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ جس طرح اہل دنیا، دنیا پر فدا ہوتے ہیں، عاشقوں کی یہی حالت محبوب حقیقی کے ساتھ ہوتی ہے کہ وہ اس کے بغیر رہ نہیں سکتے، ان کی مادی ضروریات کے لئے محبوب کافی ہوتا ہے۔ (مرتب)

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَآ أُولِي الْأَلْبَابِ. (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۱۷۹)

(اور فہیم لوگو، قصاص میں تمہاری جانوں کا بڑا بچاؤ ہے)۔

اللہ کی محبت میں بقا کا نصیب ہونا

بعض نے اس کی تفسیر اخروی زندگی کے ساتھ کی ہے، اس لئے اس کے معنی یہ ہوں گے کہ قاتل سے جب دنیا میں قصاص لے لیا جائے پھر اس سے آخرت میں مقتول کے حق کا مواخذہ نہ ہوگا، جمہور کے نزدیک ہرحال میں ایسا ہے، جب کہ حنفیہ کے نزدیک قاتل کی طرف سے اپنے آپ کو سپرد کرنے کے بعد، پس اس تفسیر پر یہ آیت دلیل ہوگی کہ فنائیت سے بقا وابستہ ہے۔

اس حاشیہ کو حضرت حافظ فضل الرحیم صاحب نے درج ذیل الفاظ میں پیش کیا ہے۔

جب انسان اپنی خواہشات کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی محبت میں ختم کردیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنی محبت کے اندر بقا نصیب فرماتے ہیں، جس سے اس کی دنیوی واخروی زندگی سدھر جاتی ہے۔

تشریح:

اللہ کی محبت میں بقا کا نصیب ہونا اور اس محبت کے زیر اثر زندگی گزارنا، سب سے

بڑی سعادت کی بات ہے۔ بقا کی یہ نعمت خواہشات نفس کی پامالی سے وابستہ ہے، جو کثرت ذکر اور صحبت اہل اللہ کے نتیجہ میں ہی حاصل ہوتی ہے۔ بندہ مومن اللہ کے ساتھ حالت بقا میں رہے، یعنی اس کے دل اور دماغ میں اللہ کا ہمہ وقت استحضار موجود رہے، یہ اتنی بڑی نعمت ہے، جس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہوسکتی۔

یہ نعمت ایسی نہیں ہے، جو آسانی سے حاصل ہو سکے، اس کے لئے صوفی کو جسم وجان اور دل ودماغ کی ساری توانائیاں خرچ کرنی پڑتی ہیں۔ اسے نفسی قوت کے حیرت انگیز مشاہدوں سے گذرنا پڑتا ہے، یہ گری پڑی چیز نہیں ہے کہ زمین سے اٹھالی جائے، بلکہ اللہ کے ساتھ حالت بقا کی نعمت عظمیٰ کے لئے صوفی کو خون کے سمندر سے گذرنا پڑتا ہے، اس کے بعد کہیں جاکر نفسی قوتوں سے جان چھوٹتی ہے اور ان کی شدت کا زور ٹوٹ جاتا ہے۔ (مرتب)

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِن ظُهُورِهَا. (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۱۸۹)

(اور اس میں کوئی فضیلت نہیں ہے کہ گھروں میں اس کی پشت سے آیا کرو)۔

اہل باطل کی نقالی کا ان سے مشابہت اختیار کرنے کے مترادف ہونا

اہل باطل (یعنی کفار وفساق کی) تشبیہ بُری چیز ہے، اگرچہ رسوم وعادات ہی میں ہو۔

تشریح:

حدیث شریف ہے کہ جو شخص جس قوم سے مشابہت اختیار کرے گا، وہ انہی میں سے ہوگا، آج کل مغرب کی مادہ پرست قوموں کی معاشرتی زندگی میں مشابہت اختیار کرنا فیشن ہوگیا ہے۔ صبح کو دفتر یا کارخانہ جانے سے پہلے انہی کی طرح شیو کرکے، سوٹ بوٹ پہن کر بہت مزین ہوکر جانا رواج ہوگیا ہے، اپنی بیٹیوں کو مادہ پرست قوموں کی تقلید میں اعلیٰ فنی اداروں سے تعلیم دلاکر ملازمت کروانے کی روش عام ہے، ان کی اس طرح کی نقالی دراصل ان سے مشابہت اختیار کرنے کے مترادف ہے۔ جب تک مادہ پرست قوموں سے مرعوبانہ ذہنیت کا خاتمہ نہیں ہوتا اور ان کی معاشرت اور معاشرتی زندگی سے کراہت وبیزاری پیدا نہیں ہوتی، حمیت دین پیدا نہیں ہوسکتی۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَبْتَغُوا فَضْلاً مِّن رَّبِّكُمْ. (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۱۹۸)

(تم کو اس میں ذرا بھی گناہ نہیں کہ (حج میں) معاش کی تلاش کرو جو تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے)۔

دنیا کا دین میں معاونت کے لئے استعمال کا اطاعت میں شامل ہونا

اس میں دلالت ہے اس بات پر دنیا کا دین میں معاونت کے لئے استعمال بھی اطاعت میں شامل ہے۔

تشریح:

اللہ کی اطاعت کی بہت ساری صورتیں ہیں، ان میں سے ایک صورت یہ بھی ہے کہ اللہ کی عبادت وذکر کے ساتھ اپنے آپ کو معاشی طور پر دوسروں کی محتاجی سے بچانے اور اپنے دینی کاموں میں معاونت کے لئے معاشی طور پر ایک حد تک جدوجہد کی جائے۔ اس جدوجہد سے پھر اللہ اس میں ایسی برکت عطا فرماتے ہیں کہ فرد سب سے مستغنی ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تھوڑی جدوجہد سے اس کی ضروریات پوری فرمادیتے ہیں اور اس کے لئے دنیاداروں کے برعکس دل وذہن پر دنیا اور سامان دنیا کو مسلط کرنے سے بچنے کی صورت پیدا کردی جاتی ہے، اس دل میں دنیا کی ہیبت اور دنیا کے راحت کے سامان سے محبت نہیں ہوتی، اس طرح ان کی معاشی جدوجہد بابرکت ثابت ہوتی ہے۔ (مرتب)

وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ. (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۲۰۶)

(اور جب اس سے کوئی کہتا ہے کہ اللہ کا خوف کر تو نخوت اس کو اس گناہ پر آمادہ کردیتی ہے)۔

متکبرین کو وعظ ونصیحت کرنے کا مسئلہ

اس میں اصل ہے متکبرین کو وعظ ونصیحت نہ کرنے کی۔

تشریح:

متکبرین کا نفسیاتی سانچہ چونکہ ان کی نیت سے متشکل ہوتا ہے، اس لئے ان سے عبرت ونصیحت کا داعیہ وتقاضا سلب ہوجاتا ہے اور نہ صرف یہ کہ وہ داعی کو حقیر سمجھتے ہیں، بلکہ ان کی طرف سے دعوت کے اصرار سے ان سے محاذ آرائی بھی شروع کردیتے ہیں، اس

طرح کے افراد کو ایک دوبار دعوت دینے کے بعد ان سے صرف نظر کرنا چاہئے، ان کا معاملہ اللہ پر چھوڑنا چاہئے۔

حقیقت یہ ہے کہ تکبر فرد کو آخر وقت تک حق تک رسائی سے دور کردیتا ہے، تکبر کا نتیجہ دونوں جہانوں میں رسوائی کی صورت میں ہی نکلتا ہے، ایسے لوگوں کو مہلت ضرور دی جاتی ہے لیکن جب پکڑ ہوتی ہے تو سخت ہوتی ہے۔ (مرتب)

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ. (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۲۰۷)

(بعض آدمی ایسا بھی ہے جو اللہ کی رضا جوئی میں اپنی جان تک صرف کرڈالتا ہے)۔

نفس کی فنائیت اور اس کا حاصل

اس میں نفس کی فنائیت پر دلیل ہے، کیونکہ اس کا حاصل ومدعا نفس کا ترک کرنا ہے۔

تشریح:

جب مجاہدوں وصحبت کے ذریعہ دل، محبت خداوندی سے سرشار ہوجاتا ہے اور دل کے سارے حصے محبت سے لبریز ہوجاتے ہیں تو فنا کا عمل تکمیل پذیر ہوتا ہے، اس طرح فرد، دوسروں کی تربیت کے قابل ہوتا ہے۔ لیکن فنا کے عمل کا تکمیل پذیر ہونا آسان کام نہیں، اس کے لئے سالک کو دنیا کے سارے کاموں پر اللہ کی محبت کے کام کو ترجیح دینا پڑتا ہے، اور اپنے اوقات کار کی نگرانی کرنی پڑتی ہے، وہ دوران سلوک وقت کے ضائع کرنے کا متحمل نہیں ہوتا، اس کے دل پر برسوں تک محبوب کے لئے حشر برپا ہوتا ہے، محبوب سے وصال کی جدوجہد ہی اس کی سرگرمیوں کا مرکز بن جاتی ہے، اس مقصد کے لئے وہ جتنے بھی مجاہدے کرتا ہے، ان مجاہدوں کو وہ ناکافی سمجھتا ہے، محبوب اس کا سخت امتحان لیتا ہے کہ وہ میرے لئے اپنی کتنی توانائیاں خرچ کرتا ہے۔ آخری حد تک صبر کا امتحان لینے کے بعد ہی محبوب کی طرف سے اسے یہ دولت عظمیٰ عطا ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہی اس دولت کی قدر بھی ہوتی ہے اور نفس کے محاسبہ کے عمل میں مستعدی قائم رہتی ہے اور دنیا کے مکر وفریب سے بچنے کے لئے غیرمعمولی حساسیت پیدا ہوجاتی ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ. (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۲۱۴)

(سنو، کیا تم سمجھتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو گے)۔

اللہ تک رسائی کا
لذتوں کو چھوڑنے اور مجاہدوں کے بغیر نہ ہونا

اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ بارگاہ قدس تک رسائی لذتوں کو چھوڑنے اور مجاہدات سے کام لئے بغیر نہیں ہو سکتی، حدیث حفت الجنت بالمکارہ (جنت کو سختیوں سے گھیراؤ کیا گیا ہے) اس کی تائید ہوتی ہے۔

تشریح:

جنت میں داخلہ اگرچہ اللہ کے فضل سے وابستہ ہے، لیکن اللہ نے اپنے فضل کو عبادت اور ذکر وفکر کے مجاہدوں سے جوڑا ہے اور لذتوں سے دستبرداری سے۔ لذت کی چیزوں سے نفس موٹا ہوتا ہے اور مجاہدوں کے فرار سے بھی نفسی قوتیں طاقتور ہوتی ہیں۔ مجاہدوں کے بغیر چارہ کار ہی نہیں ہے۔ انسان کی پیدائش کا مقصد عبادت ومعرفت کے لئے مجاہدے کرنا ہے، جب یہ زندگی ہی مجاہدوں کے لئے ملی ہے تو متاع زندگی (قیمتی وقت) کو لذتوں اور خواہشوں کی تکمیل میں صرف کرنا ناشکرا پن ہے، بلکہ اللہ سے کئے گئے عہد کو توڑنا ہے، اللہ سے یہ عہد الست بربکم کے وقت کیا گیا تھا۔ مجاہدوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ فرد کو آخرت کی جنت سے پہلے اس دنیا میں جنت کی فضاؤں میں رہنے کے قابل بناتے ہیں، مجاہدوں کے حامل افراد پر ذہنی، نفسیاتی اور وجدانی طور پر سکون، سکینت اور خوشی ومسرت کے بے پناہ احساسات غالب ہوتے ہیں۔

آمَنُوا مَعَهُ مَتَى نَصْرُ اللَّهِ. (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۲۱۴)

(بول اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی)۔

طبعی امور کمال کے منافی نہیں

اس آیت میں اس پر دلالت ہے کہ طبعی امور کاملین میں رہتے ہیں، یہاں تک کہ انبیاء کا گھبرا کر مدد میں جلدی کرنا اس آیت میں مذکور ہے۔

تشریح:

کاملین اگرچہ غیر معمولی ہمت وحوصلہ کے مالک ہوتے ہیں، اور اللہ کی ذات پر انکا

اعتماد بے پناہ ہوتا ہے، تاہم تکلیف، مصیبت اور درد وغم کے اثرات سے کامل طور پر محفوظ ہونا، یہ ان کے شان کے منافی نہیں، اس لئے کہ یہ فطری چیزیں ہیں اور بشریت کے تقاضے ہیں۔ فرد کتنا ہی کامل ہوجائے، بشریت کے تقاضے اُس میں بھی موجود ہوتے ہیں، اگرچہ وہ وقتی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ وہ ان تقاضوں سے مغلوب نہیں ہوتے۔ اس سے اللہ کو اپنی شان عظمت دکھانی ہوتی ہے، تاکہ بندوں میں یہ احساس موجود ہو کہ اللہ اللہ ہے، بندہ بندہ ہے۔ بندہ، عبدیت کے تقاضوں سے بلند نہیں ہو سکتا، اس سے عقیدہ توحید مستحکم ہوتا ہے اور بندوں کی عجز کی حالت ظاہر ہوتی ہے۔ (مرتب)

وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ. (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۲۱۹)

(اور آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ (اللہ کی راہ میں) کتنا خرچ کریں آپ فرمادیں کہ جتنا آسان ہو)۔

مال کے سلسلہ میں بعض بزرگوں کا مزاج

اس میں اصل ہے ذخیرہ نہ رکھنے کی (جیسا کہ بہت سے بزرگوں کا مذاق ہوا ہے)۔

تشریح:

بہت سارے اہل اللہ کی شان یہ رہی ہے کہ وہ حالت فقر کو پسند کرتے رہے ہیں اور اسی میں حلاوت محسوس کرتے ہیں، اس لئے کہ ان کے دلوں سے دنیا کی محبت، دنیا کا رعب اور مادی چیزوں اور راحت کے مادی سامان کے حسن کا احساس نکل چکا ہوتا ہے، وہ محبوب کے حسن کی جن اداؤں سے آشنا ہو چکے ہوتے ہیں، اس کی وجہ سے مادی حسن ان کے لئے کسی اہمیت کا حامل نہیں ہوتا، کم سے کم ضروریات پر اکتفا کرنا، اور دنیا سے بے نیازی ان کی شان رہی ہے۔ اللہ ان کو لوگوں کی محتاجی سے بچاتا ہے، ان کے پاس دولت آتی بھی ہے تو وہ جمع نہیں کرتے اور اللہ کی غریب مخلوق پر خرچ کرتے ہیں، ضرورت کے وقت اللہ ان کی مدد کی صورتیں نکالتا رہتا ہے، وہ جو کہا گیا ہے، بالکل صحیح ہے کہ جو دنیا سے بے نیاز ہوتا ہے، دنیا اس کے پاس ذلیل ہو کر آتی ہے، جو دنیا کی طلب رکھتا ہے، اس کی طلب ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ (مرتب)

وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ. (سورۃ البقرہ، آیت نمبر۲۴۵)

(اور اللہ (کیفیات وحالات میں) کمی کرتے ہیں اور فراخی (کشادگی) کرتے ہیں اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے)۔

قبض وبسط دونوں حالتوں کا

طالب کے لئے نفع بخش ہونا

اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ قبض وبسط دونوں میں حق تعالیٰ کی طرف سے ہیں، کیونکہ دونوں اللہ تک رسائی اور اس کے تجلیات کے آئینے ہیں، بس دونوں حالتیں بہتر ہیں۔

تشریح:

متوسط سالک پر قبض وبسط کے حالات غالب ہوتے ہیں، حالت قبض میں اگرچہ سالک کے دل کا نظام درہم برہم ہوجاتا ہے، اللہ کی جلالی صفات کا عکس اسے شدید مضطرب کردیتا ہے اور ذکر کی حلاوت باقی نہیں رہتی، خیالات میں انتشار ہوتا ہے، لیکن چونکہ قبض کی اس حالت کے بغیر سالک کا نفس پامال نہیں ہوسکتا، اس لئے وقتاً فوقتاً سالک کے دل پر قبض کے تیر برسائے جاتے ہیں۔ قبض کی اس شدید حالت کے معاً بعد صوفی پر بسط کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، جس سے اس کا سینہ کشادہ ہوجاتا ہے اور وہ بے پناہ حلاوت سے سرشار ہوجاتا ہے، صوفی جب تک نفس کی فنائیت کے مراحل طے کرکے، حالت بقا میں نہیں آتا، قبض وبسط کے ان حالات سے بچکر نکلنا، اس کے لئے ممکن نہیں ہوتا، اس طرح صوفی پر انسانی نفس اور نفسیات کے ایسے ایسے راز افشاں ہوتے ہیں کہ اہل علم ودانش اس سے بالکل آشنا نہیں ہوتے۔

صوفی کے حالات سے ناآشنائی اور انسانی نفس ونفسیات کے ہزاروں رازوں سے لاعلمی کی وجہ سے ہی اکثر اہل علم وعقل صوفی کی نہ صرف مخالفت کرتے ہیں، بلکہ اس پر طنز کے تیر برساتے رہتے ہیں۔ جب کہ صوفی اپنی دنیا میں مگن رہتا ہے، اس کا ہدف ایک ہی ہوتا ہے، وہ ہدف نفسی قوتوں کی فنائیت کے ذریعہ حالت بقا میں آنا اور محبوب کی رضامندی کا حاصل ہونا ہے، حالت بقا چونکہ محبوب کے انوار حسن کے ساتھ باقی رہنے والی حالت

ہوتی ہے، جس سے سعادت دارین وابستہ ہوتی ہے، اس لئے صوفی آگ وخون کا دریا عبور کرکے اور محبوب کی بے پناہ جلالی صفات کے عکسوں سے گذر کر، بالآخر اس کے فضل خاص سے حالت وصال تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ (مرتب)

فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انْفِصَامَ لَهَا. (سورۃ البقرہ، آیت نمبر۲۵۶)

(تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا جس کو کسی طرح شکستگی نہیں)۔

اللہ سے نسبت حاصل ہونے کے بعد وہ ٹوٹتی نہیں

اس میں دلیل ہے اس بات پر کہ نسبت مع اللہ کے حصول کے بعد وہ منقطع نہیں ہوتی۔

تشریح:

جب ایک بار اللہ سے نسبت مستحکم ہوگئی تو وہ ختم نہیں ہوتی۔ لیکن اللہ سے اس نسبت کے قائم ہونے کے لئے بندہ مؤمن کو طویل عرصہ تک نفس کے ساتھ خوفناک جنگ لڑنی پڑتی ہے، یہ نسبت آسانی سے حاصل نہیں ہوتی، بیس پچیس سال کے شب وروز کے مجاہدوں سے اگر یہ نسبت حاصل ہوجائے تو آسان سودہ ہے۔ ایک بار نسبت کے قائم ہونے کے بعد وہ ٹوٹتی نہیں، اس لئے کہ اس دوران محبوب اسے امتحانات کے نہ ختم ہونے والے سلسلہ سے گذار کر کندن بنا چکا ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں عام طور پر نسبت کے حصول کی سند جو خلافت کی صورت میں ملتی ہے، وہ حقیقی نسبت سے بہت فروتر ہے اور سلف صالحین میں ملنے والی نسبت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، اس لئے کہ موجودہ دور میں عام طور پر ملنے والی خلافت کی صورت میں نسبت سے حب جاہ وحب مال کے جذبات پامال نہیں ہوتے، اس لئے اس نسبت کو اللہ سے مستحکم نسبت شمار نہیں کیا جا سکتا، البتہ معاشرے میں اس نسبت کے حامل اہل اللہ بھی موجود ہیں، جو گمنام رہتے ہیں اور شہرت اور دولت سے دور بھاگتے ہیں۔ انہیں یہ خطرہ دامنگیر رہتا ہے کہ کہیں شہرت سے اس کے نفس میں ابھار پیدا نہ ہوجائے اور بنگلہ، شاندار گاڑی اور شان مان کی زندگی کے فریب میں آکر اس کی نسبت سلب نہ ہوجائے، اگرچہ نسبت کے لئے ہونے والے مجاہدوں کی وجہ سے اللہ

اپنے فضل خاص سے اسے مستحکم رکھتا ہے، لیکن نفس کے ہولناک تجربات کی وجہ سے صوفی اس سلسلہ میں بہت زیادہ حساس اور چوکنا ہوتا ہے۔

إِن تُبْدُواْ الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَإِن تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاء فَهُوَ خَيْرٌ لُّكُمْ. (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۲۷۱)

(اگر تم ظاہر کر کے صدقے دو تب بھی اچھا ہے اور اگر چھپا کر دو اور فقیروں کو تو یہ چھپا کر دینا تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے)۔

نیک عمل کو ظاہر کرنے یا چھپانے کے بارے میں

اس آیت سے معلوم ہوا کہ عمل کے اعلان اور اخفا میں اختیار ہے اور ساتھ ہی اخفا کی افضلیت بھی ہے، جبکہ اعلان میں کوئی خاص مصلحت نہ ہو۔

تشریح:

ایسا عمل، جس میں شہرت نہ ہو، لوگوں کو اطلاع نہ ہو، وہ زیادہ افضل ہے، اس لئے کہ عام طور پر نفس کی چاہت ہوتی ہے کہ اس کے اعمال پر اسے داد ملتی رہے، اس سے نفس پھولتا ہے اور خوشی محسوس کرتا ہے، البتہ نفس کی قابل ذکر حد تک اصلاح ہوجائے تو اس وقت اگر خاص مصلحت کی خاطر عمل کی تشہیر ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں، اس لئے کہ تہذیب نفس کے بعد عمل میں اعلان سے دوسروں کو اس طرح کے اعمال پر ابھارنا مقصود ہوتا ہے، لیکن قابل ذکر حد تک اصلاح نفس سے پہلے نیک عمل کے اظہار واعلان میں جذبۂ شہرت اور جذبۂ انانیت سے محفوظ ہونا، بہت زیادہ دشوار بات ہے۔ (مرتب)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ. (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۲۸۲)

(اے ایمان والو جب ادھار کا معاملہ کرنے لگو تو ایک میعاد متعین تک تو اس کو لکھ لیا کرو)۔

معاشرت وعادات کی اصلاح کے کام کی اہمیت

اس آیت میں ثبوت ہے، اس بات کا کہ معاشرت وعادات کے نظام کی اصلاح طریق (تصوف) کے منافی نہیں۔

تشریح:

معاشرت وعادات کی اصلاح کے لئے معاشرتی اصلاح، گھریلو اصلاح اور نظام تعلیم کی اصلاح کی ہر کوشش قابل قدر ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ تصوف کے منافی نہیں ہے، بلکہ اس سے معاشرے کے فساد میں کمی واقع ہوگی اور اخلاقی طور پر بہتری کی صورت پیدا ہوگی۔

قومی وعلاقائی سطح پر اس طرح کے نظام کی بہتر طور پر تشکیل نہ ہونے کی وجہ سے معاشرہ بڑے فساد سے دوچار ہونے لگتا ہے۔ اس وقت اس سلسلہ میں معاشرے کی جو صورتحال ہے، وہ بہت زیادہ المناک ہے۔

معاشرت اور عادات کی اصلاح کی ایک اہم صورت تو یہ ہے کہ افراد کو راہ محبت میں لایا جائے، تاکہ ذکر کے نور کے زیر اثر ان کی زندگی کے سارے پہلوؤں میں بہتر سے بہتر کی صورت پیدا ہوجائے اور ذکر کا نور ان کی ساری عادات بد کو پاکیزہ بنانے میں کردار ادا کرے۔

معاشرت وعادات کی اصلاح کی دوسری صورت یہ ہے کہ گھر اور تعلیمی ماحول کو اس سلسلہ میں مؤثر بنایا جائے اور بچوں کی تعلیم وتربیت کا بہتر انتظام کیا جائے اور پاکیزہ بنیادوں پر ان کے مزاج کی تشکیل کا اہتمام کیا جائے۔ (مرتب)

فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ. (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۲۸۳)

(اس کا قلب گنہگار ہوگا)۔

ظاہری وباطنی اصلاح کی اہمیت
اور اس کے اثرات

اس میں دلالت ہے اس بات پر کہ اصل مدار قلب (کی حالت پر) ہے۔ حضرت حافظ فضل الرحیم صاحب نے اس حاشیہ کو اس طرح پیش فرمایا ہے۔

اس آیت میں اعمال قلوب کے احکام کی تحقیق ہے، جس طرح ظاہری اعمال اچھے ہوں یا بُرے ہوں تو ان کے مطابق آخرت میں ثواب وعذاب ہوگا، اس طرح دل کے اعمال جو اختیاری ہیں، جیسے حسد، کینہ، بغض، ریاکاری اور کلمہ کفر کا دل میں جمانا، ان پر عتاب (اور سزا) ہوگی، ان کے بالمقابل تواضع، عجز، اخلاص، دین کے کلمہ کو جمانا وغیرہ ان

پر ثواب ہوگا۔

تشریح:

سارے اعمال کا دارو مدار قلب پر ہے، قلب میں اخلاص، للھیت اور اللہ کی محبت موجزن ہوگی تو اعمال کی قدروقیمت بہت زیادہ ہوگی اور قبولیت کا شرف حاصل ہوگا، دوسری صورت میں اعمال بے وزن ثابت ہوں گے۔

اعمال دوطرح کے ہیں، ایک ظاہری دوسرے باطنی، وذرو ظاھر الاثم وباطنہ (بچو ظاہری گناہوں سے بھی تو باطنی گناہوں سے بھی)۔

دونوں طرح کے گناہوں سے بچنے کی کوشش کئے بغیر اللہ کے عتاب سے بچنا مشکل ہے۔ بڑے بڑے ظاہری گناہوں میں قتل، زنا، سود، شراب، فساد برپا کرنا، نماز نہ پڑھنا وغیرہ شامل ہیں، اسی طرح بڑے بڑے باطنی گناہوں میں دنیا کی محبت، تکبر، حسد، حرص وہوس، ریاکاری، کینہ وغیرہ جیسے گناہ شامل ہیں، اس دور میں ظاہری گناہوں کا تو کچھ نہ کچھ احساس موجود ہے، لیکن باطنی گناہوں کا سرے سے ادراک ہی سلب ہوگیا ہے، سبب یہ ہے کہ باطنی گناہوں کا ادراک اور ان سے بچاؤ کی صورت اہل اللہ اور روحانی معالجوں کی صحبت سے ہی ہوتی ہے، جو عرصہ تک اپنے مربی کی زیر تربیت اپنے باطن کو صاف وپاک کرنے کی جدوجہد میں مصروف رہتے ہیں۔

باطنی گناہوں سے لاپرواہی کا نتیجہ ہے کہ معاشرہ ہولناک فساد سے دوچار ہوگیا ہے اور نفسیاتی اور ذہنی مریضوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ (مرتب)

فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ. (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۲۸۳)

(پس اس کا قلب گنہگار ہوگا)۔

وَإِن تُبْدُواْ مَا فِيْ أَنفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُم بِهِ اللّهُ. (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۲۸۴)

(اور جو باتیں تمہارے نفسوں میں ہیں ان کو اگر تم ظاہر کروگے یا پوشیدہ رکھوگے تو اللہ تعالیٰ تم سے حساب لیں گے)۔

کام کا اصل مدار
قلب پر ہونا

پہلی آیت کے حواشی میں لکھتے ہیں اس میں دلالت ہے اس بات پر (کام کا) اصل مدار قلب پر ہے۔

دوسری کی تشریح میں لکھتے ہیں: اس میں تحقیق ہے قلبی اعمال کے حکم کی۔

تشریح:

اعمال میں جو چیز مطلوب ومقصود ہے، وہ اخلاص وللھیت اور دل کی پاکیزگی ہے، اگر دل میں للھیت اور اخلاص موجود نہیں تو اعمال کی قیمت اور ان کا وزن باقی نہیں رہتا۔ اس لئے مجاہدوں اور فنائیت کے ذریعہ دل کے قبلہ کا رخ درست کرنا، سارے کاموں پر بھاری ہے، دل اگر حب جاہ، حب مال، جذبہ شہرت اور ریا جیسے جذبات سے سرشار ہے تو ایسے دل سے صادر ہونے والے اعمال وہ چاہے پہاڑ جیسے ہی کیوں نہ ہوں، وہ اللہ کی بارگاہ میں قبول نہیں۔ دل اگر اللہ کی محبت کے جذبات اور اخلاص سے سرشار ہے تو ایسے دل سے صادر ہونے والے اعمال زیادہ نہ سہی، ضروری اعمال بھی فرد کی پرواز کو بلند کرنے کا ذریعہ ہیں۔

حدیث شریف ہے کہ اللہ تمہارے اعمال سے زیادہ تمہاری نیت کو دیکھتا ہے، امام غزالی نے ایک اہم نکتہ بیان کیا ہے کہ فاسد نیت کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں اعمال پیش کرنے کی مثال اس شخص کی طرح ہے، جو وقت کے بادشاہ کو تحفہ کے طور پر مردہ گھوڑا پیش کرے، ظاہر ہے اس سے بادشاہ عتاب میں آئے گا اور ایسی حرکت کرنے والا سزا کا مستحق ہوگا۔

جب اعمال کی قبولیت کا مدار نیت پر ہے تو نیت کی درستگی کا عمل سارے کاموں سے زیادہ اولیت کا مستحق ہے۔ دل کو پاکیزہ بناکر نسبت کی درستگی کا کام ایسا کام ہے، جو سب سے زیادہ دشوار گذار ہے۔

اس کے لئے نفس سے سخت معرکہ آرائی کرنی پڑتی ہے، اس لئے کہ دل پر نفس کی گرفت بہت زیادہ سخت اور طاقتور ہوتی ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ نفس، دل کو یرغمال

بنا کر اپنی خواہشات کا مرکز بنا لیتا ہے اور دل کو فساد زدہ کر دیتا ہے۔ دل کی صفائی وتطہیر، اسے محض اللہ کی رضامندی کا حامل بنانا اور قلب سلیم کی صورت دینے کے لئے ذکر وفکر کے مجاہدوں کی ضرورت ہے۔ مجاہدوں کے بغیر دل کا زنگ دور ہو اور وہ خالص اللہ کا ہوجائے، دشوار تر ہے۔ (مرتب)

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ. (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۲۸۵)

(کہ ہم ان کے پیغمبروں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے)۔

اولیاء کرام میں تفریق سے بچنے کی ضرورت

اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح انبیاء میں تفریق مناسب نہیں، اسی طرح اولیاء اللہ میں بھی تفریق نہ کی جائے کہ ایک سے تو اعتقاد ہو، دوسرے کو بُرا بھلا کہتا ہو، ایک کو افضل دوسرے کو مقبول کہتا ہو، یہ درست نہیں، بلکہ سب کے بارے میں جو شریعت کے مطابق چل رہے ہوں، اچھا اعتقاد رکھنا ہے۔

تشریح:

جو اہل اللہ، اسلامی شریعت پر گامزن ہوں، سرمایہ داروں کی سی شان مان والی زندگی سے بلند ہوں، اس طرح کے سارے اہل اللہ ہمارا سرمایہ ہیں۔ ان سے تعلق خاطر رکھنا، ان کی تکریم کرنا اور دل میں ان سے محبت کا قائم ہونا ضروری ہے، اس لئے کہ اس طرح کے اہل اللہ کے وجود سے ہی یہ دنیا قائم ہے۔ ورنہ دنیا ہمہ گیر فتنہ وفساد کی وجہ سے اس قابل ہے کہ اس کا نظام تلپٹ ہوجائے۔ اس طرح کے اہل اللہ کی کاوشوں کی وجہ سے ہی لوگوں کا ایک حصہ راہ محبت میں چل رہا ہے اور وہ اپنی اصلاح وتزکیہ کے لئے کوشاں ہیں، ایسے اہل اللہ سے عناد رکھنا اور ان کی تحقیر کرنا بہت بُرا ہے۔ سب سے اچھا اعتقاد رکھنا ضروری ہے، اگرچہ فرد کو اپنے شیخ ہی سے زیادہ محبت کا تعلق ہونا چاہئے، اپنی اصلاح کے سلسلہ میں وہ اسی کو اپنا معالج سمجھے، لیکن دوسرے اہل اللہ سے بدظنی ہرگز نہ ہونی چاہئے، البتہ حقیقی اہل اللہ اور مصنوعی اہل اللہ (جو شان ومان کی زندگی گذارنے سے دلچسپی رکھتے ہیں، جو زیادہ سے زیادہ مرید بنانے کے فکرمند ہیں اور شہرت کے لئے منصوبہ بندی کرتے ہیں) ان دونوں میں امتیاز کرنا ضروری ہے، تاکہ بزرگی کے روپ میں اس طرح

کے افراد سے بچنے کی سبیل پیدا ہوسکے۔ (مرتب)

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا. (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۲۸۶)

(اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مکلف (جواب دہ) نہیں بناتا مگر اسی کا جو اس کی طاقت میں ہو)۔

مجاہدوں میں طالبوں کی رعایت رکھنا

اس آیت میں دلالت ہے کہ مجاہدہ میں ہر طالب کی رعایت رکھنا چاہئے۔

تشریح:

مختلف صلاحیتوں کے حامل افراد کے مجاہدے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ معاشی ضروریات کے لئے تگ ودو کرنے والے یا ذہنی واعصابی اعتبار سے کمزور افراد کے مجاہدے مختصر ہوتے ہیں، تاکہ ان کے دوسرے ضروری کام متاثر نہ ہوں اور ان کی ذہنی واعصابی حالت بگڑنے نہ پائے، جب کہ بہتر ذہنی واعصابی حالت اور معاشی طور پر مستحکم افراد کے مجاہدے زیادہ ہوتے ہیں، شیخ کو اس کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ مختلف ذہنی سطح کے افراد کو ایک ہی انداز اور یکساں نوعیت کے مجاہدوں پر چلانا صحیح نہیں، تاہم مجاہدے ضروری ہیں، مجاہدوں کے بغیر اصلاح نہیں ہوتی۔ ذکر وفکر کے مجاہدوں ہی میں یہ خاصیت ہے کہ اس سے نفسی قوتیں مضمحل ہوتی ہیں اور فرد وافراد انسانی جوہروں سے بہرہ ور ہوتے ہیں، مجاہدوں کے بغیر افراد کے باطن میں موجود فساد سے بچاؤ کی صورت پیدا نہیں ہوسکتی۔ نفس کی قوت خباثت میں ابلیس سے بڑھکر ہے، اس لئے عزازیل کو ابلیس بنانے میں نفس ہی نے کردار ادا کیا تھا، چنانچہ مجاہدوں کے ذریعہ نفسی قوتوں کی اصلاح کے بغیر چارہ کار نہیں، اہل علم ہوں یا اہل دانش، یا کوئی بھی، وہ مجاہدوں سے مستثنا نہیں ہوسکتا، البتہ مختلف سطح کے افراد کے مجاہدوں میں فرق ہوتا ہے۔ اس فرق کو صحیح مربی ہی سمجھ سکتا ہے اور وہ اپنے تربیتی نظام میں اس کو پیش نظر رکھتا ہے۔ جو زیادہ مجاہدے کرنے کی استعداد رکھتے ہوں، انہیں مجاہدوں میں چلا کر، ان کے نفس کی قوت کو پامال کرنا، ان کے لئے سعادت دارین ہے، جو زیادہ مجاہدوں کے متحمل نہیں، ان سے کچھ نہ کچھ مجاہدے کرانا ضروری ہے، تاکہ ان کی تیز رفتاری سے نہ سہی، کسی نہ کسی طور پر اصلاح کی صورت

پیدا ہوتی رہے۔ (مرتب)

قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ. (سورۃ آل عمران، آیت نمبر۳۱)

(آپ فرمادیجئے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو تم میری اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرنے لگیں گے)۔

حضورﷺ کی اتباع کے بغیر اللہ سے محبت پیدا نہیں ہوسکتی

جو شخص اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنا چاہتا ہو اور یہ چاہتا ہو کہ اللہ تعالیٰ اسے محبوب رکھیں تو یہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا، جب تک اللہ کے محبوب حضرت محمدﷺ کی اتباع نہ کرے۔

تشریح:

اللہ سے محبت کی سب سے بڑی علامت حضورﷺ کی اتباع اور آپ کی غلامی اختیار کرنا ہے۔ اللہ کے رسول کی اتباع کے بغیر اللہ سے محبت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، اس لئے کہ اللہ نے حضورﷺ کی سیرت پاک میں ہمارے لئے کامل نمونہ پیش فرمایا ہے۔

اس کامل نمونہ کو پیش نظر رکھکر، اپنی زندگی کے سارے معاملات کو اسی تعلیمات سے ہمہ آہنگ کرنا، یہ اللہ سے محبت کی سب سے بڑی علامت ہے۔ اللہ سے محبت کا یہ ایسا معیار ہے، جس سے کوئی بھی مستثنا نہیں ہوسکتا، اللہ کے کثرت ذکر میں یہ خاصیت موجود ہے کہ اس کے نتیجہ میں اللہ کے رسول کی اطاعت آسان ہونے لگتی ہے، اس لئے ہر ولی کو جو بھی مقام ملا ہے، وہ اطاعت رسول اللہﷺ کی بدولت ہی ملا ہے، اطاعت رسولﷺ کے بغیر فرد ولی بن ہی نہیں سکتا۔

لوگوں میں شہرت ومقبولیت حاصل کرنے اور مال کمانے کے لئے اپنے آپ کو ولی یا متقی کی حیثیت سے پیش کرنا جو بالخصوص اس دور کی خصوصیات میں شامل ہے، بہت خسارے کا سودہ ہے، اس سے دنیا کے چند دنوں کی تو شہرت حاصل ہوگی، دولت بھی آجائے گی اور مرید بھی مل جائیں گے، لیکن ایسے افراد بالآخر دنیا میں ہی بے نقاب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تو آخرت میں تو سراسر خسارہ ہی خسارہ ہے۔

جب تک ذکر وفکر کے غیر معمولی مجاہدوں سے نفس کی قوت پامال اور فنا نہیں ہوتی، تب تک خلافت یا بزرگی کے مقام پر فائز ہونا اور اسے اپنی سعادت سمجھنا، یہ نفس کا خطرناک حربہ ہے۔ نفس اپنی بڑائی چاہتا ہے، وہ خوشحال مادی زندگی چاہتا ہے۔ ذکر وفکر کے کچھ مجاہدوں کے بعد نفس، فرد کو بزرگی کے روپ میں اس راہ پر گامزن کرنے کے لئے کوشاں ہوتا ہے۔

نفس کے اس فریب سے بچنا آسان کام نہیں، نفسی قوتوں سے نجات کے لئے طویل عرصے تک اہل اللہ کے سامنے اپنے آپ کو پامال کرنا پڑتا ہے، اور غیر معمولی مجاہدوں سے کام لینا پڑتا ہے، ورنہ بزرگی کے روپ میں دنیادارانہ روش سے بچنا دشوار تر ہے۔ (مرتب)

ان الـذین یشترون بعهد الله وایمانهم ثمناً قلیلاً اولٰئک لاخلاق لهم فی الآخره ولایکلمهم الله ولا ینظر الیهم یوم القیٰمة ولا یزکیهم (سورۃ آل عمران آیت نمبر۷۷)

یقیناً جو لوگ حقیر معاوضہ لے لیتے ہیں اس عہد سے جو (انہوں نے) اللہ تعالیٰ سے کیا ہے، اپنی قسموں کے، ان لوگوں کو آخرت میں کچھ حصہ نہ ملے گا اور نہ اللہ تعالیٰ ان سے کلام فرمائیں گے اور نہ ان کی طرف دیکھیں گے قیامت کے روز اور نہ ان کو پاک کریں گے۔

دنیا کی زیب زینت کی خاطر اللہ کے مشاہدے کو ترجیح دینے والے کی سزا

اس میں اس شخص کی حالت کی طرف اشارہ ہے جو دنیا کی زنیت کی طرف مائل ہو اور اس کو اللہ کے مشاہدے پر ترجیح دیتا ہو، اور اپنے ظاہر کو مقربین کے (اسلامی) شعائر سے آراستہ رکھتا ہو، مگر اس میں حب جاہ کی آمیزش بھی موجود ہو، بس ایسا شخص اللہ سے ملاقات اور گفتگو کے حق کے درجہ سے گر کر دنیا وآخرت دونوں میں محروم ہوجائے گا۔

تشریح:

دینی سیاست وقیادت اور بزرگی کے نام پر آخرت کے مقابلے میں دنیاوی مال ومتاع کے حصول کی کوششیں، یہ دراصل غلبۂ نفس کا نتیجہ ہیں اور اس بات کی بھی علامت

کہ ذکر وفکر کے مجاہدوں سے دل اللہ کے انوار حسن کی فیضیابی سے محروم رہا ہے اور نفس کی حالت میں بنیادی تبدیلی واقع نہیں ہوئی اور نفس اب تک مادی راحت کے سامان اور خوشحال مادی زندگی پر فریفتہ ہے، قیامت کے دن ایسے فرد سے اللہ تعالیٰ نہ تو کلام فرمائیں گے، نہ اس کی طرف دیکھیں گے اور نہ ہی اس کا تزکیہ فرمائیں گے۔

قیامت کے دن جب روح، نفس اور انسانی جسم کے درمیاں پردے ختم ہوجائیں گے تو اس وقت روح کی یہ شدید آرزو ہوگی کہ وہ محبوب حقیقی کو ایک نظر دیکھیں یا کم ازکم محبوب حقیقی مجھ سے گفتگو فرمائیں، عین اس موقعہ پر اسے یہ دھمکی دی جائے گی، یہ دھمکی اس کے لئے کئی جہنموں پر بھاری ہوگی۔

یہ آیت ہمارے لئے لمحہ فکریہ ہے کہ ہم مجاہدوں کے ذریعہ نفس کا تزکیہ کریں اور دل سے دنیا کی محبت اور مادی سازو سامان اور راحت کی چیزوں کے ارمان کو نکال دیں اور آخرت میں اللہ سے ملاقات اور اس کے مشاہدے کی فکر کو ساری چیزوں پر غالب کریں، دوسری صورت میں دینی سیادت وقیادت اور بزرگی، فرد کے لئے ہلاکت کا باعث بن جائے گی، بزرگی کے ذریعہ ذلیل دنیا کو مقصود بنانا اور دولت کمانے کے لئے اسے استعمال کرنا نہایت حقیر سودہ ہے اور دائمی زندگی کا خسارہ بھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے کثرت ذکر کے مجاہدوں میں وہ حسن وانوار موجود ہیں کہ جو بھی سالک اللہ کے انوار حسن سے بہرہ ور ہوگا، اسے اللہ تعالیٰ دنیا میں ہی مادی حسن اور مادی زینت کے سامان اور دولت سے بلند تر کردے گا اور اس کے دل سے دنیا کی حیثیت ووقعت کو گرادے گا۔

اللہ کے ذکر پر مطلوبہ محنت نہ کرنے کا یہی نتیجہ ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا کا رعب، اس کی دہشت اور مادی لذتوں وراحتوں کے سامان کے ارمان غالب رہنے لگتے ہیں، چنانچہ دینی منصب اور بزرگی کے نام پر آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو ترجیح دینے کی روش اختیار کی جاتی ہے اور دنیا اپنی طرف کھینچنے میں کامیاب ہوجاتی ہے، جہاں بھی مادی دنیا کے مظاہر، اس کی شان وشوکت اور اس کی رونق کا اہتمام غالب ہوگا، وہاں یہی سمجھا جائے گا کہ نفس کی فنائیت کا عمل مکمل نہیں ہوا ہے، اس لئے علم، منصب اور بزرگی فرد کو حب مال کے جذبات سے بچانے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں، حقیقی اہل اللہ پر ہمیشہ حالت فقر کا غلبہ رہا

ہے اور وہ خود اختیار کردہ فقر کو ترجیح دیتے رہے ہیں، اس کا ایک اہم سبب یہی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کی کثرت اور اس کی شان وشوکت کہیں ان کے لئے آخرت میں اللہ کے مشاہدے سے محرومی کا ذریعہ نہ بن جائے۔

یہ آیت ہمارے لئے اس اعتبار سے بھی تنبیہ کی حیثیت رکھتی ہے کہ نفس کو پوری طرح فنائیت کے مراحل سے گزارا جائے، تاکہ نفس بزرگی، روحانیت، دینی علوم میں مہارت اور دینی منصب کے نام پر فرد کو مادی راحت کے سامان، حب مال اور دنیاداری کی راہ پر گامزن کرنے کا ذریعہ نہ بن جائے۔

اللہ کے انوار حسن کا مشاہدہ خود اس دنیا میں اتنی بڑی نعمت ہے کہ اس سے بڑھکر کوئی نعمت نہیں ہوسکتی، ایسا فرد دنیاداروں اور مالداروں والی راحت اور شان وشوکت کی زندگی اختیار کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا، کجا کہ وہ اس کے لئے کوشاں ہو، اللہ کے نزدیک مال کی کل حیثیت تو یہ ہوتی ہے کہ اس سے جسم وروح کے رشتہ کو قائم رکھنا مقصود ہوتا ہے اور وہ بنیادی ضروریات زندگی کی تکمیل کا ذریعہ ہوتا ہے، اگر مال بجائے خود مقصود ہوجائے، اس کی فکرمندی اور اس کے حصول کی کوششیں عروج پر پہنچ جائیں اور یہ محسوس ہو کہ آخرت کی زندگی پر اس کو ترجیح دی جارہی ہے تو مال کی ایسی فکرمندی اور راحت کا ایسا سامان دراصل اللہ کے انوار حسن سے محرومی کی علامت سمجھی جائے گی، کاش یہ اہم نکتہ ہمارے دلوں میں راسخ ہوجائے اور ہمارے دلوں سے دنیا کی چند روزہ زندگی کی اہمیت اور قدر وقیمت نکل کر، آخرت میں اللہ سے ملاقات کا شوق پیدا ہو اور اس کی تیاری کا کام اور اس کے لئے جدوجہد مقصود زندگی بن جائے۔

إِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَناً قَلِيْلاً أُوْلَـئِكَ لاَ خَلاَقَ لَهُمْ فِيْ الآخِرَةِ وَلاَ يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلاَ يَنظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلاَ يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ. (سورۃ آل عمران، آیت نمبر ۷۷)

(یقیناً جو لوگ حقیر معاوضہ لے لیتے ہیں بمقابلہ اس عہد کے جو اللہ تعالیٰ سے کیا ہے اور اپنی قسموں کے، ان لوگوں کو آخرت میں کچھ حصہ نہ ملے گا، اور نہ اس روز اللہ تعالیٰ ان سے کلام فرمائیں گے اور نہ ان کی طرف دیکھیں گے اور نہ ان کو پاک کریں گے، ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا)۔

زینت مال پر اللہ کے مشاہدے کوترجیح دینے والے کی سزا

اس میں اس شخص کی حالت کی طرف اشارہ ہے، جو زینتِ دنیا کی طرف مائل ہو اور اس کو اللہ کے مشاہدہ پر ترجیح دیتا ہو اور اپنے ظاہر کو مقربین کے شعائر (شرعی اعمال) سے آراستہ رکھتا ہو، مگر اس میں حب جاہ کی آمیزش بھی شامل ہو، ایسا فرد دنیا وآخرت میں اللہ کے لقاء اور گفتگو کے درجہ سے گرجائے گا۔ (محروم ہوجائے گا)

تشریح:

آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو ترجیح دینے کی ایک بڑی سزا جو بندے کو ملتی ہے، وہ یہ ہے کہ دنیا میں بھی اللہ کے انوار حسن سے محرومی ہوگی تو آخرت میں تو یہ محرومی اپنی انتہائی صورت میں ظاہر ہوگی۔

دشمن اور مخالف کو یہ دھمکی دینا کہ میں نہ تم سے کلام کروں گا اور نہ ہی تمہاری طرف دیکھوں گا اور نہ تزکیہ کروں گا، دشمن کے لئے یہ دھمکی بظاہر بے معنیٰ لگتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ آخرت میں جب سارے پردے اٹھ جائیں گے تو اس وقت اللہ محبوب کے لئے روح کا اضطراب بے پناہ ہوجائے گا۔ روح یہ چاہے گی کہ اسے ایک بار اللہ کی طرف دیکھنے کا موقعہ ملے، یا اللہ مجھ سے ایک ہی جملہ سہی، گفتگو فرمائے، عین اس وقت جب اسے یہ دھمکی ملے گی تو یہ دھمکی روح پر ہزار جھنموں پر بھاری ہوگی۔

آخرت تو آخرت ہے، دنیا میں بھی روح، محبوب کے لئے ترستی رہتی ہے۔ ذکر سے محرومی اور دولت ودنیا کو ترجیح دینے اور مادی زندگی پر فدا ہونے کے نتیجہ میں خود اس دنیا میں روح تڑپتی رہتی ہے اور روح اپنا یہ اشتعال ذہن، دل اور نفسیات واعصاب کی طرف منتقل کرتی ہے، جس سے فردوافراد سراپا اضطراب بن جاتے ہیں، غیر معمولی ذہنی دباؤ کا شکار ہوتے ہیں اور سکون کے لئے ترستے رہتے ہیں۔

روح کی غذا اللہ کا ذکر ہے، جس سے اسے اللہ کے انوار حسن کے اجزا سے بہرہ وری ہوتی رہتی ہیں، جس سے دنیا میں اس کی تشفی وتسکین کا سامان ہوتا رہتا ہے، یہی ذکر آخرت میں اللہ کے دیدار کا ذریعہ بنے گا، واضح ہو کہ ذکر کا لازمی نتیجہ اعمال صالحہ کی

صورت میں ہی ظاہر ہوتا ہے۔ (مرتب)

إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُواْ بَعْدَ إِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُواْ كُفْراً لَّن تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ. (سورۃ آل عمران، آیت نمبر۹۰)

(بیشک جو لوگ کافر ہوئے اپنے ایمان لانے کے بعد پھر کفر میں بڑھتے رہے، کفر میں، ان کی توبہ ہرگز قبول نہ ہوگی)۔

اہل اللہ سے تعلق قائم ہونے کے بعد اسے توڑنے کے اثرات

یہ عادت اللہ (اللہ کا قانون) ہے اس شخص کے بارے میں جو اہل اللہ کے طریقہ کی طرف متوجہ ہوا (یعنی اصلاح وتزکیہ کے لئے ان سے وابستہ ہوا۔ مرتب) پھر تعطل یا انکار کی راہ سے اس سے دوری اختیار کی تو اکثر پھر اسے اس کی طرف لوٹنے کی توفیق نصیب نہیں ہوتی، بلکہ وہ بے توفیق ہوجاتا ہے، پھر بعض اوقات وہ اشد (انتہا) کی طرف چلا جاتا ہے کہ اہل طریقت سے نفرت وعداوت رکھنے لگتا ہے۔ پھر وہ دین کے بڑے جزو سے خارج ہونے لگتا ہے۔ نعوذ باللہ

تشریح:

اہل اللہ سے ایک بار قریبی تعلق قائم کرنے کے بعد بغیر کسی معقول عذر کے اسے توڑنا، یہ فرد کے لئے سخت خطرے کی بات ہے، اس سے نہ صرف یہ کہ اس کے تزکیہ کا عمل متاثر ہوتا ہے، بلکہ اس کے اعمال میں خلل پیدا ہونے لگتا ہے، اس کا قلبی وذہنی سکون برباد ہونے لگتا ہے۔ بعض لوگ تعلق توڑنے کے بعد اہل اللہ کی مخالفت اور دشمنی پر اتر آتے ہیں۔ اور ان کے خلاف ان کی ضد کی نفسیات پختہ ہونے لگتی ہے۔ اس صورت میں ان کی دینی، اخلاقی اور روحانی حالت زندگی بھر سنبھلنے نہیں پاتی۔ مختلف آزمائشوں میں مبتلا ہونے کے باوجود وہ رجوع ہونے کے لئے تیار نہیں ہوتے، یہ بڑی سزا ہوتی ہے جو انہیں ملتی ہے، اللہ ہمیں اس سزا سے بچالے، بعض لوگ تصوف کے اصولوں سے ناواقفیت کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں، اللہ تعالی اس طرح کے افراد کے لئے سنبھلنے کی صورت پیدا کرہی دیتا ہے۔ (مرتب)

لَن تَنَالُواْ الْبِرَّ حَتَّى تُنفِقُواْ مِمَّا تُحِبُّونَ. (سورۃ آل عمران، آیت نمبر۹۰)

(تم کامل خیر (نیکی) کبھی حاصل نہ کرسکو گے یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز (اللہ

کے لئے) خرچ نہ کرو)۔

اپنی ہستی کو اللہ کے لئے پامال کرنا
قرب الٰہی کا موجب ہونا

اس کے ساتھ یہ بات بھی شامل کی جائے کہ انسان کو طبعًا سب سے زیادہ جو چیز محبوب ہے، وہ اپنی جان ہے، تو یہ آیت دلیل ہوئی، اس بات پر کہ اپنی ہستی کو محبوب حقیقی کے لئے ذلیل کرنا، یہ قرب الٰہی کا موجب ہے۔

تشریح:

فرد کو اپنی جان بھی محبوب ہے تو مال بھی اور اپنی رائے بھی، اللہ کے لئے ان ساری چیزوں کی قربانی کے بغیر کامل نیکی کا حاصل ہونا ممکن نہیں، یہاں مولانا نے یہ نکتہ بھی بیان فرمایا ہے کہ اللہ محبوب کے لئے اپنی ہستی اور اپنے وجود کو فنا کئے بغیر قرب الٰہی حاصل نہیں ہوسکتا، اپنی ہستی کی فنا کا کام سب سے زیادہ دشوار گزار ہے، عام طور پر افراد کی جو حالت ہے، وہ یہ ہے کہ وہ اپنی ہستی سے دستبردار ہونے کے لئے کسی طرح تیار نہیں، اس لئے کہ اس کی وجہ سے خواہشات اور مادی دنیا کے مفادات سے دستبرداری اختیار کرنی پڑتی ہے، نیز اس کے لئے غیر معمولی مجاہدوں سے کام لینا پڑتا ہے، فرد وافراد ان دونوں چیزوں کے لئے تیار نہیں، سوائے کچھ خوش نصیب افراد کے، چنانچہ کامل خیر تک رسائی دشوار رہتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب تک فرد اپنی ہستی کو مٹانے کے لئے تیار نہیں ہوتا، اس وقت تک کامل خیر کا حصول اس کے لئے دشوار تر ہے۔ (مرتب)

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِىٓ إِسْرَآئِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَآئِيلُ. (سورۃ آل عمران، آیت نمبر ۹۳)

(سب کھانے کی چیزیں تورات کے نزول سے پہلے باستثناء اس کے جس کو یعقوب نے اپنے نفس پر حرام کر لیا تھا، بنی اسرائیل پر حلال تھیں)۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی خاطر
لذیذ چیزوں کو ترک کرنا

روح المعانی میں ہے کہ اس حکایت کے بیان کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ اہل محبت کو

اس بات کی تعلیم دی جائے کہ جو چیزیں انہیں محبوب ہیں، جیسے مرغوب کھانے، لذیذ چیزیں، انہیں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی طلب میں ترک کر دیا جائے۔

تشریح:

جب اللہ محبوب ومقصود بنتا ہے، اور اس کے لئے طالب کا مجاہدوں کا عمل شروع ہوتا ہے تو ایسی ہر چیز، جو فرد کو اللہ محبوب سے دور کرنے، خواہشات کی طرف راغب کرنے اور نفس کو موٹا کرنے کا ذریعہ بنے، طالب کو ان ساری چیزوں کی قربانی دینا پڑتی ہے اور اس کے بغیر چارہ کار نہیں ہوتا، محبوب کے وصال کا مقصود آسانی سے حاصل نہیں ہوتا، اس کے لئے طالب کو راحت ولذت کے سامان سے دستبرداری اختیار کرنی پڑتی ہے، حضرت شاہ عبدالقادر جیلانیؒ کا بیان ہے کہ میں پچیس سال تک مجاہدوں کی حالت میں رہا، ذکر وفکر میں مصروف رہا، اس سارے عرصہ میں نہ لوگ مجھے پہنچاتے اور نہ ہی میں لوگوں کو پہچانتا تھا، اس دوران دو دو ہفتوں تک مجھے روکھی روٹی بھی میسر نہیں تھی۔

بزرگوں نے نفسی قوتوں کو پامال کرنے اور اللہ کے وصال کے لئے اس طرح کی قربانیاں دی ہیں۔ ہر بڑے بزرگ کے حالات وواقعات پڑھتے ہیں تو اس طرح کی قربانیوں وایثار کے واقعات نظر آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں اللہ کے رسول ﷺ کی مثال بھی سامنے ہے کہ آپ کے گھر میں دو دو ماہ تک آگ نہیں جلتی تھی، آپ بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھتے تھے۔

اللہ کی یہ عجیب سنت ہے کہ جتنی بڑی شخصیت، زہد وفقر، دنیا سے استغنا اور لذت کی چیزوں کی دستبرداری کے معاملہ میں اتنی زیادہ پیش قدمی۔

موجودہ دور میں طالب اگر لذت کی چیزوں اور مرغوب کھانوں سے دست بردار نہ ہوں تو کوئی زیادہ حرج نہیں، اس لئے کہ موجودہ دور میں غذا اور آب وہوا میں خرابی کی وجہ سے قلیل غذا سے طالب کی صحت کے متاثر ہونے کا خطرہ درپیش ہے، لیکن ذکر وفکر کے مجاہدوں کے لئے مستعدی کے ساتھ چلنا تو ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر نفس کی پامالی اور اللہ کی رضامندی کا حصول دشوار تر ہے۔ (مرتب)

وَمَن يَعْتَصِم بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِىَ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ. (سورۃ آل عمران، آیت

نمبر۱۰۱)

(اور جو شخص اللہ تعالیٰ کو مضبوط پکڑتا ہے تو ضرور راہ راست کی ہدایت کیا جاتا ہے)۔

اللہ کو مضبوط پکڑنے کی تشریح

روح المعانی میں ہے کہ بعض کے نزدیک اللہ کو مضبوط پکڑنے کی حقیقت یہ ہے کہ اسباب جو کہ معنوی بت ہیں، ان سے قلب میں دوری پیدا ہو، اور اپنے آپ کو کچھ سمجھنے سے دستبردار ہوکر اللہ کی طرف یکسو ہوا جائے، اور بعض نے کہا ہے کہ عاشقوں کا اللہ کو مضبوط پکڑنا یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ سب کو چھوڑ کر اس کی پناہ میں آجائیں، اور اہل حقائق کا مضبوط پکڑنا یہ ہے کہ یہ مشاہدہ ہو کہ ہم قبضہ میں ہیں، اس سے بھی بلند ہوا جائے اور اپنے آپ کو اس سے بھی فنا کردیا جائے۔

تشریح:

اللہ تعالیٰ کو مضبوط پکڑنا، جس سے راہ راست کی ہدایت عطا ہوتی ہے، وہ راہ سلوک کے مختلف سطح کے سالکوں کے لئے مختلف ہوتی ہے۔ متوسط سالک وصوفی برسوں تک نفس سے حالت جنگ میں رہتا ہے۔ وہ برسوں کے مجاہدوں کے بعد کہیں جاکر اس قابل ہوتا ہے کہ اس کے قلب میں اسباب سے دوری پیدا ہوتی ہے اور وہ اپنے آپ کو کچھ سمجھنے کے بجائے اللہ سے ایک حد تک یکسو ہوجاتا ہے۔ متوسط سالک جب حالت توسط کے آخر میں آتا ہے تو وہ سب سے یکسو ہوکر، اللہ کی پناہ میں آجاتا ہے اور لوگوں کے نفع ونقصان کے احساس سے بلند ہوکر، وہ اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کردیتا ہے۔

منتہی صوفی جب حالت انتہا تک پہنچتا ہے تو اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اس پر ہر معاملہ میں فنائیت کا رنگ غالب ہوتا ہے، اپنی نفی اور سب کچھ محبوب کی طرف سے ہونے کا اس کا احساس غالب رہتا ہے۔

بلکہ بظاہر تو وہ دنیا میں رہتا ہے، لیکن بباطن وہ محبوب کے ساتھ اس طرح وابستہ ہوتا ہے کہ اس سے دنیا اور اپنی ہستی کا احساس معدوم ہوجاتا ہے، یہ مقام ہماشما کے بس کی بات نہیں، یہ حالت، زندگی کا بڑا حصہ مجاہدوں میں صرف کرنے والے اہل اللہ ہی کی ہوتی

ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کو مضبوط پکڑنے اور اللہ کے ساتھ مکمل طور پر یکسو ہونے کا عمل آسان نہیں، اس کے لئے مجاہدوں کے ساتھ ساتھ اللہ کے فضل خاص کی ضرورت ہوتی ہے۔

موجودہ دور تو ایسا آیا ہے کہ اس میں یہ درجے ومقامات تو دور کی بات ہے، اگر ایک حد تک اپنی ذاتی اصلاح ہوجائے، ایک حد تک نفسی قوتوں کا زور ٹوٹ جائے اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں کسی حد تک آسانی ہوجائے، دنیا پر ٹوٹ پڑنے کے میلانات میں بڑی حد تک کمی واقع ہوجائے تو اس دور میں یہ بات بجائے خود بڑی کامیابی شمار ہوگی۔ (مرتب)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ.

(سورۃ آل عمران، آیت نمبر۱۰۲)

(اے ایمان والو اللہ سے ڈرا کرو، ڈرنے کا حق (ادا کرو) اور اسلام کے سوا کسی اور پر جان مت دینا۔)

طریقت کا حاصل تقویٰ اور حق تقویٰ کا ہونا

یہ آیت اہل طریقت (اہل تصوف) کا جو مقصود ہے، اس مقصود کے سلسلے میں واضح آیت ہے، اس لئے کہ طریقت (وتصوف) کا حاصل یہی تقویٰ اور حق تقویٰ ہے۔

تشریح:

قرآن میں جن چیزوں پر زیادہ زور دیا گیا ہے، ان میں تقویٰ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، تقویٰ پرہیزگاری کی زندگی اختیار کرنے، ہر برائی سے بچکر چلنے، اللہ کی اطاعت میں استقامت کا مظاہرہ کرنے، اللہ سے ڈرتے رہنے، اس کے خوف وخشیت کی حالت میں رہنے، اللہ کی شانِ عظمت کی حالت میں رہنے اور اللہ کے کھٹکہ کی حالت ہونے کا ذریعہ ہے کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے اور قیامت میں مجھے اپنے ہر عمل کی اللہ کے سامنے جواب دہی کرنی ہوگی۔

تصوف کی ساری ریاضتوں کا حاصل تقویٰ کی اس حالت کو مستحکم کرنا ہے، اسلام

وایمان کا سار انحصار تقویٰ ہی پر ہے، جب تقویٰ کی حالت غالب ہو تو گناہوں کے سلسلہ میں فرد کی حساسیت بڑھ جاتی ہے، وہ ہر گناہ سے اس طرح بچنے لگتا ہے، جس طرح شیر کی (خونخواری) سے بچا جاتا ہے، شیر کو قریب سے دیکھ کر فرد میں خوف زدگی کی جو حالت ہوتی ہے، یہی حالت تقویٰ کے غلبہ کے نتیجہ میں ہر گناہ سے بچنے کے سلسلہ میں ہوجاتی ہے، لیکن شیر سے ڈرنے اور اللہ سے ڈرنے میں ایک جوہری فرق موجود ہے، وہ فرق یہ ہے کہ اللہ جہاں جلال کی حامل ہستی ہے، وہاں جمال کی بھی، اللہ جہاں صاحب عظمت ہستی ہے، وہاں اس کی ایک بڑی صفت بندوں سے محبت کرنے کی بھی ہے، وہ غفور اور رحیم ذات بھی ہے، اس لئے اللہ سے محض ڈرنا نہیں ہے، بلکہ اس سے محبت کرنا بھی ہے اور محبت کے سلیقہ سے آشنا ہونا بھی ہے، اللہ کی ذات سے ڈرنے کے ساتھ ساتھ اس سے بہتر امیدیں بھی وابستہ کرنی ہیں، تقویٰ یا خشیت کا استعمال جب اللہ کے سلسلہ میں ہو تو وہاں ساری خوبیوں وکمالات کی حامل ہستی سے تقویٰ اس طرح اختیار کیا جائے کہ اس میں اللہ سے والہانہ محبت بھی شامل ہو، اور اس سے بخشش کی امیدیں بھی وابستہ ہوں، تقویٰ میں جب اللہ کی دوسری صفات کے اجزاء شامل ہوجاتے ہیں تو اس میں توازن واعتدال پیدا ہوجاتا ہے، اس طرح تقویٰ محض خوف وڈر سے عبارت نہیں ہوتی، بلکہ اللہ سے والہانہ محبت بھی اس تقویٰ کا حصہ بن جاتی ہے، تقویٰ ایسی چیز ہے، جس سے نیکی اور خیر کا ہر کام وابستہ ہے، تقویٰ ہر برائی سے بچاؤ کے لئے ڈھال کی حیثیت رکھتی ہے، تقویٰ اپنے ساتھ شجاعت وبہادری کے جوہر بھی لاتی ہے کہ فرد اللہ کے سوا سب کے خوف سے آزاد ہوجاتا ہے۔

تقویٰ کے نتیجہ میں بہت ساری نعمتیں حاصل ہوتی ہیں، جس کا قرآن میں کئی مقامات پر ذکر ہے، یہ نعمتیں ایسی ہیں، جن میں دین ودنیا اور دنیا وآخرت کی ساری نعمتیں شامل ہیں۔

تقویٰ کی اس اہمیت کے پیش نظر ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس کے بارے میں قرآن کے حوالے سے مزید تفصیلات پیش کریں۔

اللہ کو ایسی تقویٰ مطلوب ہے، جس سے فرد میں اس کے جلال وجمال کی صفات میں توازن موجود ہو، اس لئے اہل اللہ، اللہ کی راہ محبت اختیار کرتے ہیں، تاکہ اللہ سے

والہانہ محبت کے نتیجہ میں جہاں اللہ کی شان عظمت غالب ہوجائے، وہاں اللہ کی صفت جمال کی پوری طرح عکس ریزی بھی ہو۔

تقویٰ اپنے ساتھ نجات وفلاح لاتی ہے، " **وَاتَّقُواْ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ** "تقویٰ اپنے ساتھ حق اور باطل میں فرق پیدا کرنے کی استعداد لاتی ہے۔ **يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ إِن تَتَّقُواْ اللّٰهَ يَجْعَل لَّكُمْ فُرْقَاناً**.

تقویٰ اپنے ساتھ حالت نور لاتی ہے جس میں بندہ چلتا ہے اور اس نور کی حالت میں زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ **يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَآمِنُوا بِرَسُولِهِ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِن رَّحْمَتِهِ وَيَجْعَل لَّكُمْ نُوراً تَمْشُونَ بِهِ** (اے ایمان والو اللہ سے تقویٰ اختیار کرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ تو تمہیں رحمت کے دو حصے عطا کئے جائیں گے اور ایسا نور عطا کیا جائے گا جس میں تم چلو گے پھرو گے۔)

تقویٰ اپنے ساتھ مشکلات سے نکلنے اور ایسی جگہ سے روزی عطا ہونے کا ذریعہ بنتی ہے، جہاں سے گمان بھی نہیں ہوتا کہ کیا اس طرح بھی روزی مل سکتی ہے۔ **وَمَن يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجاً وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ** ۔تقویٰ زندگی کے کاموں میں آسانی پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔ **ومن یتق اللہ یجعلہ لہ من امرہ یسریٰ** تقویٰ کے نتیجہ میں گناہوں کے دور ہونے اور اجر عظیم کا وعدہ ہے **ومن یتق اللہ یکفر عنہ سیاتہ ویعظم لہ اجرا** تقویٰ اللہ کی معیت کے حصول کا ذریعہ ہے، **ان اللہ مع المتقین** تقویٰ سے آسمان اور زمین کی برکتوں کے دروازے کھلنے کی خوش خبری سنائی گئی ہے۔ " **ولو ان اھل القریٰ امنو والتقوا لفتحنا علیھم برکاۃ السماء والارض** " تصوف وطریقت کا منتہائے مقصود ہی اعلیٰ درجہ کے تقویٰ کا حصول ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ کے ذریعہ حاصل ہونے والی نعمتیں اتنی عظیم ہیں کہ اس کے لئے جسم وجان کی ساری توانائیاں بھی خرچ کی جائیں تو سستا سودہ ہے۔

تقویٰ کے کچھ مزید ثمرات کو کچھ اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔

(۱) تقویٰ فرد کی انانیت اور حرص وہوس کے بتوں کو توڑ پھوڑ دیتی ہے۔

(۲) تقویٰ فرد کے سامنے قیامت اور حساب وکتاب اور اللہ سے ملاقات کے مناظر کو نظروں کے سامنے کردیتی ہے۔

(۳) تقویٰ فرد کو ہر نیکی پر عمل پیرا ہونے اور ہر منکر سے بچنے کی استعداد پیدا کر دیتی ہے۔

(۴) تقویٰ فرد کو اللہ کے سامنے آخری حد تک جھکا دیتی ہے اور اسے عجز وانکساری کا نمونہ بنا دیتی ہے۔

(۵) تقویٰ اللہ کی عظمت کے احساس کو غالب کر دیتی ہے۔

(۶) تقویٰ، فرد کے مزاج کو خوف وامید کے درمیاں رہنے کا عادی بنا دیتی ہے۔

(۷) تقویٰ فرد کو دنیا واہل دنیا سے بے نیاز کر کے، اپنی ساری توقعات اللہ سے وابستہ کرنے کا موجب بنتی ہے۔

(۸) تقویٰ فرد کو بندوں کے حوالے سے اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے اور انسانوں کے حقوق کی بہتر ادائیگی کی صلاحیت کا حامل بنا دیتی ہے۔

(۹) تقویٰ فرد کو اپنے سیاہ کار ہونے اور خود کو دوسروں سے حقیر سمجھنے کی نفسیات کو پختہ کر دیتی ہے۔

(۱۰) تقویٰ فرد کے سامنے آخرت کی زندگی کو کل کے مسئلہ کی بجائے آج کے مسئلہ کی حیثیت سے پیش کر کے غالب کرنے کا موجب بنتی ہے۔

(۱۱) تقویٰ فرد کو حساس، ذمہ دار، متحرک وفعال بنا دیتی ہے۔

(۱۲) تقویٰ فرد میں داخلی وخارجی باطل سے صف آرا ہونے کی استعداد پیدا کر دیتی ہے۔

ایسی تقویٰ جس میں یہ ساری سعادتیں حاصل ہوں وہ کیسے پیدا ہو؟

(۱) مسلسل خود احتسابی سے کام لیتے رہنے سے۔

(۲) اللہ کا کثرت سے ذکر کرتے رہنے سے۔

(۳) ضمیر کو بیدار کر کے، اس کے فتویٰ پر عمل کرنے سے۔

(۴) نیک اور صالح انسانوں کے ماحول میں رہنے اور صحبت کی اس زنجیر کو اپنے گلے کا طوق بنانے سے، یعنی صالح انسانوں سے کسی بھی صورت میں دور نہ ہونے اور دنیا پرست اور مادہ پرست انسانوں سے رشتہ منقطع کرنے سے۔

(۵) تلاوت قرآن کو مشغلہ بنانے سے۔

(۶) اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے۔

(۷) دوسروں تک خیر کی باتیں حکمت کے ساتھ پہنچاتے رہنے سے۔

(۸) اشاعت دین اور غلبہ دین کے لئے دامے درمے سخنے اپنے حصہ کا کردار ادا کرتے رہنے سے۔

(۹) اللہ کی غریب اور مظلوم مخلوق کی حالت زار پر رحم کھانے اور ان کی حتی الوسع مدد کرتے رہنے سے۔

(۱۰) اپنی ذات سے دوسروں کو اذیت نہ پہنچانے سے۔

(۱۱) مشکل سے مشکل حالات میں صبر وشکر سے کام لیتے رہنے سے۔

(۱۲) ذکر کو زندگی کا وظیفہ بناتے رہنے سے۔

(۱۳) کسی صاحب دل اور نفس مطمئنہ کی حامل شخصیت سے رشتہ مستحکم کرنے سے۔

تقویٰ ایک مرحلاتی عمل ہے، تقویٰ کا ابتدائی مرحلہ یہ ہے کہ فرد میں اس بات کی سچی طلب پیدا ہو جائے کہ برائیوں سے بچنے، معروف پر عمل کرنے اور اللہ سے ملاقات کے سلسلہ میں اس کی کمزور حس متحرک، فعال وبیدار ہو جائے اور خود احتسابی کا عمل شروع ہو جائے۔

تقویٰ کی راہ پر گامزن ہونے کے لئے باطنی حس کی بیداری اور خود احتسابی کا عمل پہلا مرحلہ ہے (یعنی تقویٰ کی راہ اختیار کرنے کی حقیقی طلب کا پیدا ہونا)۔

تقویٰ کا دوسرا مرحلہ زندگی کے ہر مرحلہ اور ہر موڑ پر نفس کی خوفناک قوتوں کا مقابلہ کر کے، انہیں اللہ ورسول کی اطاعت میں دینے کی جدوجہد کا مرحلہ ہے، اس مرحلہ میں فرد کو شدید مشکلات اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور صبر اور حوصلہ سے کام لینے کی شدید ضرورت درپیش رہتی ہے۔

سچی طلب کے بعد اگر نفس سے معرکہ آرائی کا یہ مرحلہ شروع ہو جائے تو معرکہ آرائی کی یہ صورت برسوں تک جاری رہتی ہے، طالب پر مسلسل یہ حالت رہتی ہے کہ وہ نفس، شیطان اور مادی ماحول کے اثرات سے گرتا ہے، پھر اٹھتا ہے، گرنے اور اٹھ کھڑے ہونے کا یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔

تقویٰ کا تیسرا اور آخری مرحلہ یہ ہے کہ فرد نفس مطمئنہ کے مقام پر فائز ہو جاتا ہے،

جہاں اللہ ورسول کی اطاعت اس کے لئے راحت کا ذریعہ بن جاتی ہے، نیز اللہ کی رضامندی اس کا مقصود حیات بن جاتی ہے۔

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ. (سورۃ آل عمران، آیت نمبر ۱۰۴)

(اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونا ضروری ہے جو خیر کی طرف بلایا کرے اور نیک کام کرنے کو کہا کرے اور بُرے کاموں سے روکا کرے اور ایسے لوگ پورے کامیاب ہیں)۔

دوسروں کو دعوت دینے والوں کا افضل ہونا

وہ حضرات جو نیکی کی طرف راستہ دکھلانے والے ہوں اور بُرائی سے روکنے والے ہوں، وہ ان لوگوں سے افضل ہیں، جو صرف اپنی عبادت وغیرہ میں لگے ہوئے ہیں۔

تشریح:

اپنی عبادت اور ذکر وفکر میں مشغولیت کا عمل سب سے بہتر عمل ہے، لیکن جب نفس کی قابل ذکر حد تک اصلاح ہوگئی تو اس کے بعد دوسروں کی اصلاح کے لئے فکرمندی اور اس کے لئے وقت نکالنا ضروری ہے۔ لیکن قابل ذکر حد تک اپنی اصلاح سے پہلے دوسروں کی اصلاح کی فکر کا غالب ہونا، افراد کو خطرے میں ڈالنے کی بات ہے، اس لئے کہ اپنی باطنی بیماریوں کی اصلاح کی فکر سے پہلے دوسروں کی اصلاح کی فکر سے ضد، بحث ومباحثہ، نفرت اور اشتعال وغیرہ سے بچنا بہت دشوار ہوتا ہے، اگر دعوتی کام کے حوالے سے یہ بیماریاں پیدا ہوں تو یہ بڑے المیہ کی بات ہے، اس دور میں مذہبی طبقوں کو اپنی اصلاح سے زیادہ دعوتی فکر اور غلبہ دین کی فکر لاحق ہے، اگرچہ یہ فکر ایک حد تک ضروری ہے، لیکن اپنے نفس کی اصلاح کی فکر سارے کاموں سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے، البتہ حالت بقا میں آنے والے داعی پر دوسروں کی فکر کا ہونا ناگزیر ہے۔

دعوتی کام کرنا اور بُرائی کی روک تھام کی کوششوں کے لئے بڑی حکمت اور بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے، حکمت وبصیرت کی یہ صلاحیت مبتدی ومتوسط طالب میں موجود نہیں

ہوتی، یہ دونوں اصلاح نفس کے مراحل سے گزر رہے ہوتے ہیں، جہاں آئے دن ان پر نفسی قوتوں کے حملے ہوتے رہتے ہیں اور وہ خواہشات کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام تو بہتر طور پر وہی افراد کر سکتے ہیں، جو نفسی قوتوں کو بڑی حد تک اللہ ورسول کے تابع کرکے، دوسروں کی اصلاح کے مقام پر فائز ہوں، اس طرح کے افراد سے مبتدی ومتوسط طالب اپنی صلاحیت کے تحت اس کام میں کچھ نہ کچھ تعاون کر سکتے ہیں، لیکن یہ کام حکمت وبصیرت سے کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔

معاشرے میں مذہبی طبقے میں پیدا ہونے والی خرابیوں کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اپنی قابل ذکر حد تک اصلاح سے پہلے یہ کام ہاتھ میں لیا جاتا ہے اور ذاتی اصلاح کے کام سے ہولناک غفلت برتی جاتی ہے۔ ظاہر ہے جب نفس مہذب نہ ہوگا، اس میں فساد موجود ہوگا، دعوتی کام کے وقت یہ فساد سامنے آئے بغیر نہ رہ سکے گا، اس طرح خود مذہبی طبقے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوں گے۔

اہل ارشاد وہ ہیں جو افراد معاشرہ کی اصلاح کا کام کرتے ہیں، وہ غیر اہل ارشاد سے افضل ہیں اور کامیابی کی خوشخبری انہی کے لئے ہے، یہ اہم نکتہ ہے جسے سمجھنا ضروری ہے۔

اہل علم اگر خود احتسابی کے ساتھ وعظ ونصیحت اور اصلاح وتلقین کا کام کریں تو یہ ایک حد تک ضروری ہے، لیکن اپنی اصلاح کے کام سے غافل نہ ہونا چاہئے۔ (مرتب)

وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا. (سورۃ آل عمران، آیت نمبر ۱۲۰)

(اور اگر تم استقلال واستقامت کے ساتھ رہو تو ان لوگوں کی تدبیر تم کو ذرا بھی نقصان نہیں پہنچا سکتی)۔

بندہ مومن کو پہنچنے والی مصیبت کی نوعیت

اس آیت اور سابقہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کو حقیقی تکلیف نہیں پہنچ سکتی، صورتاً تکلیف ہوتی ہے، جو مومن کے درجات کی بلندی کے لئے ہوتی ہے یا گناہوں کی

معافی کے لئے۔

تشریح:

بندہ مومن ہر حالت میں نفع میں ہوتا ہے۔ تکلیف کی صورت میں اللہ کی طرف اس کا رجوع بڑھتا ہے، اس میں عاجزی پیدا ہوتی ہے، وہ اللہ سے گڑگڑا کر مانگنے لگتا ہے۔ اس طرح یہ تکلیف ومصیبت اس کے لئے بظاہر مصیبت ہوتی ہے، لیکن بباطن اس کے درجات کی بلندی کا ذریعہ ہوتی ہے۔ تکلیف ومصیبت کے وقت بندہ مومن کا احساس پاکیزہ رہتا ہے، وقتی طور پر صدمہ کی صورت میں کچھ اثر ضرور ہوتا ہے، لیکن وہ اثر جلد ہی ختم ہو کر سکون وسکینت میں تبدیل ہوتا ہے، ہر طرح کے حالات میں صوفی کی سکون وسکینت اور خوشی وحلاوت کی زندگی ایسی ہے، جو قال سے نہیں، حال سے تعلق رکھتی ہے، صوفی اللہ کی طرف سے ہر طرح کے حالات میں صبر وشکر کی نفسیات کی پختگی عطا کرنے پر اللہ کی شکر ادائیگی کرتا رہتا ہے۔ البتہ متوسط صوفی اس طرح کے حالات میں بعض اوقات زیادہ بے چین ہو جاتا ہے۔ (مرتب)

إِذْ هَمَّت طَّآئِفَتَانِ مِنكُمْ أَن تَفْشَلاَ وَاللّهُ وَلِيُّهُمَا. (سورۃ آل عمران، آیت نمبر۱۲۲)

(جب تم میں سے دو جماعتوں نے خیال کیا کہ ہمت ہاریں تو اللہ تعالیٰ ان دونوں جماعتوں کا مددگار تھا)۔

وسوسوں کا ولایت کے منافی نہ ہونا

اس سے معلوم ہوا کہ ولایت اور گناہ کے بارے میں ذہنی کشاکش میں فرق نہیں ہے۔ کیونکہ ولی وہ ہوتا ہے، جو گناہ کا پختہ عزم نہیں کرتا، بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ بار بار خیال آیا، اس کو ترک کردیا۔ پھر اللہ اسے اس گناہ سے بچنے پر اس کی مدد فرمادیتے ہیں، پس باوجود ذہن میں گناہ کے آنے کے اس سے بچنا ہی ولایت ہے۔

تشریح:

ولی کے بارے میں یہ تصور صحیح نہیں ہے کہ گناہوں کے بارے میں انہیں وسوسے پیدا نہیں ہوتے، وسوسے پیدا ہوتے رہتے ہیں، لیکن ان وسوسوں کی شدت کا زور

ٹوٹ جاتا ہے اور وہ جلد ہی متنبہ ہوجاتا ہے اور تجدید ذکر سے وہ نئی ایمانی حلاوت محسوس کرنے لگتا ہے۔ وسوسے تو ایسی چیز ہے، جو آخر وقت آتے رہتے ہیں، وسوسے اگر ختم ہوجائیں اور نفس کی قوت بالکل فنا ہوجائے تو اس صورت میں دنیا کی امتحان والی حیثیت باقی نہیں رہتی، اور اللہ کی طرف ترقی کا عمل متاثر ہوتا ہے، اس لئے اہل اللہ کے وسوسے ایک اعتبار سے ان کی بلند پروازی کا ذریعہ ثابت ہوتے ہیں کہ اس سے وہ چوکنا ہوجاتے ہیں اور استغفار میں لگ جاتے ہیں۔ (مرتب)

وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ. (سورۃ آل عمران، آیت نمبر۱۳۴)

(اور غصہ کے ضبط کرنے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے، اور اللہ تعالیٰ ایسے نیکوکاروں کو محبوب رکھتا ہے)۔

طبعی امور کا کمال کے منافی نہ ہونا

انسان کے اندر جو طبعی حصہ ہے، وہ کمال کے اندر رکاوٹ نہیں بنتا، اگر وہ اس پر کنٹرول رکھے۔

تشریح:

انسان کے طبعی تقاضے کھانا، پینا، سونا اور جنسی تقاضے وغیرہ کی صورت میں ہیں۔ یہ تقاضے ایسے نہیں ہیں، جو فرد کے کمال کی راہ میں غیر معمولی طور پر حائل ہوں۔ لیکن یہ طبعی تقاضے اگر شدت اختیار کر جائیں اور فرد ان تقاضوں کی آخری حد تک تکمیل کی راہ پر گامزن ہو تو اس صورت میں فرد حالت خطرہ میں مبتلا ہوجاتا ہے، نفس چاہتا ہے کہ محض کھانے پر اکتفا نہ ہو، بلکہ بہتر سے بہتر کھانا ہو، صبح وشام طرح طرح کے طعام ہوں، نفس کی چاہت ہوتی ہے کہ بہتر سے بہتر مکان اور سواری ہو، جنسی تقاضوں کے سلسلہ میں بھی وہ فرد کو حد اعتدال پر قائم رہنے نہیں دیتا، طبعی تقاضوں پر جب نفسی قوتیں غالب آنے لگتی ہیں تو ان کی اصلاح دشوار ہوجاتی ہے لیکن اگر ان طبعی تقاضوں میں اعتدال قائم ہو، سادہ کھانا، سادہ رہائش، سادہ طرز زندگی وغیرہ اور ساتھ ساتھ ذکر وفکر بھی تو فرد دینی وروحانی اعتبار سے کمال کی راہ پر گامزن ہوسکتا ہے۔ (مرتب)

وَالَّذِيْنَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَن يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا. (سورۃ آل عمران، آیت نمبر ۱۳۵)

(اور ایسے لوگ کہ جب کوئی کام کر گزرتے ہیں جن میں زیادتی ہو یا اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں پھر اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا اور کون ہے جو گناہوں کو بخشتا ہے)۔

صاحب احسان سے گناہ کا سرزد
ہونا خطرے کی بات نہیں

جب گناہ ہوجائے اور فرد توبہ کرے تو یہ اس کے محسن ہونے کے خلاف نہیں، محسن کے دو معنی ہیں، ایک دوسروں کو فائدہ پہنچانا، دوسرے عمل میں خیال رہے کہ اللہ مجھے دیکھ رہے ہیں، ان کے ہوتے ہوئے کبھی کبھی گناہ صادر ہوجائے اور اس سے توبہ کر لے تو یہ اس کے درجہ میں کمی کا سبب نہ ہوں گے۔

تشریح:

گناہ کا ہونا بشری تقاضا ہے، لیکن گناہوں میں غرق ہونا، یہ علامت ہے اس بات کی کہ فرد پر نفسی قوتیں غالب ہیں۔ لیکن اہل اللہ جو غیر معمولی مجاہدوں کے ذریعہ احسان کے مقام پر فائز ہوتے ہیں، ان سے کبھی کبھار گناہ صادر ہوجائیں تو یہ احسان کے مقام کے منافی نہیں۔ توبہ واستغفار سے گناہ معاف ہو کر فرد کے درجات پھر بلند ہوجاتے ہیں، اللہ رحیم وکریم ذات ہے، وہ کبھی کبھار کے گناہ معاف کر کے، ان کے درجات بلند کر دیتا ہے۔ بندوں کے ساتھ اللہ کی یہی تو وہ ادا ہے، جو اس کی شان کریمی کی علامت ہے۔ (مرتب)

وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ. (سورۃ آل عمران، آیت نمبر ۱۵۴)

(اور یہ جو کچھ ہوا اس لئے ہوا تاکہ تمہارے باطن کی حالت کی آزمائش کرے اور تاکہ تمہارے دلوں کی حالت کو صاف کرے)۔

تکلیف کے فوائد وثمرات

بلاء جب کسی مسلمان پر آتی ہے تو اس سے اس کے اخلاص وتوکل وغیرہ کا امتحان مقصود ہوتا ہے اور دل کا میل کچیل صاف ہوجاتا ہے، کیونکہ یہ مصیبت کا خاصہ ہے۔

تشریح:

بلاء سے یہ دیکھنا مقصود ہوتا ہے کہ بندہ مؤمن کی اخلاص اور تعلق مع اللہ کی حالت کیا ہے۔ بندہ مؤمن اکثر اس طرح کے مواقع پر صبر وشکر کا مظاہرہ کرتا ہے، اگر اس سے گناہ ہو بھی جاتا ہے تو وہ رجوع کرتا ہے، اس طرح اللہ اسے معاف کر دیتا ہے، اس طرح یہ تکلیف ومصیبت اس کے دل کے میل کچیل کی مزید صفائی کا ذریعہ بن جاتی ہے، لیکن مصائب کے وقت صبر وشکر اور اللہ کی رضا پر راضی رہنے کی حالت خوش نصیب افراد ہی کو حاصل ہوتی ہے، یہ نعمت ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی۔ بندہ مومن جس نے اللہ سے اپنے تعلق کو مستحکم کیا ہوتا ہے، یہ سعادت اسے ہی حاصل ہوتی ہے۔ (مرتب)

إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ. (سورۃ آل عمران آیت ۱۵۵)

(اس کے سوا اور کوئی بات نہیں ہوئی کہ ان کو شیطان نے لغزش دے دی، ان کے بعض اعمال کے سبب سے، اور یقین سمجھو کہ اللہ نے ان کو معاف کر دیا)۔

گناہوں سے قلب میں ظلمت کا پیدا ہونا

اس کی وجہ یہ ہے کہ گناہوں سے ظلمت پیدا ہوتی ہے اور فرد پر شیطان کا قابو اسی وقت ہوتا ہے، جب وہ قلب میں ظلمت پاتا ہے۔ روح المعانی میں زجاج سے نقل کیا ہے کہ شیطان نے ان کو بعض وہ گناہ یاد دلائے، جن کو لے کر اللہ تعالیٰ سے ملنا ان کو خوش معلوم نہ ہوا، اس لئے وہ جہاد سے ہٹ گئے، تاکہ وہ اپنی حالت کی درستگی کر کے پسندیدہ حالت پر جہاد کریں اور اللہ تعالیٰ سے ملیں۔ احقر کہتا ہے کہ زجاج کی اس تفسیر پر آیت اصل ہے، اس مقولہ کی جو شیخ اکبرؒ سے مشہور ہے کہ کامل توبہ کے بعد گناہوں کو یاد کرنا

مناسب نہیں، اس لئے کہ وہ بندے کے اور اللہ کے درمیان حجاب ہوجاتے ہیں۔

تشریح:

اس آیت اور حواشی سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ گناہوں سے قلب میں کدورت اور ظلمات پیدا ہوتی ہے، جس سے اعمال میں مشکلات پیدا ہوتی ہے اور شیطانی وسوسے غالب ہونا شروع ہوجاتے ہیں، اس لئے گناہوں سے ہر ممکن حد تک بچنے کے لئے کوشاں ہونا ضروری ہے، گناہ چھوٹا ہو یا بڑا، ہر گناہ اپنے ساتھ سیاہ کاری کے اثرات لاتا ہے، اس سے قلب میں اعمال صالحہ کی توفیق متاثر ہوتی ہے اور شیطان کو کام کرنے کا موقعہ ملتا ہے۔

دوسری بات جو معلوم ہوئی، وہ یہ ہے کہ ایک بار گناہوں پر کامل توبہ کرنے کے بعد ان گناہوں کو یاد کرنا اور ان گناہوں کو بہت بڑا سمجھکر ان کے معاف نہ ہونے کے تصور کا غالب ہونا، یہ شیطان کا بڑا فریب ہے، اس سے شیطان فرد کو اپنے گناہوں کی معافی کے معاملہ میں متذبذب کرکے، انہیں نیکی کے کاموں سے روکنا چاہتا ہے اور نفس بھی اپنا کردار ادا کرنے لگتا ہے کہ وہ نیکی کی راہ پر حوصلہ سے چلنے میں رکاوٹ ڈالتا ہے، اس طرح گناہوں کی عدم معافی کا احساس اور انہیں شدت سے یاد کرنا،فرد کو اللہ سے دور کرنے اور اللہ اور بندے کے درمیان حجاب پیدا کرنے کا موجب بن جاتا ہے، اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ توبہ کرنے سے بڑے سے بڑے گناہ معاف کردیتا ہے۔**قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَى أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا.** (میرے ان بندوں سے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، ان سے کہدو کہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ بیشک اللہ سارے کے سارے گناہ معاف کردے گا)۔

اپنے گناہگار بندوں پر اللہ کا یہ سب سے بڑا انعام ہے کہ کامل توبہ سے سارے کے سارے گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں۔ (مرتب)

فَمَن زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ. (سورۃ آل عمران، آیت نمبر۱۸۵)

(پس جو شخص دوزخ سے بچالیا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا سو وہ پورا کامیاب

ہوا)۔

جنت ودوزخ سے بے نیازی کی روش کا غلط ہونا

اللہ تعالٰی کا اس شخص کو کامیاب قرار دینا، اس شخص کے غلط ہونے پر دلیل ہے جو جنت ودوزخ سے بے نیاز ہونے کا دعوٰی کرے، البتہ مغلوب الحال فرد معذور سمجھا جائے گا۔

تشریح:

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ سے بچاؤ اور جنت میں داخلہ سب سے بڑی کامیابی ہے اور جنت دین کے مقاصد میں شامل ہے کہ ہر بندہ مؤمن کی ساری کاوشوں کا حاصل جنت کا حصول ہے۔

تصوف کے نام پر جو صوفی جنت سے بے نیازی ظاہر کرتے ہیں، ان کا طرز عمل اسلامی تعلیمات کے منافی ہے، اللہ کا دیدار جنت میں ہوگا تو ایک اعتبار سے جنت مقاصد میں شمار ہوگی اور دوزخ سے بچنے کی کاوشوں کا ہونا بھی مقصود میں شامل ہے۔

اس دور میں دین کی تشریح کچھ اس طرح ہوئی ہے کہ جنت میں داخلہ اور دوزخ سے بچاؤ کی کوششوں کا کام دین کے مقاصد میں شامل نہیں رہا، بلکہ دین کا اصل نصب العین دنیا میں دین کے غلبہ کا کام بن کر رہ گیا ہے، جس کی وجہ سے فکر آخرت کا کام ثانوی حیثیت اختیار کرگیا ہے اور تزکیہ واصلاح نفس کا کام جو جنت میں داخلہ کا ذریعہ ہے، اس کی حیثیت بھی مجروح ہوئی ہے، بلکہ دنیا میں اسلام کے غلبہ کا کام یا دوسروں تک دین کو پہچانے کا کام ہی دین کا مقصد بن گیا ہے۔

دین کے نصب العینی کام کی اس تبدیلی کی وجہ سے افراد کے اخلاق، کردار وسیرت کا کام بُری طرح متاثر ہوگیا ہے اور معاشرہ کردار کے بحران سے دوچار ہوگیا ہے۔ حکومت کی اصلاح کی فکر اور دوسروں کی اصلاح کی فکر ایسی غالب ہوگئی ہے کہ فرد اپنی اصلاح کے کام کو بھول گیا ہے۔

نظر جاتی ہے کہاں تک نہیں جاتی
مگر اپنی حقیقت پہچانی نہیں جاتی

افراد کی عمومی طور پر یہی حالت ہوگئی ہے اگر اپنی کھال بچانے اور آخرت میں رسوائی سے حفاظت کا کام مقصود کی حیثیت سے سامنے ہوتا تو ایسا ہرگز نہ ہوتا۔ (مرتب)

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَا أَتَوا وَّيُحِبُّوْنَ أَنْ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ. (سورۃ آل عمران، آیت نمبر ۱۸۸)

(وہ لوگ جو اپنے کردار پر خوش ہوتے ہیں اور جو کام نہیں کیا اس پر چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف ہو، سو ایسے لوگوں کے بارے میں یہ خیال ہرگز نہ کرو کہ وہ خاص طور کے عذاب سے بچاؤ میں رہیں گے اور ان کو دردناک عذاب ہوگا)۔

اپنی مدح کرانا قابل مذمت ہے

اس آیت میں ان صوفیاء کی بھی مذمت ثابت ہوتی ہے، جو اپنی مدح کرواتے ہیں، حالانکہ وہ کمالات ان کے اندر نہیں ہوتے۔ کمالات ہوں پھر بھی مدح بری ہے تو اگر کمالات نہ ہوں تو یہ تو زیادہ بری ہے۔

تشریح:

بعض صوفیائے خام کے یہاں منقبت کے نام پر اپنی مدح کا خصوصی اہتمام ہوتا ہے، اس حد تک کہ اللہ کی صفات کو بزرگ کی صفات میں شامل کردیتے ہیں۔ ایسے صوفیائے خام نے اپنے نظام کو فنا فی الشیخ کے تصور پر استوار کیا ہوا ہوتا ہے۔ ان کا تصور یہ ہوتا ہے کہ جب طالبوں میں فنا فی الشیخ کا تصور مستحکم ہوجائے گا تو طالبوں کا کام ازخود بن جائے گا اور انہیں زیادہ مجاہدوں کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ اول تو یہ حکمت عملی غلط ہے، اس لئے کہ فنا فی الشیخ کے اس طرح کے تصور کے ذریعہ طالبوں کا بزرگ کے فیض نظر پر انحصار بڑھ جاتا ہے، وہ مجاہدوں کے لئے کم ہی تیار ہوتے ہیں۔

دوم یہ کہ اس کام کے لئے اللہ کی صفات کو بزرگ کی شخصیت میں شمار کرنا اور اس کے لئے منقبتیں تیار کرنا آخر اس کا جواز ہی کیا ہے؟

یہ راستہ تو عقائد کے فساد کا راستہ ہے، عقائد کے فساد کے بعد اصلاح کی کیا حیثیت باقی رہتی ہے۔ راہ محبت وراہ سلوک تو طالب کو یہ سکھاتی ہے کہ اپنے وجود کو مٹادو، اپنی شخصیت کو فنا کردو، نام ونمود کے جذبات کو پامال کردو، شہرت کے احساسات کو ابھرنے

نہ دو، گمنامی کی زندگی اختیار کرو، اپنے دینی ودعوتی کاموں کو ہیچ سمجھو، دل وذہن میں آنے والے داد وتحسین کے خیالات کو جھٹک دو۔

جب سالک مجاہدوں کے ذریعہ اس مقام تک رسائی حاصل کرلیتا ہے تو اسے نوازا جاتا ہے، لوگوں کو اس کی طرف رجوع کردیا جاتا ہے، جب کہ شہرت وداد طلبی کی مصنوعی کوششیں فرد کو گرانے کا سبب بنتی ہیں اور اللہ کی نظر میں اس کی حیثیت کو گرادیتی ہیں۔

نیک کام تو نیک کام ہی ہوتے ہیں، لیکن جب یہ کام اللہ کی رضا کی بجائے شہرت وداد طلبی کی خاطر کئے جائیں تو محض نیت کے فساد کی وجہ سے فرد کے لئے جہنم کا ذریعہ بن جاتے ہیں، اس لئے نیت کی درستی اور اخلاص کا کام فیصلہ کن حیثیت اختیار کرلیتا ہے، اور اس مقصد کے لئے جتنے بھی مجاہدے کئے جائیں، کم ہیں۔

داد طلبی کی بیماری ایسی ہے، جو لگ بھگ ہر با صلاحیت اور ذہین فرد کے مزاج کا حصہ ہے، اپنے کردہ وناکردہ کاموں کی داد کی امید رکھنا اور دوست احباب سے داد نہ ملنے پر ناراضگی کے احساس کا غالب ہونا، یہ افراد کی عمومی روش ہے، یہ بیماری دراصل بڑے پن کے پوشیدہ جذبات کا حصہ ہے، اس کے ذریعہ فرد اپنی افضلیت کے احساسات کی تسکین چاہتا ہے۔

داد طلبی کی بیماری دراصل مفت میں اپنے اعمال کو غارت کرنے کا ذریعہ ہے۔

داد طلبی، جذبہ شہرت اور ریا جیسی بیماری کی ہلاکت خیزی کا اندازہ بعض احادیث سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔

ایک حدیث شریف میں فرمایا کیا گیا ہے کہ جس شخص نے علم اس لئے حاصل کیا کہ اس کے ذریعہ دوسروں پر علمی برتری حاصل کرے تو ایسے فرد کو جہنم میں جانے کے لئے تیار ہونا چاہئے۔

دوسری مشہور حدیث شریف ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قیامت کے دن ایک شہید، ایک عالم اور ایک مخیرّ آئے گا۔

اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیں گے انہیں جہنم میں داخل کرو، وہ عرض کریں گے یااللہ ہم نے تیرے لئے جان قربان کردی، تیری خاطر اپنی دولت خرچ کی، تیرے لئے علم دین کو پھیلایا، اللہ تعالیٰ ان تینوں کو فرمائے گا کہ تم جھوٹ بولتے ہو اور تم نے یہ سب کچھ دنیا

میں شہرت کے حصول کے لئے کیا، وہ شہرت تمہیں دنیا میں مل گئی، یہاں تو اس کی یہی سزا ہے۔

تیسری حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا، مجھے تمہارے بارے میں شرک اکبر (یعنی بتوں کی پرستش) کا خوف نہیں، بلکہ مجھے شرک اصغر کا خوف ہے، صحابہ کرام نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ شرک اصغر کیا ہے، آپ نے فرمایا ریا (یعنی دکھاوے کے لئے نیک کام کرنا)۔

جذبہ شہرت، ریا اور دادطلبی کے مقابلہ میں اخلاص وللھیت آتی ہے، جسے دین میں مطلوب کا درجہ حاصل ہے۔ اخلاص وللھیت کامل طور پر اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتی، جب تک فرد اپنی شخصیت میں موجود بت کدے کو پوری طرح منہدم نہیں کرتا۔ اس بت خانے کی ٹوٹ پھوٹ کے بغیر مطلوبہ درجہ تک اخلاص وللھیت پیدا نہیں ہوسکتی۔

دادطلبی کی کئی صورتیں ہیں۔ جسے اس کا مریض خود سمجھتا ہے، لیکن بے لاگ خواہشات کے سامنے وہ بے بس ہے، اس کی متعدد صورتیں ہیں، جن میں سے کچھ صورتیں درج ذیل ہیں۔

. علمی صلاحیت اس لئے حاصل کی جائے، تاکہ اسے معاشرے میں صاحب علم وفضل شخصیت کہا جاسکے۔

. سماجی خدمت کا کام اس لئے کیا جائے، تاکہ اسے اس اعتبار سے شہرت حاصل ہو۔

. خیر وخیرات اس لئے کی جائے اور مال اس لئے خرچ کیا جائے، تاکہ اسے مخیّر کہا جاسکے۔

. جہاد اس لئے کیا جائے، تاکہ اسے مجاہد کہا جاسکے۔

. دین کے نام پر تقاریر وبیانات اس لئے جاری کئے جائیں، تاکہ اخبارات میں اس کے بیانات اور تصاویر شایع ہوں اور معاشرے میں اس کی پبلسٹی ہو اور اس کے دادوتحسین کے جذبات کی تسکین ہو۔

. اپنی کتاب کی تقریب رونمائی اس لئے کی جائے، تاکہ اسے بڑے صاحب تصنیف ہونے کی داد مل سکے۔

. بزرگ اس لئے بنا جائے، تاکہ معاشرے میں بزرگ کی حیثیت سے اسے شہرت حاصل ہو اور، لوگوں کا اس کی طرف رجوع ہو۔ وغیرہ وغیرہ

قرآن کی مذکورہ آیت میں دادطلبی اور شہرت کی اس طرح کی ساری صورتوں کا احاطہ کیا گیا ہے اللہ ہمیں خود ثنائی اور دادطلبی کی بیماری سے بچالے۔ آمین (مرتب)

یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُواْ اصْبِرُواْ وَصَابِرُواْ وَرَابِطُواْ وَاتَّقُواْ اللّهَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُونَ. (سورۃ آل عمران، آیت نمبر ۲۰۰)

(اے ایمان والو، خود صبر (سے کام) لو اور مقابلہ میں صبر کرو اور مقابلہ کے لئے مستعد رہو (یعنی لگے رہو) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پورے کامیاب ہو)۔

جہاد نفس کی اصل

رباط کی تفسیر مرابطہ ثغر (سرحدوں پر پہرہ دینا) سے ظاہر ہے، حدیث میں تکمیل وضو اور انتظار جماعت کو رباط فرمایا گیا ہے، جو کہ مجاہدہ نفس ہے، پس مجموعہ آیت وحدیث سے جہاد نفس کا بھی جہاد ہونا ثابت ہوا۔

تشریح:

نفس چونکہ بڑی طاقت ہے، دین میں سارا فساد اسی کی وجہ سے برپا ہے، عزازیل کو شیطان بنانے میں اصل کردار نفس ہی کا تھا، اس لئے نفس کے خلاف مجاہدوں کے سلسلہ میں اس آیت میں تاکید در تاکید فرمائی گئی ہے، انسان کی ساری انسانیت نفس کو مہذب بنانے اور اسے سنوارنے سے وابستہ ہے، یہ نفس آسانی سے سنور نہیں سکتا، اس کے لئے اس کے خلاف عرصہ تک معرکہ آرائی کرنی پڑتی ہے، اس مقابلہ میں ہی بندہ مؤمن کی شجاعت اور بہادری کے جوہر اجاگر ہوتے ہیں، جب وہ نفس کے خلاف مجاہدے میں بڑی حد تک کامیاب ہوتا ہے اور نفس کی قوت قابل ذکر حد تک مطیع ہوجاتی ہے تو تقویٰ پیدا ہوجاتا ہے، بلکہ تقویٰ کا مزاج راسخ ہونے لگتا ہے، اسی تقویٰ پر فرد کی کامیابی ونجات کا دارو مدار ہے، جس کا اس آیت میں ذکر فرمایا گیا ہے۔

ہر دور میں انبیاء کرام کی مخالفت اور اولیائے کرام سے انحراف کی روش کا بنیادی سبب نفسی خواہشات ہی رہی ہیں، نفس کی چاہت یہ ہے کہ وہ دنیا پر فدا ہو، راحت ولذت

کے سامان سے سکون حاصل کرے، دولت کے ڈھیر جمع کرے، دوسروں کے حقوق پامال کرے۔ انسانوں کی بہت بڑی اکثریت ہر دور میں نفس کی اکساہٹ کی وجہ سے مادیت پر ٹوٹ پڑتی رہی ہے۔

موجودہ دور کی تو حالت یہ ہے کہ فرد وافراد کے پاس دوسرے کاموں کے لئے تو وقت موجود ہے، لیکن اصلاح نفس کے لئے نہ تو وقت موجود ہے اور نہ ہی اس کی فکرمندی، دیندار لوگوں کی بھی عام طور پر جو حالت ہے، وہ یہ ہے کہ وہ زندگی بھر رسمی دینداری پر اکتفا کرتے ہیں، نفس کے خلاف مجاہدوں کے سلسلہ میں وہ بھی تیار نہیں، بہت کم افراد ہیں جو اصلاح نفس، تہذیب نفس اور ضبط نفس کے کام کو کام سمجھتے ہوں، یہ آیت نفس کے خلاف مجاہدوں در مجاہدوں کے سلسلہ میں واضح آیت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب تک فرد کے دل پر نفسی قوتوں کی گرفت مضبوط ہے، اس وقت تک دل میں اللہ نہیں سما سکتا اور تب تک دل نفسی قوتوں کے زیر اثر زیر وزبر ہوتا رہے گا۔

نفس کے خلاف مجاہدے اس لئے بھی ضروری ہیں، تاکہ فرد میں انسانی جوہر اجاگر ہوسکیں، اور اللہ سے محبت کے غلبہ کے زیر اثر وہ اللہ کے بندوں سے بے غرضانہ محبت کا مظاہرہ کرسکے۔

نفس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی ہی الوہیت چاہتا ہے، وہ اپنی الوہیت سے کسی صورت میں دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں، نفس کی ساری جدوجہد کا مرکز اس کے ذاتی مفادات ہوتے ہیں، ایک فرد کروڑپتی ہے، اس کے بھائی اور دوسرے عزیز بھوکوں مر رہے ہوتے ہیں، یہ کروڑپتی بھائی اپنے غریب بھائیوں کی ذرہ بھر مدد کرنے کے لئے تیار نہیں، اس طرح کے مشاہدے آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔

اللہ نے انسانی نفس کی ساخت میں شیطانی قوتیں رکھی ہیں، اور ان قوتوں کو اللہ ورسول کے تابع کرنے سے اس کی نجات کو وابستہ کردیا ہے۔

نفس کے خلاف ساری جنگ اللہ کے ذکر پر مداومت (مستقل مزاجی سے گامزن ہونے) سے ہی لڑی جاسکتی ہے، اللہ کا یہ ذکر فرد کی شخصیت میں اللہ کے ساتھ والہانہ محبت کے جذبات کو ابھارتا اور طاقتور بناتا ہے، اس والہانہ محبت کے نتیجہ میں ہی فطرت سلیمہ

بیدار ہوتی ہے اور نفسی اور جبلی قوتوں پر روحانی وملکوتی قوتوں کو غلبہ عطا ہوتا ہے۔

اگر فرد، نفس کے خلاف معرکہ آرائی کے لئے تیار نہیں تو اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا میں جس مقصد کے لئے بھیجا گیا ہے کہ اللہ کی عبادت ومعرفت کے ذریعہ نفسی قوتوں کو مکمل طور پر اللہ ورسول کے تابع بنائے، اس مقصد میں وہ ناکامی کا ثبوت دیتا ہے، یہ ناکامی ایسی ہے، جو دنیا میں بھی اس کے سکون کو غارت کرنے کا ذریعہ بنتی ہے تو آخرت کی رسوائی تو بہت ہی اذیتناک ہوگی۔

انسان کو ہولناک نفسی قوت دے کر اسے دراصل بہت بڑی آزمائش میں ڈالا گیا ہے، اس آزمائش سے ذکر میں ہمت، حوصلہ، استقامت، اور اہل اللہ کی صحبتِ مسلسل کے ذریعہ ہی وہ کامیاب ہوسکتا ہے، اگرچہ اس کی دوسری صورتیں بھی موجود ہیں، لیکن وہ صورتیں ایسی ہیں، جس میں فریب نفس کے بہت سارے خطرات موجود ہیں۔

نفس کی خصوصیت جہنم کے انگاروں سے مشابہت رکھتی ہے، اس لئے کہ نفس سے صادر ہونے والے اللہ کی سرکشی پر مشتمل اعمال اپنے ساتھ اللہ کے جلال کو لاتے ہیں، جس سے دل اور پوری انسانی شخصیت انگاروں پر لیٹنے کے مترادف ہوجاتی ہے، اس کا سکون غارت ہوجاتا ہے، وہ شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہوجاتا ہے، اور خودکشی تک نوبت آنے لگتی ہے، یہ گویا ایک طرح سے فرد کے لئے جہنم کے انگاروں سے مشابہت والی حالت ہوجاتی ہے، ایک تو گناہ کبیرہ، وہ چاہے ظاہری ہوں، یا باطنی، ہر طرح کے گناہ اپنے ساتھ اللہ کے جلال کو لاتے ہیں، دوسرے یہ کہ اللہ کے ذکر سے غفلت بھی فرد پر نفسی قوتوں کو غالب کرنے کا موجب بنتی ہے، نفسی قوتوں کا یہ غلبہ جو ذکر سے غفلت کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے، یہ نفس میں تلاطم پیدا کردیتا ہے، اس پر حیوانی وجبلی قوتوں کو غالب کردیتی ہے، جس سے فرد حیوانی صفات کا حامل ہوجاتا ہے، غیظ وغضب، اور ایک دوسرے کو مرنے مارنے کی کوششیں دوسروں پر بالادستی کی کاوشیں وغیرہ ان صفات کا غلبہ بھی آخرت کی دنیا سے پہلے اس دنیا میں بھی فرد وافراد کے لئے عذاب کا موجب ثابت ہوتا ہے۔

ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا دینی تعلیم کے ماحول میں تزکیہ اور اصلاح نفس کا کام نہیں ہوسکتا؟ یہ سوال انتہائی اہم بھی ہے تو نازک بھی۔

ہماری نظر میں اگر دینی تعلیم کے ماحول میں تربیت وتزکیہ، خوداحتسابی، محبت

ومعرفت اورتقویٰ کا پورا اہتمام موجود ہوتو اس طرح کے دینی تعلیم کے ماحول میں اصلاح نفس کی صورت پیدا ہوسکتی ہے اور اس سے معاشرے کو ایسے دینی عالم فراہم ہو سکتے ہیں، جو ذاتی اغراض، مفادات اور مسلکی تعصبات سے بلند ہوکر، افراد معاشرہ کی صحیح اسلامی خطوط پر تعلیم وتربیت کرسکیں، لیکن اگر دینی تعلیم کے ماحول میں پاکیزہ تربیت، خود احتسابی، تقویٰ اور اللہ کی محبت کا ماحول موجود نہ ہوتو تہذیب نفس کا معرکہ سرانجام نہیں ہوسکتا، اس طرح کی علمی شخصیتوں کا حب جاہ وحب مال، جذبہ شہرت، حرص وہوس اور جلن جیسی باطنی بیماریوں سے بچنا محال ہے۔

علم نافع، معرفت نفس اور معرفت رب کے ذریعہ ہی حاصل ہوتا ہے، معرفت نفس سے باطن کی وسیع دنیا میں موجود خوفناک درندوں کا ادراک وشعور حاصل ہوتا ہے، اور نفس میں موجود بہت بڑے بت کدے کا مشاہدہ ہوتا ہے، اور معرفت رب سے اللہ کی شان عظمت کا غلبہ ہونے لگتا ہے، اللہ کی یہی شانِ عظمت فرد کے نفس کی تہذیب اور اس کے تزکیہ کا باعث بنتی ہے، اس کے بعد ہی علم پر عمل کرنے کی استعداد پیدا ہوتی ہے اور ظاہری گناہ جو باطنی گناہوں کا ذریعہ ہوتے ہیں، ان سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے، عالم جب تک معرفت نفس اور معرفت رب کے مراحل کسی حد تک طے نہیں کرتا، اس وقت تک اس پر حسد، جلن، ضد، انانیت، منصب، حب مال اور حرص وہوس کے جذبات واحساسات کی اصلیت اور اس کی حقیقت کھل کر، اسے اوصاف حمیدہ کا حامل بنا سکے، انتہائی محالا امر ہے، اس لئے زندگی بھر محض علم پر اکتفا کرنا، اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف ہے اور نفس کی باطنی بُرائیوں کو غالب کرنے کے مترادف بھی۔

ہم آئے دن اخبارات میں اس طرح کے واقعات پڑھتے رہتے ہیں کہ ایک وزیر صاحب جو اپنے قبیلہ کے سردار بھی تھے، اس نے اپنی بیوی کے مزاج کے خلاف روش سے مشتعل ہوکر، اسے گولی مار کر قتل کردیا، اس کے بعد اس نے خود بھی گولی سے اپنے آپ کو مار دیا، یا یہ واقعہ کہ ایک بزرگ جو وصال فرما چکے ہیں، ان کے بڑے صاحبزادے نے زمین کے تنازعہ پر اپنے دو چھوٹے بھائیوں کو قتل کردیا۔ یا یہ واقعہ کہ ایک معلم نے بچہ سے جنسی زیادتی کرکے، اسے قتل کردیا اور کورٹ نے اس معلم کو پھانسی کی سزا سنادی، دراصل اس طرح کی واردات یا اس طرح کے جذبات واحساسات ایک دو فیصد افراد کی کہانی نہیں

ہے، بلکہ یہ لگ بھگ ہر فرد کے نفس کی کہانی ہے۔

مولانا رومی کے بقول ہر فرد فرعون بننے کی صلاحیت رکھتا ہے، مگر اختیارات ووسائل نہ ہونے کی وجہ سے وہ دعویٰ کرنے سے قاصر ہے۔

جب تک ہمارے تعلیمی نظام میں نفسی قوتوں کے ادراک اور اس کی تہذیب کے عمل کو نصاب کا مستقل حصہ نہیں بنایا جاتا، تب تک اس طرح کے واقعات ووارادات اور احساسات وجذبات سے بچاؤ کی صورتیں پیدا ہونا مسدود ہیں، یہی وہ کام ہے جسے قرآن کی اس آیت کی تشریح میں حکیم الامت نے نفس کے خلاف مجاہدے کی اصل قرار دیا ہے۔

کتنے بڑے المیہ کی بات ہے کہ ہماری ملت شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہو رہی ہے، خودکشیوں اور جنسی تشدد کی واردات میں خوفناک حد تک اضافہ ہو رہا ہے، نفس کی اکساہٹ پر سارے طبقات دولت ودنیا کے ڈھیر جمع کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو کر، ملت کی تباہی کا باعث بن رہے ہیں، اس صورتحال کے باوجود ہمارے نظام تعلیم کے ذمہ دارتس سے مس نہیں ہو رہے ہیں اور ان کے یہاں نظام تعلیم میں علوم وفنون کو تو فیصلہ کن اہمیت حاصل ہے، لیکن نفس کی خوفناک حیوانی وجبلی قوتوں کو مطیع کرنے کے لئے ذکر وفکر کے مجاہدوں کے تربیتی عمل کو وہ کسی طور پر بھی نظام تعلیم کا حصہ بنانے کے لئے تیار نہیں۔

ہماری نظر میں دینی تعلیم مجاہدے کی ایک صورت ہے، جو نامکمل صورت ہے، مجاہدے کی اصل اور تکمیلی صورت اللہ کی محبت ومعرفت، تقویٰ، خشیت وغیرہ ہے، جو ذکر وفکر کے مجاہدوں کے ذریعہ نفسی قوتوں کی پامالی کے بعد ہی پیدا ہوسکتی ہیں اور مستحکم بھی۔

موجودہ دور میں اس طرح کے مجاہدے نہ ہونے کی وجہ سے دینی طبقات نہ صرف یہ کہ معاشرے پر بہتر طور پر اثرانداز نہیں ہو رہے ہیں، بلکہ وہ خود بھی مادی نوعیت کے احساسات اور تعصّبات کا شکار ہو رہے ہیں۔

وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُواْ مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافاً خَافُواْ عَلَيْهِمْ. (سورۃ النساء، آیت نمبر ۹)

(اور ایسے لوگوں کو ڈرنا چاہئے کہ اگر اپنے پیچھے چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ جائیں تو ان کی ان کو فکر ہو)۔

اخلاق کے ایک بڑے قانون کی تلقین

اس آیت سے اخلاق کے ایک بڑے قانون کا پتہ لگتا ہے کہ فرد اپنے لئے جو پسند کرتا ہے، وہی دوسرے کے لئے پسند کرے اور اپنے لئے جو ناپسند کرتا ہے، وہی دوسرے کے لئے ناپسند کرے، جیسے فرد کی خواہش ہوتی ہے کہ میرے مرنے کے بعد میری اولاد سے بُرا سلوک نہ ہو تو اس کو چاہئے کہ کسی کی اولاد کے ساتھ بُرا سلوک نہ کرے اور نہ چاہئے۔ (یہ حاشیہ حافظ فضل الرحیم صاحب کی تسہیل سے ماخوذ ہے)

تشریح:

یہ ایمان کی بڑی علامت ہے کہ فرد جو کچھ اپنے لئے پسند کرے، وہی کچھ اپنے دوسرے بھائی کے لئے بھی پسند فرمائے، اس لئے ایک حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ کی قسم، تم کامل مومن نہیں ہو سکتے، جب تک کہ اپنے لئے جو کچھ پسند کرو، وہی کچھ اپنے دوسرے بھائی کے لئے پسند نہ کرو۔

کامل ایمان کی اس حالت کو دیکھکر جب ہم اپنی اور اپنے معاشرے کی حالت کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس اعتبار سے تو ہماری حالت ناقص سے ناقص تر ہے، ہمارے محلے کے غریبوں کے پاس کھانے کے لئے پیسے نہیں ہوتے، وہ علاج کی سہولت سے محروم ہوتے ہیں، ان کے مکان کی حالت انتہائی خستہ ہوتی ہے، جب کہ ہم دولت سے مالا مال ہوتے ہیں، لیکن ہماری حس اتنی مردہ ہو چکی ہوتی ہے کہ ہم اس طرح کے بے بس افراد کی امداد کے لئے کسی صورت آمادہ نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ ہماری حالت زار پر رحم فرمائے۔ آمین۔ (مرتب)

وَمَن لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنكُمْ طَوْلاً أَن يَنكِحَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ فَمِن مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُم مِّن فَتَيَاتِكُمُ الْمُؤْمِنَاتِ وَاللّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَانِكُمْ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ. (سورۃ النساء، آیت نمبر ۲۵)

(اور جو شخص تم میں پوری قدرت اور گنجائش رکھتا ہو، آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کرنے کی، تو وہ اپنے آپس کی مسلمان لونڈیوں سے نکاح کرلے جو تمہاری مملوکہ ہیں)۔

اس آیت سے تکبر اور خود پسندی کی جڑ کا کٹ جانا

اس آیت میں جملہ بعضکم من بعض جس کے معنیٰ ہیں تم آپس میں ایک دوسرے

کے برابر ہو تو اس سے تکبر وخودی کی جڑ کاٹ دی گئی ہے، اور بعض صوفیاء اس کا اہتمام بہت کرتے ہیں۔

تشریح:

جب انسان حضرت آدم کی اولاد ہے اور مذکورہ آیت کے تحت سب ایک دوسرے کے برابر ہیں تو اس کے نتیجے میں انسانوں کے درمیان باہمی محبت ومساوات کا بہترین نظام قائم ہونا چاہئے، لیکن تکبر کی نفسیات نے انسانوں میں غیر معمولی تفریق پیدا کردی ہے، حکمران، افسران اور سرمایہ دار، غریبوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو بلند مقام پر فائز تصور کرتے ہیں۔ تکبر کی نفسیات سے جتنی بھی خرابیاں پیدا ہوں، کم ہیں۔ اگر تکبر کی جگہ پر اپنی اصل حیثیت کا احساس غالب ہو اور انسانوں کو اپنے جیسا انسان سمجھکر، ان کی عزت وتکریم پیدا ہوجائے اور ان سے اپنائیت کا معاملہ ہو تو معاشرے میں موجود سارا فساد ختم ہوجائے۔ (مرتب)

فَإِنْ أَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ. (سورۃ النساء، آیت نمبر ۲۵)

(پھر اگر لونڈیاں منکوحہ بنالی جائیں، پھر اگر وہ بے حیائی کا کام کریں تو ان پر اس سزا سے نصف سزا ہوگی)۔

درجات کے تفاوت سے
حکمت عملی میں فرق کا واقع ہونا

اس سے معلوم ہوا کہ درجات کے تفاوت سے سیاست میں بھی تفاوت ہوتا ہے اور یہی شان ہوتی ہے حکماء و مصلحین کی کہ وہ ہر طالب کے ساتھ اس کی خصوصیت کے موافق معاملہ کرتے ہیں۔

تشریح:

درجات کے تفاوت سے افراد کے ساتھ تکریم میں کمی بیشی ہونا، فطری بات ہے، اہل علم، اہل دانش، متقی افراد کی جو تکریم ہونی چاہئے، ظاہر ہے ان صفات سے محروم افراد

کی اس طرح تکریم نہیں ہوسکتی، یہ اہم نکتہ ہے، صوفیاء کرام لوگوں سے انکی حیثیت کے مطابق معاملہ کرتے ہیں، یہ حکمت کی علامت ہے۔ مثلاً قوم کا کوئی سردار ملنے آیا ہو تو اس کی تکریم زیادہ ہوگی، بمقابلہ عام فرد کے۔

یہ انسانی نفسیات کے فہم اور حکمت سے متعلق معاملات ہیں، ان کو پیش نظر رکھنے میں زیادہ فوائد پوشیدہ ہیں، مختلف طبقات اور مختلف افراد کے ساتھ مختلف حکمت عملی کا ہونا، اسلامی تعلیمات میں شامل ہے۔ (مرتب)

إِنَّ اللّٰهَ لاَ يُحِبُّ مَن كَانَ مُخْتَالاً فَخُوراً ۔ (سورۃ النساء، آیت نمبر ۳۶)

(بے شک اللہ تعالیٰ ایسے شخصوں سے محبت نہیں رکھتے جو اپنے کو بڑا سمجھتے ہوں اور شیخی کی باتیں کرتے ہوں)۔

اپنے مجاہدوں سے خود پسندی اور تکبر میں مبتلا ہونا

اس آیت کے مفہوم میں وہ شخص بھی داخل ہوگیا، جو راہ سلوک میں اپنی جدوجہد پر عجب (خود پسندی) اور اپنے احوال ومقامات (کیفیات وحالات) پر فخر کا اظہار کرتا ہے۔

تشریح:

اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور شیخی کا مظاہرہ کرنا، یہ عام بیماری ہے، جس میں کسی نہ کسی حد تک ہر فرد مبتلا ہے، یہ بیماری ایسی ہے، جو قبولیت حق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنتی ہے۔

راہ سلوک میں طالب جب نفس کے خلاف مجاہدوں کے عمل سے گزرتا ہے تو طالب کو نفس اپنے مجاہدوں پر ناز کرنے اور اپنی بہتر کیفیات وحالات کی بنا پر اسے فخر کرنے اور بزرگی کی راہ اختیار کرنے پر شدت سے اکساتا رہتا ہے، اگر طالب کو شیخ کامل کی معیت وصحبت مسلسل حاصل ہے تو وہ اسے نفس کے اس مکر وفریب اور بحران سے نکالنے میں معاون ثابت ہوتا ہے، لیکن اگر کامل شیخ کی صحبت ومعیت برائے نام یا رسمی حد تک ہے تو ایسا طالب اپنے آپ کو کمالات کا صاحب سمجھ کر، خود پسندی، تکبر اور بزرگی کی مسند پر فائز ہوجاتا ہے، اس طرح وہ نفس کے خلاف مجاہدوں کے دوران نفسی قوتوں کا شکار ہوجاتا ہے، راہ سلوک وراہ محبت اس اعتبار سے بڑی نازک راہ ہے کہ یا تو طالب، طلب

کی کمی کی وجہ سے اس راہ پر بڑی سست رفتاری سے چلتا ہے، یا اگر مجاہدوں سے کام لیتا بھی ہے تو لاشعور سے نکلے ہوئے نفسی جذبات اسے جلد سے جلد بزرگ، پیر اور مقتدا بننے کی راہ پر گامزن کرتے ہیں، اس طرح تصوف خود اس کی راہ کھوٹی کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے، چنانچہ راہ سلوک میں قدم قدم پر احتیاط کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اور شیخ کامل کی معیت وصحبت کی بھی۔

فخر کرنے اور بزرگی کی یہ راہ قبل از وقت خلافت ملنے سے بھی اختیار ہورہی ہے، اس لئے کہ اس دور میں عام طور پر خلافت کی مسند عطا فرمانے کا کوئی معیار ہی نہیں رہا۔

جب تک طالب طویل عرصہ تک نفس کے خلاف ذکر وفکر کے مجاہدوں کے ذریعہ معرکہ آرائی سے کام لے کر حالت فنا سے حالت بقا میں نہیں آتا، بزرگ بننے کے خبط سے آخری حد تک بچنے کے لئے کوشاں ہونا چاہئے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ لاَ تَقْرَبُواْ الصَّلاَةَ وَأَنتُمْ سُكَارَى حَتَّىَ تَعْلَمُواْ مَا تَقُولُونَ ۔ (سورۃ النساء، آیت نمبر ۴۳)

(اے ایمان والو، تم ایسی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ، جب تم نشہ میں ہو یہاں تک تم سمجھنے لگو کہ منہ سے کیا کہتے ہو)۔

اعمال کی خاطر حالت سکر سے باہر نکل آنا

سکر کو عام لیں تب تو لفظاً اگر عام نہ لیں تو اسباب کی وجہ سے قیاساً اس سے مفہوم ہوا کہ جب (طالب کو) سکر کے آثار (غلبہ سکر) محسوس ہو تو ذکر کو چھوڑ دے، اگر ذکر کو نہ چھوڑے گا تو وہ خود چھوٹ جائے گا، ترقی کا سبب عمل تھا، جب عمل منقطع ہوگیا تو ترقی بھی رک جائے گی۔ اس لئے وضاحت بھی کی گئی کہ استغراق میں ترقی رک جاتی ہے۔

تشریح:

راہ محبت میں طالب پر ذکر کی محویت غالب ہوجاتی ہے تو وہ حالت سکر میں آجاتا ہے، حالت سکر میں ذکر کے انوار تیز ہوتے ہیں، اور طالب، ذکر کی حلاوت کی وجہ سے ذکر کا سلسلہ منقطع کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا، چنانچہ اس کی دوسری عبادات متاثر ہونے لگتی ہیں، بعض اوقات نماز کے وقت بھی ذکر کی محویت اس پر طاری رہتی ہے، اگرچہ

اکثر یہی ہوتا ہے کہ نماز کے موقعہ پر وہ حالت صحو (ذہنی طور پر صحت کی حالت) میں آ جاتا ہے، اگر نہیں آتا تو اللہ کی طرف سے ایسا انتظام ہوتا ہے کہ اس کا ذکر منقطع کر دیا جاتا ہے، اس طرح اس کے لئے نماز کے اہتمام کی صورت پیدا کردی جاتی ہے، چونکہ وہ ذکر بھی محبوب سے وصال کی خاطر ہی کرتا ہے اور نماز بھی محبوب کے وصال کی ایک مؤثر صورت ہے، اور اہم دینی فریضہ بھی ہے، اس لئے عام طور پر نماز کے وقت اس کی حالت سکر اور حالت محویت کو منقطع کردیا جاتا ہے۔ بعض طالب ایسے ہوتے ہیں، جو غلبہ ذکر اور حالت سکر میں زیادہ گہرے چلے جاتے ہیں۔ ایسے افراد کے لئے مولانا فرماتے ہیں کہ ان کی یہ حالتِ سکر محبوب کی طرف وصال کے سلسلہ میں معاون ثابت نہیں ہوگی، اس لئے کہ راہ سلوک میں ساری ترقی اعمال شریعت سے ہوتی ہے، اگر اعمال شریعت متاثر ہوں، اور ان کی ادائیگی رک جائے تو طریقت میں ترقی بھی رک جاتی ہے، اس لئے یہ شیخ کا کام ہے کہ وہ اس طرح کے طالبوں پر یہ بات واضح کرے، ذکر میں اتنی محویت صحیح نہیں ہے، جس سے انتہائی ضروری دینی اعمال متاثر ہوں، جب طریقت (تصوف) شریعت کی خادم ہے تو خادم کو شریعت کے تابع ہوکر چلنا پڑے گا۔ ورنہ طریقت کی شرعی حیثیت باقی نہ رہے گی اور اس طرح کی طریقت اسلامی شریعت کو نقصان پہنچانے اور اسے متنازعہ بنانے اور اسلامی شریعت کے تسلسل کو منقطع کرنے کا ذریعہ بنے گی، اس طرح سکر کا غلبہ صوفیاء کو لادینیت کی طرف لے جانے کا موجب بنے گا، تصوف میں پیدا ہونے والی خرابیوں کا بنیادی سبب یہی ہے کہ طریقت اپنی حدود میں رہنے کی بجائے شریعت سے متجاوز ہونے لگتی ہے۔ طریقت وتصوف کا کام طالب کو چستی، ہمت اور حوصلہ کے ساتھ اسلامی شریعت پر گامزن کرتے رہنا اور اسلامی شریعت کو آسان بنانا ہے، نہ کہ اسلامی شریعت سے تجاوز کرنا۔ (مرتب)

فَامْسَحُواْ بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ إِنَّ اللّهَ كَانَ عَفُوّاً غَفُوراً. (سورۃ النساء، آیت نمبر۴۳)

(یعنی اپنے چہرے اور ہاتھوں پر مل لیا کرو بلاشبہ اللہ بڑے معاف کرنے والے اور بڑے بخشنے والے ہیں)۔

کمزور افراد کے لئے اعمال میں کمی

یہاں اعمال میں کمزور افراد کا علاج ہے کہ جو اپنی کمزوری کی وجہ سے عمل کامل نہ کر سکے اور یہ وسوسہ ہوتا ہے کہ جب ہمارے عمل میں یہ ظاہری نقص موجود ہے تو مقصود کے لئے کافی نہ ہوگا پس اس میں وسوسہ کو ختم کرنے کی تدبیر کی طرف اشارہ ہے کہ اس طرح سوچا کریں کہ اگر فرض کریں وہ غیر ناکافی بھی ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے نقص کو دور فرما کر کافی بنائیں گے۔

تشریح:

راہ سلوک میں طالب کو عرصہ تک اس وسوسے کا غلبہ ہوتا ہے کہ اس کے اعمال اس قابل ہی نہیں ہیں کہ وہ اللہ کے سامنے پیش ہوسکیں، نیز دورانِ ذکر اور دورانِ نماز وسوسے انہیں گھیرے رہتے ہیں۔

اگر خیالات قابو میں نہیں آتے اور اخلاص وللھیت میں غیر معمولی کمی موجود ہوتی ہے، یہ احساس ایسا ہوتا ہے، جو بالخصوص متوسط طالب کے لئے سخت پریشانی کا موجب ہوتا ہے، اس سے شیطان انہیں مایوسی کی طرف لے جانا چاہتا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جس فرد کو اللہ نے اپنی راہ محبت میں چلنے کی توفیق عطا فرمائی ہے اور جسے ذکر اور صحبت اہل اللہ کی راہ نصیب کی ہے، اس کو گویا ساری سعادتوں سے نوازا ہے، اس لئے کہ ذکر وصحبت کی یہ توفیق ہی اسے نفسی قوتوں سے مقابلہ کرکے اس کے لئے انشاء اللہ ایک دن محبوب تک رسائی کا ذریعہ بنے گی، ابتدائی اور درمیانی عرصہ میں چونکہ طالب، نفس سے معرکہ آرائی کی حالت میں ہوتا ہے، اس لئے نفس کی طرف سے اس پر وسوسوں کے حملے ہوتے رہتے ہیں، ان حملوں کا علاج اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ فرد یہ تصور کرے کہ اگر اس کے اعمال میں نقائص موجود ہیں تو اللہ کی ذات ان کمزوریوں کو دور کرکے اس کے اعمال میں پختگی پیدا فرمائیں گے اور انہیں قبولیت کا شرف بھی عطا فرمائیں گے اور ایک دن انشاء اللہ تکمیل کی صورت بھی پیدا فرمائیں گے، اس تصور کو جماتے رہنے سے وسوسوں کی وجہ سے ہونے والی پریشانی میں انشاء اللہ کمی واقع ہوگی، ویسے ان وسوسوں کا مستقل علاج صحبت اور ذکر کے دورانیہ میں اضافہ ہی ہے، اس سے طالب رفتہ رفتہ سلوک کے ارتقائی مراحل طے کرتا جائے گا اور وسوسوں میں بھی آہستہ آہستہ کمی ہوتی جائے گی اور اعمال میں

بہتر سے بہتر صورت پیدا ہوتی جائے گی۔ (مرتب)

وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِأَعْدَائِكُمْ وَكَفَى بِاللّٰهِ وَلِيًّا وَكَفَى بِاللّٰهِ نَصِيرًا. (سورۃ النساء، آیت نمبر ۴۵)

(اور اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کو خوب جانتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کافی رفیق ہے اور اللہ تعالیٰ کافی حامی ہے)۔

متوکلین کو شیاطین سے خوف زدہ نہ ہونا چاہئے

اعداء چونکہ شیاطین کو بھی عام ہے تو یہ آیت دلیل ہے، اس بات پر کہ متوکلین کو شیطان سے خوف نہ کرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے اعداء (دشمنوں) سے کفایت کا وعدہ فرمایا ہے۔

تشریح:

متوکلین ہر معاملہ میں اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں اور اللہ ہر معاملہ میں ان کی مدد کی صورت پیدا فرماتا رہتا ہے، انہیں دین پر مستحکم رکھتا ہے، یہ اللہ کا ان پر سب سے بڑا فضل ہوتا ہے۔ شیطان کی شرارتوں سے بھی اللہ انہیں بچاتا ہے۔ (مرتب)

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يُزَكُّونَ أَنفُسَهُمْ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّي مَن يَشَاءُ. (سورۃ النساء، آیت نمبر ۴۹)

(تونے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے آپ کو پاکباز بتاتے ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں مقدس بتلادیں)۔

اپنے آپ کو پاکباز سمجھنے کی مذمت

اس میں تقدس (اور پاکبازی) کے دعویٰ کا انکار (اور اس کا رد ہے) اس میں سوائے اہل فنا کے بہت سے مشائخ مبتلا ہیں۔

تشریح:

اپنے آپ کو پاکباز سمجھنا اور اس نفسیات کا حامل ہونا، بڑی ناقابل اصلاح بیماری ہے، پاکباز تو وہی ہوسکتا ہے، جسے اللہ اپنے فضل خاص سے پاکباز بنائے۔

ویسے پاکباز بننے کے لئے اللہ کی جو سنت ہے، وہ یہ ہے کہ اہل اللہ کی صحبت کے زیر اثر نفس کے خلاف مجاہدوں کا عمل شروع ہو، طویل عرصہ تک نفس کے خلاف معرکہ

آرائی کا عمل جاری رہے، اس سے نفس کے اندر کی ساری کثافتیں اور ساری خباثتیں بتدریج نکلتی چلی جائیں گی، مجاہدوں کے اس عمل کے دوران طالب کو نفس کی ان کثافتوں کا ادراک اور مشاہدہ بھی ہوتا رہے گا، تا آنکہ وہ نفسی قوتوں کو فنا کے گھاٹ اتار دے، فنائیت کے مقامات طے کرکے، وہ اللہ کے ساتھ حالت بقا میں رہے، مجاہدوں کا یہ سفر بہت صبر آزما عمل ہے، اس میں طالب کو روزانہ مرکر زندہ ہونا پڑتا ہے، ان مراحل سے گذرنے کے بعد طالب کی یہ نفسیات کہ وہ کوئی ہستی ہے، وہ بزرگ ہے، وہ مہذب ہے، یہ سارے دعوے کالعدم ہوجاتے ہیں، فنائیت کا حامل صوفی اللہ کی شان عظمت کے زیر اثر اپنے آپ کو سب سے زیادہ حقیر اور سیاہ کار سمجھنے لگتا ہے، چونکہ وہ نفس کی طوفان خیزیوں کی ہولناک واردات سے گذرا ہے، اس لئے وہ اس طرح کے دعویٰ سے دستبردار ہوکر، اپنے آپ کو مکمل طور پر اللہ کے سپرد کردیتا ہے۔ (مرتب)

وَمَن يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا. (سورۃ النساء، آیت نمبر ٦۹)

(اور جو شخص اللہ و رسول کی اطاعت کرے گا تو ایسے اشخاص بھی ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء و صلحاء یہ حضرات اچھے رفیق ہیں)۔

انعام یافتہ افراد کے ساتھ شامل ہونا

باطنی مقامات کا اثبات ہونا

آیت میں ان باطنی مقامات کا اثبات ہے اور اس پر بھی دلالت ہے کہ ان مقامات والوں میں ادنیٰ کو اعلیٰ کے ساتھ معیت و رفاقت ممکن ہے، یہی حقیقت ہے اس کی جو بعضوں پر کشف کی صورت میں ظاہر ہوا ہے کہ وہ اعلیٰ مقام پر پہنچا ہے، (تو یہ پہنچنا خود اصل کے اعتبار سے نہیں ہوتا، بلکہ صاحب مقام کی تابع ہوکر ہوتا ہے اور جس شخص کو حقیقت معلوم نہیں ہوتی، وہ دعویٰ نبوت وغیرہ کرکے گمراہی میں چلا جاتا ہے۔ (نعوذ باللہ)

تشریح:

اللہ ورسول کی اطاعت کرنے والے انبیاء، صدیقین اور شہداء وصلحاء کے ساتھ ہوں گے، یہ بہت بڑا انعام ہے، جو راہ محبت کے طالبوں اور مخلصانہ اطاعت کے حامل افراد کو حاصل ہوگا۔ اللہ کے صالح ترین انسانوں کی مستقل صحبت کا لازمی نتیجہ ان کی معیت ورفاقت ہے، چاہے وہ اعمال واخلاص کے معاملہ میں ان کے درجات سے کم ہی ہوں، لیکن چونکہ صالح ترین انسانوں کی صحبت کے نتیجہ میں وہ ان کی راہ پر گامزن اور اخلاص وتقویٰ کے بلند سے بلند مقامات حاصل کرنے کی آرزو رکھتے تھے، لیکن نامساعد حالات کی وجہ سے وہ اعلیٰ مقامات حاصل نہ کر سکے اورادنیٰ مقامات پر رہے، اس لئے صالح ترین انسانوں کے اتباع کے نتیجہ میں آخرت میں انہیں ان کی معیت ورفاقت نصیب ہوگی، انہیں یہ سعادت ان کے اعمال کی وجہ سے نصیب نہ ہوگی، بلکہ صالح ترین انسانوں کی مستقل صحبت اور ان کی راہ پر گامزن ہوتے رہنے کی آرزو اور کاوشوں کی وجہ سے حاصل ہوگی۔

بعض افراد کو کشفی طور پر ایسا ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے، اس طرح کا کشف ان کے لئے گمراہی کا ثابت ہوتا ہے کہ وہ بڑا دعویٰ کر بیٹھتے ہیں، اگر انہیں اس معاملہ میں صحیح صورتحال اور اصل حقیقت کا علم ہوتا تو وہ اس گمراہی تک ہرگز نہ پہنچتے، اس لئے کہ انہیں جو کشف حاصل ہوا، وہ اعلیٰ افراد کی برکت اور ان کے طفیل سے ہی حاصل ہوا۔ (مرتب)

وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ۔ (سورۃ النساء، آیت نمبر ۸۳)

(اور جب ان لوگوں کو کسی امر کی خبر پہنچتی ہے خواہ امن ہو یا خوف تو اس کو مشہور کر دیتے ہیں اگر یہ لوگ اس کو رسول کے اور جو ان میں سے ایسے امور کو سمجھتے ہیں ان کے اُوپر حوالہ رکھتے)۔

باطنی احوال شیخ کے علاوہ دوسروں کے سامنے پیش نہ کرنا

اسی طرح دوران سلوک سالک کو جو اسرار واحوال پیش آتے ہیں، ان کا عوام یا غیرمحقق کے سامنے ظاہر کرنا باطنی طور پر نقصاندہ ہے، یہ بھی نظیر ہے اس آیت کی۔

تشریح:

راہ سلوک میں طالب کو بہت سارے باطنی احوال پیش آتے رہتے ہیں۔ کشف کا حاصل ہونا، بہتر خوابوں کا ہونا، بہتر سے بہتر کیفیات کا حاصل ہونا، ذکر میں حلاوت کا ہونا، قیمتی سے قیمتی نکات کا القا ہونا، ان سارے معاملات میں طالب کو اپنے شیخ کے علاوہ کسی دوسرے سے ذکر نہ کرنا چاہئے، اس لئے بھی کہ اس سے دعویٰ کے پیدا ہونے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے، دوسرے اس لئے تاکہ شیخ، طالب کو ان حالات کی صحیح نوعیت وتوجیہ سے آشنا کر سکے۔

سوم اس لئے کہ محبوب کے رازوں کو ظاہر کرنا طالب کے لئے نقصاندہ ہے۔ البتہ منتہی صوفی اگر لوگوں کو اس راہ کے ثمرات سے آشنا کرانے کے لئے کبھی کبھار ایسا کرتا ہے تو وہ افادیت سے خالی نہیں۔

دوسری دنیا کے مشاہدات میں جنت ودوزخ کے منظروں کا سامنے آنا، ارواح سے ملاقاتوں کا ہونا، فرشتوں کا سامنے آنا وغیرہ وغیرہ شامل ہے۔

لَّا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ۔ (سورۃ النساء، آیت نمبر ۹۵)

(برابر نہیں وہ مسلمان جو بلاکسی عذر کے گھر میں بیٹھے رہیں اور وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کریں)۔

کمزور اور قوی طالب کے مجاہدہ کا مختلف ہونا

قاعدین میں غیر اولی الضرر کی قید لگانا اس پر دلیل ہے کہ ضعیف (طالب) کا مجاہدہ قوی (سالک) کے مجاہدے سے مختلف ہے، ضعیف کے لئے تھوڑا مجاہدہ نفع بخش ہوتا ہے، جب کہ قوی کے لئے زیادہ مجاہدہ۔

تشریح:

ضعیف چونکہ غیرمعمولی مجاہدوں کا متحمل نہیں ہوتا، اس سے اس کی ذہنی واعصابی کمزوری بڑھ جاتی ہے، وہ معاشی حوالے سے ضروری کاموں کے بھی قابل نہیں رہتا، اس لئے جسمانی اور ذہنی طور پر کمزور فرد کے مجاہدے بہت زیادہ نہیں ہوتے، اس کے مجاہدے اس کے ضعف کی مناسبت سے ہوتے ہیں۔ جب کہ جسمانی وذہنی طور پر طاقتور فرد کے

مجاہدے زیادہ ہوتے ہیں۔ چونکہ نفس مجاہدوں کے بغیر تابع نہیں ہوتا، اس لئے شیخ، قوی فرد کے لئے زیادہ خاصے مجاہدے تجویز کرتا ہے۔ اگرچہ شروع میں عام طور پر ہر ایک کے لئے مجاہدوں کا دورانیہ کم ہوتا ہے، لیکن جوں جوں ذکر سے مناسبت پیدا ہونے لگتی ہے، طالب کے مجاہدوں کے دورانیہ میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ مجاہدوں کے اسی اضافہ سے طالب کی ساری ترقی وابستہ ہے۔ (مرتب)

وَمَن يَخْرُجْ مِن بَيْتِهِ مُهَاجِراً إِلَى اللّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلى اللّهِ . (سورۃ النساء، آیت نمبر ۱۰۰)

(اور جو شخص اپنے گھر سے اس نیت سے نکل کھڑا ہو کہ اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کروں گا پھر اس کو موت آ پکڑے تب بھی اللہ تعالیٰ کے ذمہ اس کا ثواب ثابت ہوگیا)۔

سلوک کی تکمیل سے پہلے انتقال سے

تکمیل سلوک کے رتبہ کا حاصل ہونا

یہ آیت دلیل ہے اس بات پر کہ جو سالک، سلوک طے کرنے سے قبل مرجائے، وہ رتبے اور قبولیت میں اس کے برابر ہے، جس کا سلوک مکمل ہوجائے۔

تشریح:

سالک، راہ سلوک کا سفر اس لئے طے کرتا ہے، تاکہ اسے اللہ کے وصول کی سعادت حاصل ہو اور وہ نفس مطمئنہ کے مقام پر فائز ہوجائے، جہاں نفسی قوتیں مکمل طور پر اللہ ورسول کے تابع ہوجائیں، اس راہ میں چلتے ہوئے اگر راہ سلوک مکمل کرنے سے پہلے ہی سالک کا انتقال ہوا تو وہ رتبہ اور قبولیت میں نفس مطمئنہ کی حامل شخصیت کے برابر ہوگا، گویا وہ حالت فنا سے حالت بقا کے مقام پر فائز ہوا، اس لئے کہ اس نے اسی ارادہ سے نفس سے اللہ کی طرف ہجرت کا عمل شروع کیا تھا، اور اس کے لئے مجاہدوں کا سفر اختیار کیا تھا، اس لئے جو طالب اس فکر میں رہتے ہیں کہ انہوں نے راہ محبت وراہ سلوک اختیار کرنے میں تاخیر سے کام لیا، اب معلوم نہیں، راہ سلوک طے ہونے کی مہلت بھی ملے گی، یا اس سے قبل موت واقع ہوجائے گی، اگر اس سے قبل موت واقع ہوئی تو یہ تو گھاٹے کا

سودہ ہے، ایسے افراد کو مطمئن ہونا چاہئے کہ راہ سلوک کے دوران واقع ہونے والی موت سعادت کی موت ہے، انہیں انشاء اللہ ہر صورت میں وہی مقام حاصل ہوگا، جو سلوک کی تکمیل کے حامل اور فنا سے بقا کا مقام حاصل کرنے والے فرد کو حاصل ہوگا۔ (مرتب)

وَلَن تَسْتَطِيْعُواْ أَن تَعْدِلُواْ بَيْنَ النِّسَاء وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلاَ تَمِيْلُواْ كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ وَإِن تُصْلِحُواْ وَتَتَّقُواْ فَإِنَّ اللّهَ كَانَ غَفُوراً رَّحِيْماً. (سورۃ النساء، آیت نمبر ۱۲۹)

(اور تم سے یہ تو کبھی نہ ہو سکے گا کہ سب بیبیوں میں برابری رکھو، اگرچہ تمہارا دل کتنا ہی چاہے تو تم بالکل ایک ہی طرف نہ ڈھل جاؤ، جس سے اس کو ایسا کردو کہ جیسے کوئی اَدھر میں لٹکی ہو، اور اگر اصلاح کرلو اور احتیاط رکھو تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت والے بڑے رحمت والے ہیں)۔

عمل کے اعلیٰ درجہ کا انتظار کرنا صحیح نہیں

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر عمل کے اعلیٰ درجہ پر قدرت نہ ہو تو اس کے ادنیٰ درجہ پر عمل کرلے، اعلیٰ پر قادر ہونے کے انتظار میں نہ رہے۔ بعض لوگوں کی عمر اسی انتظار میں صرف ہوجاتی ہے اور وہ ادنیٰ سے بھی محروم رہتے ہیں۔

تشریح:

شروع میں اگر فرد سے ادنیٰ عمل بھی ہوتا ہے تو انشاء اللہ یہ ادنیٰ عمل آہستہ آہستہ اس کے لئے عمل کی اعلیٰ صورت کا ذریعہ ثابت ہوگا۔ مثلاً شروع میں اگر فرد سے پورا انصاف نہیں ہوتا تو انصاف کی جو کم صورت ہو، اس کا ہونا ضروری ہے یا شروع میں اگر ایک گھنٹہ کی بجائے دس پندرہ منٹ کا ذکر وفکر ہوتا ہے تو یہ کافی ہے۔ اس میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا رہے گا۔ لیکن حوصلہ، ہمت، استقامت اور صحبت اہل اللہ کا ہونا ضروری ہے۔ ان ساری چیزوں کی بدولت طالب کے عمل کی حالت بہتر سے بہتر اور اعلیٰ سے اعلیٰ تر ہوتی جاتی ہے۔ صحبت اہل اللہ اور اللہ کے ذکر کے مجاہدوں کی خاصیت ہی یہی ہے، لیکن اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ فرد عمل میں بہتری کے لئے سازگار حالات کا منتظر ہوتا ہے، لیکن یہ سازگار حالات زندگی بھر اسے حاصل نہیں ہوتے، اس طرح وہ عمل کی ادنیٰ نوعیت سے بھی

محروم رہ جاتا ہے۔ (مرتب)

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُواْ ثُمَّ كَفَرُواْ ثُمَّ آمَنُواْ ثُمَّ كَفَرُواْ ثُمَّ ازْدَادُواْ كُفْراً لَّمْ يَكُنِ اللّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلاَ لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيلاً. (سورۃ النساء، آیت نمبر ۱۳۷)

(بلاشبہ جو لوگ مسلمان ہوئے پھر کافر ہوئے پھر مسلمان ہوئے پھر کافر ہوگئے پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے اللہ تعالیٰ اس طرح کے لوگوں کو ہرگز نہیں بخشیں گے اور نہ ان کو راستہ دکھائیں گے)۔

اصلاح کی توفیق کا سلب ہونا

روح المعانی میں ہے کہ یہ مقصود نہیں ہے کہ اگر اخلاص کے ساتھ ایمان لائیں تو بھی مقبول نہیں، بلکہ اس نفی سے مقصود بار بار ارتداد کرنے سے ہے اور اس پر اصرار کرنے سے عادۃً قلب مسخ ہوجاتا ہے، جس کے بعد اکثر ایمان کی توفیق نہیں ہوتی، تاکہ اس پر مغفرت اور جنت کے راستے کی ہدایت نصیب ہو، اور اس پر قیاس کیا جاتا ہے کہ جو شخص راہ طریقت کو اختیار کرکے، اس سے اعراض کرے اور اس طرح بار بار کرے اور اس کو مشغلہ بنالے تو مشاہدہ میں آیا ہے کہ اکثر ایسا شخص بے توفیق ہوتا ہے اور اسے خیر وصلاح کی توفیق نہیں ہوتی۔

اس حاشیہ کی تسہیل مولانا حافظ فضل الرحیم نے زیادہ بہتر طور پر کی ہے، وہ بھی یہاں پیش کی جارہی ہے۔

جس طرح کوئی شخص کبھی ایمان لائے، کبھی مرتد ہوجائے کہ اس کو ایک کھیل بنالے تو اس کے اندر اصلاح کی توفیق ختم ہوجاتی ہے۔ اسی طرح جو شخص بیعت ہوجائے (یعنی کسی اہل اللہ سے اصلاح کا تعلق قائم کرے)۔ پھر اس اصلاح کے طریقہ پر نہ چلے، جو شیخ کہے اور دوبارہ کبھی (اصلاح کا) تعلق قائم کرے، پھر شیخ کی تربیت کے مطابق نہ چلے تو اکثر ایسے شخص کو اصلاح کی توفیق نہیں ہوتی، بلکہ وہ ویسا ہی رہتا ہے، جیسا آیا تھا۔

تشریح:

اہل اللہ سے تعلق قائم کرنے کے بعد اسے توڑنا فرد کے لئے بڑے خطرے کی بات ہے۔ بعض افراد کی عادت ہوتی ہے کہ وہ اہل اللہ کی صحبت کے ذریعہ مجاہدوں کی راہ

پر نہیں آتے، وہ چاہتے ہیں کہ ان کی ساری روحانی ترقی فیض نظر سے ہو، جب ایسا نہیں ہوتا اور ان کی روحانی ترقی میں اضافہ نہیں ہوتا تو وہ تعلق منقطع کردیتے ہیں۔ حالانکہ اہل اللہ کی صحبت طالب کی روحانی ترقی کے لئے بہت نافع ہوتی ہے۔

جب طالب ان کی ہدایت کے مطابق ذکر وفکر کا عمل شروع نہ کرے تو ذکر وفکر کے بغیر تزکیہ کے عمل میں بہتری نہیں ہوتی، یہ وہ بنیادی نکتہ ہے، جسے نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض طالب روحانی استاد تبدیل کرتے رہتے ہیں، ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا، اس طرح ان کی زندگی کا بڑا حصہ اس میں صرف ہوجاتا ہے۔ اس کا آخری نتیجہ جو نکلتا ہے، وہ یہ ہے کہ طالب کہیں کا نہیں رہتا، اس سے اعمال کی توفیق چھن جاتی ہے۔ اللہ ہمیں اہل اللہ کے فیوض کی محرومی سے بچالے۔ (مرتب)

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِينَ هَادُواْ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَن سَبِيلِ اللّهِ كَثِيراً. (سورۃ النساء، آیت نمبر ۱۶۰)

(سو یہود کے انہی بڑے بڑے جرائم کے سبب ہم نے بہت سی پاکیزہ چیزیں جو ان کے لئے حلال تھیں حرام کردیں)۔

گناہوں کی وجہ سے سالک پر ہونے والے قبض کی نوعیت

گناہوں کی وجہ سے سالک پر طاری ہونے والی قبض کی واردات اسی کے مشابہ ہے۔

تشریح:

سالک کو دوران سلوک اکثر قبض کے حالات سے گزرنا پڑتا ہے، یہ قبض یا تو فنائیت کے سفر کے دوران ذکر سے غفلت کے نتیجہ میں ہوتا ہے یا ریا، حسد، کثرت گوئی، اپنی بزرگی اور بڑائی کے مظاہرے، دوسروں کی تحقیر، حب مال کے جذبات جیسے گناہوں کی وجہ سے ہوتا ہے، یہ قبض سالک کے لئے شدید بے چینی کا ذریعہ بنتا ہے، اس طرح سالک کی کیفیات سلب کرکے اسے نقد سزا دیدی جاتی ہے، مولانا نے آیت کے حوالے سے سالکوں کے اس قبض کی نوعیت وحکمت کی نشاندہی فرما کر راہ سلوک کے طالبوں کی رہنمائی فرمائی ہے۔

وَتَعَاوَنُواْ عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلاَ تَعَاوَنُواْ عَلَى الإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُواْ اللّهَ.
(سورۃ المائدہ، آیت نمبر۲)

(اور نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے سے اعانت کرتے رہو، اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی اعانت مت کرو اور اللہ سے ڈرا کرو)۔

اچھے خصائل کی آراستگی

کے کام کا مقدم ہونا

اس میں اس بات کی دلالت ہے کہ نیکی وبُرائی کے مقامات کو (مقاصد کی حیثیت دی جاتی ہے) مقاصد کا حکم دیا جاتا ہے اور اس قائدہ کو اہل تربیت بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں اور نیکی کے کاموں کو مقدم سمجھتے ہیں بُرائی کی روک تھام کے کاموں پر، اس کے لئے تحلیہ کی تقدیم ہے تخلیہ پر (یعنی اچھے خصائل سے آراستہ کرنے کا کام مقدم ہے، رزائل سے پاک کرنے سے)۔

تشریح:

اہل اللہ کے یہاں نیکی کی عادت کو مستحکم کرنے اور بُرائی سے بچاؤ کا کام مقاصد میں شامل ہے، اسلئے اس کام کو ان کے یہاں فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے، سارے مقامات اسی سے وابستہ ہیں، ان کے یہاں سب سے پہلے مجاہدوں کے ذریعہ نیکی کی عادت اور اس کے مزاج کو مستحکم کیا جاتا ہے، جب نیکی کا مزاج راسخ ہوجاتا ہے تو اس کے لازمی نتیجے کے طور پر بُرائیوں کا مزاج کالعدم ہونے لگتا ہے، تحلیہ مقدم ہے یعنی اچھے خصائل کی آراستگی کو اولیت حاصل ہے، رزائل سے پاک کرنے سے۔ جب عبادت اور ذکر وفکر، مزاج کا حصہ بن جاتے ہیں تو اس سے باطنی بُرائیوں سے ازخود نجات مل جاتی ہے، ذکر وفکر وعبادت کی کثرت اپنے ساتھ پاکیزگی اورحسن لاتی ہے، یہ پاکیزگی بُرائی کی دوری کا سبب بن جاتی ہے۔

الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الإِسْلاَمَ دِيناً. (سورۃ المائدہ، آیت نمبر۳)

(آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے کامل کردیا اور میں نے تم پر اپنا

انعام تمام کردیا اور میں نے اسلام کو تمہارے دین بننے کے لئے پسند کرلیا)۔

فقہاء کے اخراج مسائل کا قرآن وسنت سے ماخوذ ہونا

اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ فقہاء نے قرآن وسنت کے نصوص (تعلیمات واصول) سے جو مسائل نکالے ہیں، وہ سب دین ہے، ورنہ دین کی تکمیل کے بعد اس کی اجازت نہ ہوتی کہ اس سے غیر دین کی اجازت دینا یا دین کا غیر مکمل ہونا لازم آتا ہے، پس آیت دلیل ہوئی مجتہدین ومشائخ کے اتباع کے واجب ہونے پر۔

تشریح:

فقہاء نے جو بھی مسائل نکالے ہیں، وہ قرآن وسنت کے نصوص (تعلیمات) کو بنیاد بنا کر ہی نکالے ہیں یا مشائخ نے تزکیہ وتربیت کے لئے بھی جو اصول اور طریقے اخذ کئے ہیں، وہ قرآن وسنت ہی سے اخذ کئے ہیں، قرآن وسنت میں ہر دور کے مسائل میں رہنمائی کا انتظام موجود ہے۔ لیکن اس سے مسائل نکالنا مجتہدوں ومشائخ کا کام ہے، جنھوں نے اپنی ساری زندگی قرآن وسنت کو سمجھنے اور اس کے فہم ورسوخ میں صرف کی ہے۔

وَبَعَثْنَا مِنهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيباً. (سورۃ المائدہ، آیت نمبر۱۲)

(اور ہم نے ان میں سے بارہ سردار مقرر کئے)۔

مریدوں کی تربیت کے لئے

نائبوں کا تقرر ہونا

اس میں اہل تربیت مشائخ کی اس عادت کی اصل ہے کہ مریدوں پر ایسے نائبوں کو مقرر کردیتے ہیں، جو ان کی اصلاح وتربیت کی نگرانی کریں اور ان کو ایسے افراد کے سپرد کرتے ہیں، جن میں ایک دوسرے سے (طبعی) مناسبت ہو۔

تشریح:

اہل اللہ جن کا حلقہ وسیع ہوتا ہے، وہ افراد کی اصلاح وتربیت کے لئے اپنے نائبین مقرر کرتے ہیں، جو حلقہ سے وابستہ سالکوں کی تربیت کا کام کرتے ہیں، انہیں راہ سلوک میں چلاتے ہیں، چونکہ راہ محبت بہت کٹھن راہ ہے، اس میں قدم قدم پر نفس سے مقابلہ

درپیش ہوتا ہے، کیفیات کے ادل بدل سے گزرنا پڑتا ہے، نفس پرستی کی قوتوں اور اس کی گھائیوں سے گذرنا پڑتا ہے، چنانچہ متوسط سالکین، جو قابل ذکر حد تک ان مراحل سے گذر چکے ہوتے ہیں، شیخ مختلف طالبوں کو ان کے سپرد کرتا ہے، تا کہ وہ ان کی نگرانی وخبرگیری کریں۔

حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُواْ بِهِ فَأَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ. (سورۃ المائدہ، آیت نمبر۱۴)

(سو وہ بھی جو کچھ اُنکو نصیحت کی گئی تھی اسمیں سے اپنا ایک بڑا حصہ فوت کر بیٹھے تو ہم نے ان میں باہم قیامت تک کیلئے بغض وعداوت ڈال دیا)۔

گناہوں کا آخرت کے ساتھ

دنیا میں بھی عذاب کا باعث ہونا

دلیل ہے اس بات پر کہ گناہ، جس طرح آخرت کے عذاب کا سبب ہیں، اس طرح دنیا میں عذاب کا بھی، اس لئے دنیا میں خانہ جنگی یقیناً عذاب کی صورت ہے۔

تشریح:

گناہوں کی ''خصوصیت'' ہی یہ ہے کہ اس سے شخصیت میں آگ، جلن اور تپش پیدا ہوتی ہے، قلب وروح مضطرب رہنے لگتا ہے، سینہ میں تنگی پیدا ہوتی ہے، تاریکی وحجابات پیدا ہونے لگتے ہے، یہی تاریکی وحجابات آخرت میں عذاب کا موجب ہوں گے تو دنیا میں فتنہ وفساد اور خانہ جنگی کا ذریعہ بھی۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ اللہ سے بغاوت، بندوں کے حقوق کی تلفی اور ظلم ستم جیسے گناہوں کی وجہ سے آج پوری دنیا فتنہ وفساد، انتشار وخلفشار، بلکہ قتل وغارت گری کا نمونہ بن گئی ہے، یہ سب گناہوں ہی کا نتیجہ ہے، اس دنیا میں گناہوں کی سزا افراد کو ایک دوسرے سے تصادم، لڑائی جھگڑے وغیرہ کی صورت میں ملتی ہے تو آخرت میں یہ سزا جہنم کی صورت میں۔

دنیا میں گناہوں کی وجہ سے افراد باطنی طور پر شدید اضطراب وتپش کی حالت میں رہتے ہیں تو آخرت میں وہ اللہ کے جلال (جہنم اس کی صورت ہے) کا نشانہ بنیں گے،

اللہ گناہوں سے ہماری حفاظت فرمائے۔ (آمین) (مرتب)

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ اذْكُرُواْ نِعْمَةَ اللّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنبِيَاء.
(سورۃ المائدہ، آیت نمبر۲۰)

(اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے، جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم، تم اللہ تعالیٰ کے انعام کو جو کہ تم پر ہوا ہے، یاد کرو جب کہ اللہ تعالیٰ نے تم میں بہت سے پیغمبر بنائے)۔

اہل اللہ کے خاندان میں پیدا ہونا نعمت کا ہونا

اس سے مفہوم ظاہر ہوتا ہے کہ اہل اللہ کے خاندان سے ہونا بھی ایک نعمت ہے، جس پر شکر واجب ہے، کیونکہ اس تعلق سے ان پر دین آسان ہوجاتا ہے، البتہ اس پر فخر اور عجب (خود پسندی جائز نہیں)۔

تشریح:

اہل اللہ کے خاندان میں ہونا، اس اعتبار سے بڑی نعمت ہے کہ فرد وافراد کو ازخود نیکی اور اللہ کی محبت واطاعت کا ماحول میسر ہوتا ہے، اس ماحول کے زیر اثر راہ حق پر چلنا آسان ہوتا ہے، بمقابلہ اس ماحول میں پیدا ہونا، جہاں محبت واطاعت کے لئے حالات ناسازگار ہوں، ایسے ماحول میں نیکی کی راہ پر گامزن ہونے کے لئے سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لیکن اہل اللہ کا ماحول میسر ہونے کے باوجود ان کی طاقتور روحانی وایمانی حالات وکیفیات اور اللہ کی محبت میں رنگی ہوئی شخصیت کے رنگ کو قبول نہ کرنا، یہ محرومی کی بات ہے۔

اہل اللہ تو روشنی سے سرشار ہوتے ہیں، وہ سراپا محبت ہوتے ہیں، زہد وفقر کا نمونہ ہوتے ہیں، ان سے روشنی، محبت اور فقر کے اجزاء حاصل نہ کرنا، اس سے بڑھکر بدبختی اور کیا ہوسکتی ہے۔ (مرتب)

وَلاَ تَرْتَدُّوا عَلَى أَدْبَارِكُمْ فَتَنقَلِبُوا خَاسِرِينَ. (سورۃ المائدہ، آیت نمبر۲۱)

(اور پیچھے واپس مت چلو کہ پھر بالکل خسارے میں پڑجاؤگے)۔

معصیت سے کبھی دنیوی نقصان کا ہونا

اس سے معلوم ہوا کہ معصیت سے کبھی دنیوی نقصانات بھی ہوتے ہیں۔

تشریح:

گناہوں سے مادی نقصانات کے کئی پہلو ہیں، ایک یہ کہ چونکہ گناہوں سے فرد کی شخصیت داخلی طور پر غیر مستحکم ہوتی ہے، اس لئے معمولی مادی نقصان سے دل بے چین ہوجاتا ہے اور شخصیت بل کر رہ جاتی ہے اور خوف وگھبراہٹ کے ساتھ ساتھ برداشت کی قوت باقی نہیں رہتی، اور معاملات میں صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت مجروح ہوتی ہے، دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ کی مدد ونصرت نہ ہونے کی وجہ سے فرد وافراد کی زندگی میں بے برکتی پیدا ہوتی ہے، جو مادی نقصان کا ذریعہ بنتی ہے۔

بعض گناہ ایسے ہوتے ہیں، جس سے کاروبار، ملازمت اور خوشحال مادی زندگی سلب ہونے لگتی ہے، ہم معاشرے میں اس کا آئے دن مشاہدہ کرتے رہتے ہیں، کسی کا کاروبار اچانک تباہ ہوگیا، کسی کی افسری وملازمت اچانک ختم ہوگئی، گھروں میں ٹوٹ پھوٹ واقع ہوگئی، ان سارے نقصانات کے پس پردہ اصل چیز گناہ ہی ہوتے ہیں، جن سے اس طرح کے نتائج سامنے آتے ہیں، گناہوں کے برعکس نیکیاں اپنے ساتھ سکون وسکینت اور اللہ کی نصرت لانے کا موجب بنتی ہیں۔ (مرتب)

فَمَن تَابَ مِن بَعْدِ ظُلْمِهِ وَأَصْلَحَ فَإِنَّ اللَّهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ.
(سورۃ المائدہ، آیت نمبر ۳۹)

(پھر جو شخص توبہ کرے، اپنی اس زیادتی کے بعد اپنے اعمال درست رکھے تو بیشک اللہ تعالی اس پر توجہ فرمائیں گے، بیشک اللہ تعالی بڑی مغفرت والے ہیں اور بڑی رحمت والے ہیں)۔

توبہ کا اعتبار اصلاح سے وابستہ ہونا

اس سے معلوم ہوا ہے کہ توبہ کا معتبر ہونا اصلاح پر مبنی ہے، مثلاً چوری کا مال وغیرہ واپس کردینا، ورنہ مالک سے معاف کرانا یا مالک معلوم نہ ہو تو ایسے موقعہ پر فی سبیل اللہ

صدقہ کرنا۔

تشریح:

توبہ کے لئے اصلاح اور تبدیلی کا ہونا ضروری ہے، ایسی توبہ، جس میں زندگی کا رنگ ڈھنگ اور معاشرت اور کردار میں تبدیلی برپا نہ ہو، وہ توبہ ناپائیدار ہوتی ہے، توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ فرد کی زندگی میں اسلام اور اسلامیت کا رنگ غالب ہونا شروع ہوجائے، دوسروں کی جو حق تلفی کی ہے، وہ ان سے معاف کرالے، اگر کسی کا ناجائز طریقہ سے مال کھایا ہے، رشوت لی ہے، اس مال کی واپسی کی راہ اختیار کرے، اگر کوشش کے باوجود مالک کا اتا پتہ نہ ہوسکے تو اس طرح کی صورتحال میں اتنا مال فی سبیل اللہ صدقہ کرے۔

اللہ غفور الرحیم ہے، توبہ کرنے والی کی اتنی فکرمندی کے نتیجہ میں اللہ کی طرف سے معافی کی صورت پیدا ہوگی اور فرد کی نئی زندگی شروع ہوگی، جو رفتہ رفتہ تعلق مع اللہ اور رجوع الی اللہ میں استحکام کا موجب ثابت ہوگی۔

چوری کے مال کے بارے میں یہ اشکال کہ جب تک متعلقہ فرد معاف نہ کرے، معافی نہیں ہوسکتی، اس سلسلہ میں بعض عارفوں کا کہنا ہے اصل معافی تو اللہ کی معافی ہے اللہ تعالی فرد کی توبہ میں آہ وزاری کی حالت پختگی کو دیکھکر، قیامت کے دن مالک کو راضی کردے گا اور اس کے درجات بلند کردے گا۔

سَمَّاعُونَ لِلْكَذِبِ أَكَّالُونَ لِلسُّحْتِ فَإِن جَاؤُوكَ فَاحْكُم بَيْنَهُم أَوْ أَعْرِضْ عَنْهُمْ. (سورۃ المائدہ، آیت نمبر ۴۲)

(یہ لوگ غلط باتوں کے سننے کے عادی ہیں اور بڑے حرام کے کھانے والے ہیں، اور اگر یہ آپ کے پاس آئیں تو خواہ آپ ان میں فیصلہ کردیجئے یا ان کو ٹال دیجئے)۔

اللہ کی رحمت کی سب سے بڑی دلیل

اس میں اللہ تعالی کی رحمت کی بڑی دلیل ہے کہ گناہوں کی کثرت پر مذمت فرمائی اور سرسری گناہوں کی مذمت نہیں فرمائی، جس سے عادۃ کوئی فرد خالی نہیں ہوتا، یہی شان مشائخ اہل تربیت کی ہوتی ہے کہ وہ چھوٹی غلطیوں کو نظر انداز کردیتے ہیں، جب تک جرأت اور گستاخی نہ ہو۔

تشریح:

یہ آیت اس اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں بندوں کے بڑے گناہوں کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کی مذمت کی گئی ہے، جب کہ ان کے چھوٹے چھوٹے گناہوں سے صرف نظر کیا گیا ہے، یہ اللہ کی بڑی کریمانہ شان ہے، بندے اگر بڑے بڑے گناہوں پر اصرار چھوڑدیں، اور نیکیوں پر عمل پیرا ہوں تو اس کی رحمت بندوں کے سارے چھوٹے گناہوں کی معافی کا موجب بنے گی، یہ بندوں کے لئے اس اعتبار سے خوشخبری ہے۔

اللہ کی محبت میں چلنے والوں کوتو اس کی رحمت کا آئے دن مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ وہ نفس سے معرکہ آرائی میں مصروف ہوتے ہیں، اچانک وہ نفس کے آگے زیر ہوجاتے ہیں اور گڑپڑتے ہیں، اس پر وہ سخت نادم ہوتے ہیں، نادم ہوتے ہی انہیں محسوس ہوتا ہے کہ ان پر محبوب کی طرف سے کرم کی بارش ہونا شروع ہوئی ہے اور انہیں اٹھاکر کھڑا کرکے اپنی راہ پر چلنے کی سعادت عطا فرمائی جاتی ہے۔

بندہ اگر محبوب سے محبت کی راہ پر گامزن ہوجائے تو وہ اس کی رحمت وبخشش اور کرم کا ازخود مشاہدہ کرتے رہے گا۔

بڑے گناہوں کے علاوہ چھوٹے گناہوں کونظر انداز کرنا، یہ اللہ محبوب کا بندوں پر سب سے بڑا احسان ہے، ورنہ نجات کی صورت کا پیدا ہونا بہت زیادہ دشوار تھا۔

فَمَن تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُ . (سورۃ المائدہ، آیت نمبر۴۵)

(پھر جوشخص اس کو معاف کردے وہ اس کے لئے کفارہ (گناہوں سے معافی کا ذریعہ) ہوجائے گا)۔

لوگوں کے قصور معاف کرنے کے انعامات

حدیث نبوی میں اس کی تفسیر ہے کہ کسی کا دانت توڑ دیا جائے یا بدن میں زخم کردیا جائے اور وہ شخص معاف کردے، اس کی معافی کے بقدر اس کے گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں۔

تشریح:

لوگوں کے قصور معاف کرنے کا یہ کتنا بڑا انعام ہے کہ اس کی بدولت اس کے گناہ معاف کردیئے جائیں گے۔

اتنا ظرف پیدا ہونا کہ اس کی وجہ سے فرد بندوں کے چھوٹے بڑے قصور دل سے معاف کردے، بلکہ مزید ان کے لئے اللہ سے بہتری کی دعا کرے، اللہ محبوب کو بندہ کی یہ ادا سب سے زیادہ پسند ہے، اس کے لئے تعلق مع اللہ کی ضرورت ہے، جب اللہ سے تعلق مستحکم ہوتا ہے تو فرد میں تحمل وبردباری کی صلاحیت ابھرتی ہے اور وہ اللہ کے بندوں کے لئے شفیق ثابت ہوتا ہے، بلکہ اللہ والوں نے یہاں تک خواہش ظاہر کی ہے کہ یا اللہ، تو اپنے گناہگار بندوں کے بدلہ میں ہمیں اپنے جلال کا نشانہ بنادے، بندوں کو معاف کردے، اگرچہ ان اللہ والوں کی یہ حالت سکر کی نظر آتی ہے، لیکن اس سے ان کے غیرمعمولی ظرف کا اندازہ ہوتا ہے۔

ہم بھی اگر اللہ والوں کی تقلید میں اپنے ساتھیوں اور دوسروں کے قصور اور ان کے مالی حقوق، قرض اور ان کی الٹی سیدھی باتوں کو معاف کریں تو اس سے اللہ ہمیں معاف فرمائے گا، اور اس کی طرف سے ہم پر نوازشیں شروع ہوں گی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللّهِ وَلاَ يَخَافُونَ لَوْمَةَ لآئِمٍ. (سورۃ المائدہ، آیت نمبر۵۴)

(اے ایمان والو جوشخص تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ تعالیٰ بہت جلد ایسی قوم پیدا فرمائے گا، جن سے اللہ تعالیٰ کو محبت ہوگی اور ان کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہوگی، وہ مسلمانوں پر مہربان ہوں گے اور کافروں پر تیز ہوں گے اور جہاد کرتے ہوں گے، اللہ کی راہ میں، وہ لوگ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہ کریں گے۔

اہل اللہ کے طریقہ کا اثبات

اس میں اہل اللہ کے طریقہ کی تصحیح ہے۔

تشریح:

اہل اللہ، اللہ کی محبت کی راہ پر گامزن ہیں، اللہ کی محبت واطاعت ہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہوتا ہے، وہ محبوب سے ایک لمحہ بھی جدانہیں ہوتے، کم از کم ان کے دل میں محبوب کے لئے فکرمندی اور اس کی طرف توجہ تو ہر وقت رہتی ہے، دل،جب اللہ کی محبت سے سرشار ہوجاتا ہے تو اللہ کی طرف دل کا متوجہ ہونا، یہ دل کے خصوصیات میں شامل ہوجاتا ہے۔

محبت دوطرفہ ہوتی ہے، ایک محبوب کی طرف سے محبت ہوتی ہے، دوم بندے کی طرف سے محبوب کے ساتھ محبت ہوتی ہے تو ایسی محبت وہ سالک کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور وہ ففروالی اللہ (اللہ کے طرف دوڑو) کا منظر پیش کرنے لگتا ہے۔

اس محبت کا ایک نتیجہ مسلمانوں کے لئے الفت اور کافروں کے ساتھ سختی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، اس سلسلہ میں اہل اللہ کی حساسیت قابل دید ہوتی ہے۔

اہل اللہ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی مخالفت کی پرواہ نہیں کرتے، وہ جس راہ پرگامزن ہوتے ہیں، اس راہ میں پیش آنے والی ساری مخالفتوں کو وہ خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہیں، بلکہ وہ مخالفوں کے لئے دل سے دعاگو ہوتے ہیں کہ اللہ انہیں اپنی محبت کی راہ نصیب فرماکر سعادت دارین عطا فرمائے۔

اس آیت میں اللہ سے محبت کی اہمیت بھی بیان فرمائی گئی کہ اگر تم دین سے پھر جاؤگے تو اللہ ایسے افراد پیدا فرمائے گا، جن سے اللہ محبت فرمائے گا اور وہ اللہ سے محبت کریں گے۔

اس آیت میں جو خصوصیات فرمائی گئیں، یہ اہل اللہ کی خصوصیات ہیں، جو راہ سلوک وراہ طریقت میں مستقل مزاجی سے چلنے کا لازمی نتیجہ ہیں۔ (مرتب)

وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ. (سورۃ المائدہ، آیت نمبر۵۵)

(اور زکوٰۃ دیتے ہیں کہ ان میں خشوع ہوتا ہے)۔

ذکر کے وقت کاموں کے ہجوم کا ہونا

اس سے یہ بات بھی ماخوذ ہوسکتی ہے کہ عین ذکر کے دوران کسی ایسے کام کا ہجوم اور

تقاضا ہو کہ اگر اس سے فارغ نہ ہوتو اس کا قلب (پریشانی میں) مشغول رہے تو اس کام سے جلدی فارغ ہوجانا بہتر ہے اور اہل طریقت کے نزدیک یہ معروف ہے۔

تشریح:

ذکر میں استغراق کی حالت بالخصوص متوسط صوفی کی امتیازی شان ہے، متوسط صوفی چاہتا ہے کہ اس کا ایک لمحہ بھی محبوب سے راز ونیاز اور اس کے ذکر کے بغیر نہ گزرے، اس کا جو وقت ذکر کے بغیر گذرتا ہے، وہ بے قراری کے انگاروں پر لیٹنے والا وقت ہوتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ دنیاوی کام اور لوگ، محبوب اور اس کی راہ میں حائل نہ ہوں، چونکہ دنیا میں رہتے ہوئے دنیاوی مسائل سے بچاؤ کی صورت نہیں، اس لئے جب بھی ایسا ضروری کام سامنے آئے، جس سے دل کی محبوب کی طرف سے توجہ متاثر ہو، اس وقت فرد کو ذکر چھوڑ کر اس کام کو نمٹانا چاہئے، ایسا کرنا ضروری ہے، طالب کا راہ سلوک کا سفر اسی طرح چلتا ہے، چونکہ دنیا سے فرار ممکن نہیں ہے، اس لئے متوسط طالب کو جبر کرکے بھی ضروری دنیاوی امور سرانجام دینے ہوتے ہیں۔ (مرتب)

فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ. (سورۃ المائدہ، آیت نمبر۵۶)

(سو اللہ کا گروہ بلاشبہ غالب ہے)۔

قوت قلب کی اہمیت

اگر اس غلبہ کی تفسیر قوت قلب سے کی جائے تو فہم میں آسانی ہوگی، اور اہل اللہ پر چاہے ظاہری مغلوبیت کے اسباب کا کیسا ہی ہجوم ہو، مگر توکل اور تعلق مع اللہ کی وجہ سے ان پر ان کا اثر نہیں ہوتا۔

تشریح:

جہاں ظاہری غلبہ کی ضرورت ہے کہ اس غلبہ سے مسلمانوں کی بہت ساری مصلحتیں وابستہ ہیں، وہاں قلبی طور پر استحکام وغلبہ کی بھی ضرورت ہے، اہل اللہ چونکہ ذکر وفکر کے غیرمعمولی مجاہدوں کی برکت سے قلبی طور پر اللہ کی معیت میں رہتے ہیں، اس لئے بظاہر چاہے حالات کیسے ہی ناسازگار اور ظاہری مغلوبیت کے اسباب ہوں، لیکن ان کے قلبی سکون میں فرق واقع نہیں ہوتا، اس لئے کہ محبوب اپنے محبوں کے دلوں میں انوار حسن کے

ایسے اجزاء رکھ دیتا ہے، جس سے وہ ہر طرح کے حالات میں سکون وسکینت کے ساتھ رہتے ہیں، اس لئے قلبی غلبے کی حالت اللہ کی بہت بڑی نعمت شمار ہوگی۔

اس نعمت سے محروم افراد کے لئے چھوٹے چھوٹے واقعات ان کے دل کے نظام کو درہم برہم کرنے اور ذہنی دباؤ کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ لاَ تَتَّخِذُواْ الَّذِيْنَ اتَّخَذُواْ دِيْنَكُمْ هُزُواً وَلَعِباً. (سورۃ المائدہ، آیت نمبر ۵۶)

(اے ایمان والو، جن لوگوں کو تم سے پہلے کتاب مل چکی ہے انہوں نے اپنے دین کو ہنسی اور کھیل بنا رکھا ہے)۔

اہل اللہ سے تمسخر کرنے والوں
سے جدائی اختیار کرنا

اس میں ایسے شخص سے جدائی اختیار کرنے پر دلالت ہے، جو اہل اللہ اور ان کے طریق پر تمسخر کرتا ہو (مذاق اڑاتا ہو)۔

تشریح:

عقلیت کے غلبہ کے نتیجے میں عام طور پر دل کی صلاحیتوں کا ادراک نہیں ہو پاتا، ایسے افراد عقلیت کے غلبہ اور ظاہری علم کے اثرات کی وجہ سے اہل اللہ سے حاصل ہونے والی اللہ کی معرفت کو نہ صرف یہ کہ سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں، بلکہ وہ اہل اللہ اور ان کے طریق کا تمسخر اڑاتے ہیں، بڑی بڑی دلیلوں سے کام لے کر، ان کا رد کرتے ہیں، انہیں گمراہ قرار دیتے ہیں، ایسے افراد عام طور پر باطنی بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں، ان سے تعلقات کے نتیجہ میں اہل اللہ سے بدظنی پیدا ہوتی ہے اور فرد وافراد راہ محبت ومعرفت سے منقطع ہوجاتے ہیں، اس لئے اس طرح کے افراد سے دوری اختیار کرنا ناگزیر ہے۔

مَن لَّعَنَهُ اللّهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ. (سورۃ المائدہ، آیت نمبر ۶۰)

(اور جن کو اللہ تعالٰی نے دور کردیا ہو اور ان پر غضب فرمایا ہو)۔

دینی مصلحت کی خاطر مخالف
کی بُرائی بیان کرنے کی ضرورت

اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ جب دینی مصلحت ہو تو مخالف کی بُرائی کو اچھی طرح ظاہر کرے، یہ صبر اور حلم کے خلاف نہیں۔

تشریح:

جب دین واہل دین کے خلاف محاذ آرائی کی فضا پیدا ہو اور عام لوگوں کے لئے حق وناحق کو فرق کرنے میں دشواری ہو اور اسلام مخالف افراد نے اسلام کے خلاف بڑا علمی وعملی محاذ کھڑا کردیا، ہو یا اسلام کے نام پر اہل اللہ اور ان کی راہ محبت کے خلاف طوفان برپا کردیا ہو تو اس طرح کے سارے حالات میں مخالف کو بہتر علمی اسلوب میں جواب دینا، وقت کا اہم تقاضا ہے، دینی مصلحت کی خاطر ایسا کرنا ناگزیر ہے، دوسری صورت میں دین کے صحیح تسلسل کو قائم رکھنا دشوار ہوگا۔

فَلاَ تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ. (سورۃ المائدہ، آیت نمبر ۶۸)

(تو آپ ان کافروں پر غم نہ کیا کیجئے)۔

دوری اختیار کرنے والوں پر زیادہ رنجیدہ نہ ہونا

اس میں دلالت ہے کہ اعراض کرنے والے پر زیادہ رنج نہ کیا جائے، جیسا کہ بعض شفقت میں مبالغہ کرنے والے کرتے ہیں۔

تشریح:

حکمت کے ساتھ حق کی بات پہنچانے کے باوجود لوگ اللہ کی راہ محبت اور اصلاح کی طرف راغب نہیں ہوتے اور انکار کی روش ہی پر گامزن رہتے ہیں تو داعی کو ایسے افراد پر زیادہ رنج کرنے کی ضرورت نہیں، شفقت کے جذبہ کے تحت ایسا کرنا بھی صحیح نہیں، اس لئے کہ اس سے تشویش میں اضافہ ہوتا ہے، داعی جب دیکھتا ہے کہ دل سوزی سے ہونے والی اس کی ساری کوششوں کے باوجود افراد کی ضد، سرکشی اور دوری میں اضافہ ہو رہا ہے تو طبیعت میں الجھن پیدا ہوتی ہے، بس داعی کو اصرار کئے بغیر حکمت کے ساتھ اپنا کام جاری رکھنا چاہئے۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَى شَيْءٍ حَتَّى تُقِيمُواْ التَّوْرَاةَ وَالإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيراً مِّنْهُم مَّا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَاناً وَكُفْراً. (سورۃ المائدہ، آیت نمبر ۶۸)

(آپ کہئے کہ اے اہل کتاب تم کسی راہ پر نہیں، جب تک کہ توریت کی، انجیل کی اور جو کتاب تمہارے رب کی طرف بھیجی گئی ہے، اس کی بھی پوری پابندی نہ کروگے، آپ پر جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے بھیجا جاتا ہے وہ ان میں سے بہت سوں کی سرکشی اور کفر کی ترقی کا سبب ہوجاتا ہے)۔

كُلَّمَا جَاءهُمْ رَسُولٌ بِمَا لاَ تَهْوَى أَنْفُسُهُمْ فَرِيقاً كَذَّبُواْ وَفَرِيقاً يَقْتُلُونَ.
(سورۃ المائدہ، آیت نمبر ۷۰)

(جب کبھی ان کے پاس کوئی پیغمبر ایسا حکم لایا، جس کو ان کا جی نہ چاہتا تھا تو بعضوں کو (انہوں نے) جھوٹا بتلایا اور بعضوں کو قتل کر ڈالتے تھے)۔

شریعت کے اتباع کے بغیر چارہ نہیں

پہلی آیت کا حاشیہ یہ ہے۔
اس سے معلوم ہوا کہ شریعت کے اتباع کے بغیر چارہ نہیں۔

ساری بُرائیوں کی جڑ خواہشات نفس کا ہونا

دوسری آیت کا حاشیہ یہ ہے۔
اس آیت میں دلیل ہے اس بات پر کہ سارے بڑے گناہوں کی (جڑ) اصل خواہشات کی پیروی ہے، اس لئے صوفیہ، نفس کی خواہشات کے زور کو توڑنے کے لئے سخت مجاہدے کرتے ہیں۔

تشریح:

یہاں مذکورہ دونوں آیتوں اور ان کے حاشیہ کی ایک ہی جگہ تشریح کی جارہی ہے۔
اسلامی شریعت کا اتباع ایسی چیز ہے، جس کے بغیر نجات کے راستے مسدود ہیں۔
اس سے معلوم ہوا کہ شریعت کے اتباع کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔

یہاں ایک اہم نکتہ جو بیان فرمایا گیا، وہ یہ ہے کہ اللہ کی کتاب کے نزول سے اہل کتاب (جو اپنے دور کے سب سے زیادہ اہل علم تھے اور وہ صدیوں سے حضورﷺ کی تشریف آوری کے انتظار میں مدینہ میں آکر آباد ہوئے تھے) کی سرکشی اور کفر میں زیادہ اضافہ کا سبب بنتا رہا ہے۔

اللہ کے کتاب کے نزول سے اپنے دور کے اہل کتاب کی سرکشی اور کفر میں اضافہ ہوجانا، ایسی بات ہے، جو بہت زیادہ غوروفکر کی حامل ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوا، اس نکتہ پر غوروفکر اس لئے بھی ضروری ہے تاکہ ہر دور کے اہل علم کی نفسیات کا اندازہ ہوجائے کہ ان کی عمومی روش بھی ضد اور سرکشی ہی کی ہوتی ہے۔

دراصل بات یہ ہے کہ جب علم سے منصب اور دولت وابستہ ہوجاتی ہے تو یہ علم حجاب اکبر بن جاتا ہے، اس لئے کہ اس طرح کے علم سے نفسانی خواہشات طاقتور ہوجاتی ہیں اور فرد وافراد کی انانیت اور مفادات کی نفسیات پختہ ہوجاتی ہے (الا ماشاء اللہ) بہت کم صاحبان علم نفسی حجابات سے بلند ہوکر، حق، حقیقت اور شریعت کے حقیقی فہم اور اس کی اتباع کی طرف آتے ہیں، ورنہ عام طور پر سب کچھ سمجھنے کے باوجود سرکشی اور دوری کی روش غالب ہوتی ہے، اہل کتاب کے حالات وروش کے پس منظر میں یہ آیت ہمارے لئے لمحہ فکریہ ہے، شریعت کے اتباع کے بغیر کوئی راہ نہیں، شریعت کی راہ میں نفسی قوتیں حائل ہوتی ہیں، طالبان حق اس کام کو سارے کاموں پر ترجیح دیتے ہیں، اس لئے کہ جب تک نفس کی گرفت مضبوط ہے، تب تک دل کی گہرائیوں میں اللہ کی محبت مستحکم تو کیا ہوتی، قبولیت حق کی استعداد ہی باقی نہیں رہتی، صوفیہ کرام اپنے تجربات کے پیش نظر، یہ سمجھتے ہیں کہ ہر فرد کی نجات اس بات سے وابستہ ہے کہ وہ علم کے ساتھ ساتھ معرفت نفس اور معرفت رب کی طرف توجہ دے اور اس میں اپنی بیشتر توانائیاں صرف کرے، ورنہ علم اور حق وحقیقت کے نام پر نفسی قوتیں فرد وافراد کی گمراہی کا باعث بنیں گی، اور علم انہیں طرح طرح کے تعصبات، ضد اور مفادات میں مبتلا کرکے، ان کی کجی کا باعث بنے گا۔

حق وحقیقت تک رسائی کے سارے راستے معرفت نفس ومعرفت رب سے ہی وابستہ ہیں، اس لئے نفس کو ذکروفکر کے غیر معمولی مجاہدوں سے گذارے بغیر چارہ کار نہیں، بالخصوص جب علم کے ساتھ منصب اور دولت جیسے مفادات بھی وابستہ بھی ہوں تو اس

صورت میں معرفت ازحد ناگزیر ہے۔

محض علم، استدلال اور عقل میں وہ استعداد موجود نہیں ہے کہ وہ نفسی قوتوں کا مقابلہ کرکے، فردوافراد کو حق پر گامزن کرسکے اور ان کی ظاہری وباطنی اصلاح کا ذریعہ بن سکے، علم سے ظاہری اصلاح کی کسی حد تک صورت تو پیدا ہوسکتی ہے، لیکن باطن میں موجود طاقتور درندوں سے بچاؤ کی صورت پیدا نہیں ہوسکتی، انسانیت کی ساری تاریخ اس کی شاہد ہیں، ہاں، جن افراد کی فطرت سلیمہ محفوظ رہی ہے اور جو غیر معمولی طور پر خود احتسابی سے کام لینے کی سعادت سے بہرہ ور رہے ہیں، اس طرح کے افراد کی اصلاح تو ہوجاتی ہے (لیکن ہر دور میں ایسے اہل علم بہت کم رہے ہیں)۔

علم کے نافع ہونے میں کمی کا ایک سبب یہ ہے کہ ہر دور میں فردوافراد عام طور پر علم کو مادی اور دنیاوی مفادات کی تکمیل کے لئے حاصل کرتے ہیں، اگر شروع سے علم کے حصول کا مقصد اللہ کی رضااور اس کی اطاعت کا جذبہ ہوتو اس طرح کی نیت سے فرد کے لئے علم کے ساتھ معرفت کی راہ پر گامزن ہونا آسان ہوجاتاہے، اللہ نیت کو دیکھکر ہی بندوں کے ساتھ معاملات فرماتے ہیں، جب حصول علم کے وقت اور اس کے دوران اور آخر میں نیت میں مفادات غالب ہوں تو ایسا علم نافع کیسے ہوسکتا ہے اور اللہ تک رسائی کا ذریعہ کیسے بن سکتا ہے۔

موجودہ دور میں بھی اہل علم کا عمومی حشر اہل کتاب سے مختلف نہیں، انسانیت مفادات، دولت، تعصبات، نفرت، کدورت، ایک دوسرے کی تحقیر، دوئی ودورنگی یہ ساری چیزیں ایسی ہیں، جو عام طور پر اہل علم میں زیادہ پائی جاتی ہیں، بالخصوص جدید علوم کے حامل افراد تو ان بیماریوں کا مرکز ہیں۔

قرآن کی مذکورہ آیت اہل علم کو جھنجھوڑنے اور بیدار کرنے کے سلسلہ میں مؤثر ترین آیت ہے، جب اہل کتاب (جیسے اہل علم جو صدیوں سے رسول اللہ ﷺ کا انتظار کرتے ہوں) ان کی سرکشی کی حالت یہ ہے تو آج جدیدیت کے حامل اہل علم کی جو حالت ہوسکتی ہے، وہ ظاہر ہے، بلکہ اس کا مشاہدہ ہورہا ہے، علم اگر خالص اللہ کی رضامندی کی نیت سے حاصل ہوتو ایسا علم بابرکت ثابت ہوتا ہے، روزی تو اللہ دیتا ہی ہے، لیکن ساتھ ساتھ اپنی معرفت اور خشیت بھی عطا فرماتا ہے۔

وَحَسِبُواْ أَلاَّ تَكُونَ فِتْنَةٌ فَعَمُواْ وَصَمُّواْ ثُمَّ تَابَ اللّهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُواْ وَصَمُّواْ كَثِيرٌ مِّنْهُمْ وَاللّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ. (سورۃ المائدہ، آیت نمبر ۷۱)

(انہوں نے یہی گمان کیا کہ سزا نہ ہوگی، اس سے وہ اور بھی اندھے اور بہرے بن گئے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر توجہ فرمائی، پھر بھی اندھے اور بہرے بنے رہے یعنی ان میں سے بہت سے اور اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو خوب دیکھنے والے ہیں)۔

گناہوں سے نیکی کی

استعداد کا کمزور ہوجانا

اس میں دلالت ہے کہ گناہوں پر تکرار واصرار سے (نیکی کی) استعداد بالکل کمزور ہوجاتی ہے، اسی کو استعداد کا خاتمہ کہدیتے ہیں (بطلان استعداد)۔

تشریح:

گناہوں کی سب سے بڑی ''خصوصیت'' یہ ہے کہ جب ان کی عادت مستحکم ہوتی ہے تو یہ گناہ مزاج کا حصہ بن جاتے ہیں اور جسم کے ساتھ چسپاں ہوجاتے ہیں، عادت اتنی طاقتور ہے کہ اس سے نجات کا حصول انتہائی مشکل ہے، اس لئے گناہ اگر ہوجائے تو فوراً توبہ کرنی چاہئے، مثلاً اگر نماز نہ پڑھنے کی عادت غالب ہوگئی ہے تو اس عادت کو ختم کرکے، نماز کی طرف راغب ہونا، نفس پر سخت شاق گذرتا ہے، اس کے لئے نفس کے ساتھ شدید معرکہ آرائی کرکے، اس عادت کو ختم کرنا پڑے گا، یہی حالت ہر گناہ کی عادت کے ساتھ ہوتی ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں گناہوں کی عادت سے بچائے اور بروقت توبہ کی توفیق عطا فرمائے اور جن گناہوں کی عادت ہوچکی ہے، اپنے فضل خاص سے ان سے بچاؤ کی صورت پیدا فرمائے۔ (مرتب)

لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُواْ وَعَمِلُواْ الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُواْ إِذَا مَا اتَّقَواْ وَّآمَنُواْ وَعَمِلُواْ الصَّالِحَاتِ ثُمَّ اتَّقَواْ وَّآمَنُواْ ثُمَّ اتَّقَواْ وَّأَحْسَنُواْ. (سورۃ المائدہ، آیت نمبر ۹۳)

(ایسے لوگوں پر کہ جو ایمان رکھتے ہوں اور نیک کام کرتے ہوں، اس چیز میں کوئی گناہ نہیں جس کو وہ کھاتے پیتے ہوں جب کہ وہ لوگ پرہیز رکھتے ہوں اور ایمان رکھتے

ہوں اور نیک کام کرتے ہوں پھر پرہیز کرنے لگتے ہوں اور ایمان رکھتے ہوں اور پھر پرہیز کرنے لگتے ہوں)۔

تقویٰ اور ایمان کے
مختلف درجوں کا ہونا

تقویٰ اور ایمان کے مختلف درجات ہیں، یہ درجات ایک دوسرے سے اوپر ہیں اور سالک انہی درجات میں ترقی کرتا رہتا ہے، ایک سے دوسرے میں، دوسرے سے تیسرے میں، اسی طرح چڑھتا رہتا ہے، اور اس کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔

تشریح:

ایمان اور تقویٰ کے درجات اتنے زیادہ ہیں کہ شمار سے باہر۔ فرد جب ایمان اور تقویٰ میں ارتقا کی راہ پر چلتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ محبوب کے ساتھ قرب کے اب تک جو مقامات اسے حاصل ہوئے، وہ قرب کی موجودہ حالت سے تو فروتر تھے، اس وقت اسے احساس ہوتا ہے کہ تقویٰ وایمان کے بلند سے بلند تر درجات کا حصول اس کی ذاتی کوششوں سے ممکن نہیں، اگر اللہ کی طرف سے فضل خاص ہوتو وہ ایمان اور تقویٰ کی بہتر حالت تک رسائی حاصل کرسکتا ہے۔ (مرتب)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لاَ يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ .
(سورۃ المائدہ، آیت نمبر۱۰۵)

(اے ایمان والوں اپنی فکر کرو جب تم راہ پر چل رہے ہوتو جو شخص گمراہ ہے تو اس سے تمہارا کوئی نقصان نہیں)۔

بُرائی کے حامل فرد کے پیچھے پڑنے کے نقصانات

کسی کو بُرائی میں دیکھ کر اس کو اچھائی کا حکم کردینا اور برائی سے منع کرنا کافی ہے، پیچھے پڑجانا درست نہیں، اور زیادہ افسوس بھی نہیں کرنا چاہیے کہ یہ کیوں ٹھیک نہیں ہورہا ہے، بس ہمارا کام بتا دینا ہے، کرنا نہ کرنا اس کے اختیار میں ہے۔

تشریح:

اکثر دیکھا گیا ہے کہ فرد اپنے حلقہ احباب یا جاننے والوں میں برائی کو دیکھ کر اس

فرد کے پیچھے پڑجاتا ہے، حالانکہ اس فرد کو حکمت سے ایک دو بار متوجہ کرنے کے بعد اسے چھوڑ دینا چاہیے، اس کے پیچھے ہرگز نہ پڑنا چاہیے، اس لئے کہ اس سے دو نقصانات ہوتے ہیں، ایک یہ کہ نفسانیت کے ابھرنے کا خطرہ درپیش ہوتا ہے، اگرچہ شروع میں اخلاص ہوتا ہے، لیکن یہ اخلاص آہستہ آہستہ نفسانیت میں تبدیل ہوجاتا ہے، دوم یہ کہ اس سے دشمنی اور عداوت کی فضا پیدا ہونے لگتی ہے، اس لئے حقیقی اہل اللہ کسی کے درپے نہیں ہوتے، البتہ بہتر طور پر حکمت سے توجہ دلانا اور بُرائی سے روکنے کی کوشش کرنا، داعی کی ذمہ داریوں میں شامل ہے، دین کا تسلسل اس بات کا متقاضی ہے کہ حکمت وبصیرت سے دعوت کا کام ہوتا رہے، اس میں غلو اور بہت زیادہ اصرار اور پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں، پیچھے پڑنے سے فوائد سے زیادہ نقصانات ہوتے ہیں۔ (مرتب)

الْحَمْدُ لِلّهِ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمَاتِ وَالنُّورَ. (سورۃ الانعام، آیت نمبر۱)

(ساری تعریفیں اللہ کے لئے لائق ہیں، جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تاریکیوں کو نور بنایا

اللہ کی تعریف کو اسم ذات سے وابستہ کرنا

حمد کو اسم ذات سے وابستہ کرنا پھر اس کو خاص صفات کے ساتھ موصوف کرنا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو حمد (تعریف) کا حق دو اعتبار سے ہے، ایک ذات کی حیثیت سے، دوسرے صفات کی حیثیت سے اور ذات کی حیثیت کے معنی صفات کی نفی نہیں، بلکہ اس کے معنی ہیں کہ اس وقت صفات کی طرف نظر نہیں جاتی۔

تشریح:

اس میں راہ سلوک کا ایک اہم مسئلہ بیان ہوا ہے کہ سالک اللہ سے اپنے تعلق کے استحکام کے لئے عرصہ تک اللہ کے اسم ذات کے ذکر میں محو ہوتا ہے، اسم ذات کے ذکر میں اس کی فنائیت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ اللہ کے صفاتی ذکر کی طرف اس کی توجہ نہیں ہوپاتی یا اشیائے کائنات پر غور وفکر کے ذریعہ اللہ کی صفات کے استحضار کے لئے اس کا دل راغب نہیں ہوتا، سبب یہ ہے کہ اسم ذات کی کشش نے اس کو اپنی طرف اس طرح

متوجہ کیا ہوا ہوتا ہے کہ اس کا دل اسم ذات میں موجود انوار حسن کے اخذ پر فریفتہ ہے، چونکہ اللہ کے انوار حسن، اسم ذات ہی سے وابستہ ہے، اس لئے سالک اسم ذات کے ذکر میں فنا ہوجاتا ہے اور اس ذکر میں انوار اسے دوسری طرف جانے ہی نہیں دیتے، اگرچہ وہ ضروری دینی فرائض سرانجام دیتا ہے، لیکن اس کا دل اسم ذات میں موجود انوار کی طرف اٹکا ہوا ہوتا ہے، اس کے بغیر وہ رہ نہیں سکتا، اس کا سارا سکون اور ساری راحت وحلاوت اسم ذات کے ذکر سے ہی وابستہ ہوتی ہے، محبوب کے اسم ذات کے ذکر نے اسے اس طرح فریفتہ کیا ہوتا ہے کہ سالک کا دل ہمہ وقت بس یہی چاہتا ہے وہ محبوب کے انوار حسن کے حصول میں مشغول ہو، جوں ہی اس شغل میں کمی واقع ہونے لگتی ہے تو اس کے دل میں ماتم برپا ہونے لگتا ہے، یہ متوسط سالک کی حالت ہوتی ہے، جب دل عرصہ تک اسم ذات میں غوطہ زنی کی وجہ سے نفسی قوتوں کو شکست دے کر، اسم ذات کے انوار حسن کو دل کی گہرائیوں میں مستحکم کرنے میں کامیاب ہوتا ہے تو اس کے بعد کہیں جا کر اللہ کی صفات کی طرف اس کی توجہ ہوتی ہے، اب اللہ کی صفات پر غور وفکر اس کے لئے عبرت وموعظت کا ذریعہ ثابت ہوتی ہے، سالک شروع میں بیک وقت اسم ذات اور صفات کی طرف توجہ دینے کی اہلیت کا حامل نہیں ہوتا۔

یہ نکتہ راہ سلوک میں غلطاں اور مستغرق ہونے والے سالکوں ہی کے لئے ہے کہ ان کی یہی حالت ہوتی ہے، وہ اسم ذات کے ذکر کے ذریعہ نفس کی بڑی حد تک پامالی کے بعد ہی صفاتی ذکر پر آتے ہیں یا اشیائے کائنات میں موجود صفات پر غور وفکر کی طرف آتے ہیں۔

''مسائل السلوک'' میں اس نکتہ کو شامل کرنے سے غالباً حضرت مولانا کا مقصود یہی ہے کہ راہ سلوک کے طالبوں کو تسلی دی جائے کہ اسم ذات میں ان کا انہماک اور صفات سے عدم انہماک یہ کوئی نقص نہیں ہے، بلکہ راہ سلوک کی تحصیل کی ترتیب یہی ہے۔

اہل اللہ کے بیشتر سفر کا انحصار اسم ذات کے ذکر سے ہی ہوتا ہے، لا الہ الا اللہ کے ذکر کا اصل جوہر بھی اللہ ہی ہے، جو اسم ذات ہے، اس لئے ایک اعتبار سے لا الہ الا اللہ کے ذکر کا مطلب بھی سب کی نفی کر کے، اسم ذات کے ذکر کا استحضار اور اس کا غلبہ ہوتا ہے۔

جب اسم ذات کا ذکر دل کا حصہ بن جاتا ہے اور اسم ذات کے کثرت ذکر سے نفس کے اندر موجود بتوں کا قلہ قمع ہوجاتا ہے اور نفس کے اندر موجود گندگی کے ڈھیروں کی صفائی ہوجاتی ہے تو طالب کا کام بن جاتا ہے اور اس کی شخصیت، سکون، سکینت اور حلاوت سے سرشار ہوجاتی ہے اور وہ اخلاق حسنہ کا حامل ہوجاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نفس کے تزکیہ میں اہل اللہ کی صحبت کے ساتھ اسم ذات کا کردار سب سے زیادہ اہم اور فیصلہ کن کردار ہوتا ہے، اس لئے کوئی بھی طالب اسم ذات پر محنت کئے بغیر مقامات طے نہیں کرسکتا۔

سالک کی اسم ذات کی طرف محویت کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ اس کے دل کی غذا ہی اسم ذات میں موجود تجلیات ہیں، دل، اسم ذات میں موجود انوار حسن پر اس طرح ٹوٹ پڑتا ہے کہ عرصہ تک وہ دوسری چیزوں کی طرف مبذول ہی نہیں ہو پاتا، اس لئے کہا جاتا ہے کہ دل کی حیاتی اللہ کے اسم ذات کے ذکر سے ہی وابستہ ہے، البتہ منتہی سالک کے دل کی استعداد بڑھ جاتی ہے، اس کی مزید ترقی صفاتی ذکر اور صفات پر غور وفکر وغیرہ سے ہوتی ہے، وہ ذات سے صفات کی طرف آتا ہے۔

سلوک میں یہی ترتیب ہے، جو راہ سلوک ومحبت کے طالبوں کے پیش نظر ہوتی ہے۔

وَلَوْ أَنزَلْنَا مَلَكاً لَّقُضِيَ الأَمْرُ ثُمَّ لاَ يُنظَرُونَ. (سورۃ الانعام، آیت نمبر ۸)

(اور اگر ہم کوئی فرشتہ بھیج دیتے تو سارا قصہ ہی ختم ہوجاتا پھر ان کو ذرا مہلت نہ دی جاتی)۔

کرامات کا ظاہر نہ ہونا بہتر ہے

اس صورت میں ان کے ہلاک ہونے کی وجہ یہ ہوتی کہ ایسی کرامات کے ظاہر ہونے سے ان پر اللہ کی حجت پوری ہوتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ کرامات کا ظاہر نہ ہونا ہی بہتر صورت ہے۔

تشریح:

تصوف میں بزرگ سے کرامات کی امید رکھنا، آج کل اسی کو بزرگی سمجھا جانے لگا ہے، حالانکہ اصل بزرگی اسلامی شریعت پر استقامت سے چلتے رہنا ہے اور طالبوں

کی تربیت وتزکیہ کا فریضہ سرانجام دینا ہے۔(الاستقامتہ فوق الکرامتہ) بدقسمتی سے موجودہ دور میں تصوف عام طور پر کشف اور کرامتوں کا نام بن گیا ہے، جن بزرگوں کے ہاں یہ چیزیں نہیں ہیں، انہیں بزرگ ہی نہیں سمجھا جاتا، یہ تصوف کی حقیقت اور نوعیت کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے، بزرگ سے کرامت کا مطالبہ کرنا تو اس بات کی علامت ہے کہ طالب کرامتوں کا طالب ہے، اس میں اپنی اصلاح کی حقیقی طلب موجود نہیں، اصلاح کی طلب موجود ہوتی تو وہ بزرگ کی سب سے بڑی کرامت یہ محسوس کرتا کہ اس کی صحبت سے اس کا دل زندہ ہوگیا ہے اور دل کی زندگی کی وجہ سے وہ ذوق وشوق سے راہ محبت میں چل رہا ہے۔ (مرتب)

وَاجْتَبَيْنَاهُمْ وَهَدَيْنَاهُمْ إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ. (سورۃ الانعام، آیت نمبر ۸۷)

(اور ہم نے ان کو مقبول بنایا اور ہم نے ان کو راہ راست کی ہدایت کی)۔

جذب وسلوک

بعض دفعہ اللہ کا قرب پہلے حاصل ہوجاتا ہے، جس سے عبادت وریاضت کا شوق پیدا ہوجاتا ہے اور بعض دفعہ پہلے عبادت وریاضت ہوتی ہے، پھر قرب الٰہی ملتا ہے، پہلے کو جذب دوسرے کو سلوک کہتے ہیں۔

تشریح:

نقشبندی سلسلہ میں شروع میں جذب حاصل ہوتا ہے،جس سے عبادات کا ذوق وشوق پیدا ہوتا ہے، کیفیات پاکیزہ ہوتی ہیں، اسلامی شریعت پر عمل پیرا ہونے کے سلسلہ میں حساسیت پیدا ہوجاتی ہے، لیکن جلد ہی طالب کی یہ حالت ختم ہوجاتی ہے اور اس کے مجاہدوں کا عمل شروع ہوجاتا ہے، ان مجاہدوں سے وہ رفتہ رفتہ اور بتدریج نفس کی مکر وفریب کی ساری واردات سے آشنا ہوجاتا ہے، دوسرے سلسلوں میں بھی ایسا ہوتا ہوگا، بعض صاحب جذب افراد ایسے ہوتے ہیں، جو زندگی بھر حالت جذب میں رہتے ہیں۔ (مرتب)

وَلَوْ أَنَّنَا نَزَّلْنَا إِلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتَى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا. (سورۃ الانعام، آیت نمبر ۱۱۱)

(اور اگر ہم ان کے پاس فرشتوں کو بھیج دیتے اور ان سے مُردے باتیں کرنے لگتے اور ہم تمام موجودات (غیب) کو ان کے پاس ان کی آنکھوں کے روبرو لاکر جمع کردیتے تب بھی یہ لوگ ایمان نہ لاتے)۔

اصلاحی تعلق کے لئے کرامت کی شرط کا غلط ہونا

کرامت نظر آئے گی تو میں اصلاحی تعلق قائم کروں گا، درست نہیں، کیونکہ کرامات کے دیکھنے سے ضروری نہیں ہے کہ نفع بھی ہوجائے، جس طرح انبیاء کرام کے معجزات دیکھکر بھی لوگوں نے انکار کیا اور ان کو جادوگر کہا تو فرد صرف شیخ کا علم وعمل دیکھ کر اس سے تعلق قائم کرے۔

تشریح:

موجودہ دور میں عام طور پر بزرگی کا معیار ہی کشف وکرامات ہی ہوگیا ہے، بزرگوں سے وابستہ افراد کی عام طور پر حالت یہ ہے کہ ان کی کوئی نشست خالی نہیں ہوتی کہ اپنے اپنے بزرگوں کے کشف وکرامات کے واقعات بیان کرنے میں وقت صرف نہ کرتے ہوں، حالانکہ حقیقی تصوف میں کشف وکرامات کو سرے سے قابل ذکر اہمیت ہی نہیں۔ اصل اہمیت تقویٰ اور سیرت وکردار کی پاکیزگی اور ہر سنت پر عمل پیرا ہونے کو حاصل ہے، اگر یہ نہیں تو ہزاروں کشف بھی حاصل ہوں تو لاحاصل ہے۔ (مرتب)

وَذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ. (سورۃ الانعام، آیت نمبر ۱۲۰)

(بچو ظاہری گناہوں سے بھی تو باطنی گناہوں سے بھی)۔

گناہوں کی دو قسمیں ظاہری اور باطنی گناہ

اس سے ظاہر ہوا کہ گناہ جس طرح (جوارح سے) ظاہری ہوتے ہیں، اسی طرح بعض گناہ قلب سے بھی ہوتے ہیں۔

تشریح:

اس آیت میں ظاہری اور باطنی دونوں گناہوں سے بچنے کی تلقین فرمائی گئی ہے، طالب جب کسی اہل اللہ سے رجوع ہوکر اس کا دیا ہوا ذکر وفکر شروع کردیتا ہے تو وہ یہ

دیکھکر حیرت زدہ ہوجاتا ہے کہ وہ اب تک تو ظاہری گناہوں ہی کو سب کچھ سمجھتا تھا، لیکن اب پہلی بار اس پر باطن کی وسیع دنیا منکشف ہونا شروع ہوجاتی ہے اور اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ تو باطنی گناہوں کی دلدل میں مبتلا تھا، جس کا اسے پہلے ادراک ہی نہیں تھا، حسد، جلن، حب جاہ وحب مال، اور دوسروں کی تحقیر جیسی بڑی بڑی باطنی بیماریاں تو اس کی شخصیت کا حصہ رہی ہے، وہ جوں جوں ذکر وفکر کی دنیا میں آگے بڑھتا جاتا ہے، اسی حساب سے اس کے لئے باطنی گناہوں سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوجاتی ہے، بہت سارے ظاہری گناہ بھی دراصل باطنی گناہوں اور باطن کی خرابی کا نتیجہ ہی ہوتے ہیں، باطن کی اصلاح ہونے کی وجہ سے ظاہری گناہوں سے اس کے بچاؤ کی صورت پیدا ہوجاتی ہے، اللہ کی راہ محبت سے باہر کے افراد کو عام طور پر باطن کی وسیع دنیا کا ادراک ہی انہیں ہوپاتا، جس کی وجہ سے وہ ساری زندگی مزاج کی سختی، ضد کی نفسیات اور حب جاہ جیسی بیماریوں میں گذارنے میں صرف کردیتے ہیں۔

قرآن کی اس آیت میں باطنی گناہوں کے بارے میں انتباہ دے کر ہمیں باطنی اعتبار سے بیدار ہونے پر اکسایا گیا ہے، تاکہ باطن میں موجود گندگی کی صفائی وپاکیزگی کی صورت پیدا ہوسکے اور فرد اپنی ذات اور معاشرے کے لئے باعث برکت بن سکے، اور آخرت میں اللہ کے یہاں باطن کی پاکیزگی کی وجہ سے سرخرو ہوسکے۔

باطنی بیماریوں کا مرکز باطن کی وسیع دنیا ہے، جہاں سے جذبات اور خواہشات کے طوفان نکل کر فرد کو زیر وزبر کرتے رہتے ہیں، باطن کی اصلاح کی کوششوں کے بغیر باطنی بیماریوں کے اس مرکز کی اصلاح نہیں ہوسکتی، باطن کی اس غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر امام غزالی نے لکھا ہے کہ جو فرد باطنی علم کے اجزاء سے محروم ہے، مجھے اس کے ایمان بالخیر کے خاتمہ کے بارے میں شک ہے، یہ بہت اہم نکتہ ہے، جو راہ محبت میں چلنے کے نتیجہ میں فرد پر پوری طرح آشنا ہوتا ہے، چنانچہ اللہ کا طالب ظاہری اصلاح کے ساتھ ساتھ باطنی اصلاح کی کاوشوں میں بھی مصروف ہوتا ہے۔(مرتب)

أَوَ مَن كَانَ مَيْتاً أَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُوراً يَمْشِي بِهِ النَّاسِ كَمَن مَّثَلُهُ الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا. (سورۃ الانعام، آیت نمبر ۱۲۲)

(کیا جو شخص پہلے مردہ تھا، ہم نے اسے زندہ بنادیا اور ہم نے اسے ایسا نور دیا جس

کی روشنی میں وہ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے، کیا وہ اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جو تاریکیوں میں بھٹکتا پھرتا ہے ان سے نکلے نہیں پاتا)۔

طریق حق کی معرفت کو نور قرار دینا

اس میں طریق حق کی معرفت کو نور فرمایا ہے، یہ استعمال صوفیہ کے ہاں معروف ہے۔

تشریح:

اس آیت میں دنیا میں دو طرح کے افراد کا ذکر فرمایا گیا ہے، ایک نور میں چلنے والے افراد، دوسرے تاریکیوں میں بھٹکنے والے افراد، نور ایمان سے دلیں شاداب ہوتی ہیں، تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں، اعمال صالحہ کی قوت میں اضافہ ہوجاتا ہے، فرد کی حلاوت سے سرشار زندگی شروع ہوجاتی ہے، اس میں ہر طرح کے حالات کے مقابلے کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے، خیالات میں پاکیزگی آجاتی ہے، نئے نئے قیمتی نکات (جو عملی زندگی میں اس کے لئے رہنما ثابت ہوتے ہیں) وہ القا ہوتے رہتے ہیں، دل کی روشنی کی وجہ سے فرد کی ذہنی سطح بلند ہوجاتی ہے، اس کے دل پر ہر معاملہ کے خیر وشر کے پہلو واضح ہوجاتے ہیں اور خیر پر عمل پیرا ہونے کی استعداد پیدا ہوتی ہے، جب کہ شر سے بچاؤ کے سلسلے میں اس میں ہمت وحوصلہ کی استعداد آجاتی ہے۔

نور ایمان کی ایک تو مدہم سی حالت ہوتی ہے کہ فرد کے لئے ہر منکر سے بچاؤ کی صورت پیدا نہیں ہوتی، نور ایمان کی یہ حالت اگرچہ کفر کے مقابلے میں ہزار گنا زیادہ بہتر ہے، لیکن یہ نور ایمان کی بالکل ابتدائی حالت ہے، جسے زیرو کے بلب کی روشنی سے مشابہت دی جاسکتی ہے۔

اس آیت میں نور ایمان کی جس حالت کا ذکر فرمایا گیا ہے، وہ نور کی ایسی طاقتور حالت ہے، جس میں فرد لوگوں کے درمیاں چلتا پھرتا ہے اور اپنے نور کی کرنیں بکھیرتا رہتا ہے، یہ نور فرد کی نئی طاقتور زندگی کا ذریعہ بنتا ہے۔

قرآن میں ایک جگہ ہے: "**يَهْدِىْ اللّٰهُ لِنُورِهِ مَن يَشَاءُ**" (اللہ تعالیٰ جسے چاہتے ہیں، اپنے نور سے فیضیاب کرتے ہیں)

دوسری جگہ ہے: "**وَمَن لَّمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نُوراً فَمَا لَهُ مِن نُّورٍ**" (اللہ تعالیٰ جسے نور نہیں دینا چاہتا اس کے لئے کوئی نور ہی نہیں)۔

اللہ کی طرف سے حاصل ہونے والا یہ نور جب شخصیت کی گہرائیوں میں داخل ہوتا ہے تو وہ نفس، شیطان اور مادیت کی پیدا کردہ ظلمات وتاریکیوں سے دوری کا ذریعہ بنتا ہے، جہاں یہ نور آیا، وہاں ظلمات راہ فرار اختیار کرتی ہیں۔

نور کی توضیح میں نکتہ بیان ہونا ضروری ہے کہ یہ اسم ذات کی تجلی ہے، جو ایمان پر محنت کے نتیجہ میں بندہ کے دل کی گہرائیوں میں داخل ہوتی اور آہستہ آہستہ مستحکم ہوتی جاتی ہے، یہ تجلی صرف اہل ایمان کو نصیب ہوتی ہے، جو اللہ سے والہانہ محبت واطاعت کے نتیجہ میں ارتقا پذیر ہوتی ہے، اس تجلی کے نتیجہ میں فرد کو ایک نئی زندگی عطا ہوتی ہے، اس کا دل روشن سے روشن تر ہوجاتا ہے، اس کے اخلاق بلند ہونے لگتے ہیں، وہ اللہ کے لئے سراپا محبت بن جاتا ہے، دنیا کے حوالے سے اس کا دل سرد ہونے لگتا ہے، اللہ کی تجلیات کی یہ شعائیں فرد کے دل اور اس کی شخصیت کا اس طرح گھیراؤ کردیتی ہیں کہ زندگی بھر وہ ان تجلیات کی روشنی میں اپنے معاملات سرانجام دینے لگتا ہے، چونکہ اللہ کی یہ تجلیات اپنے ساتھ اللہ کے انوارحسن کے اجزاء بھی لاتی ہیں، اس لئے حسن کے یہ اعلیٰ اور پاکیزہ اجزا اس کے حسن کے سارے احساسات وجذبات کی تسلی وتشفی کے لئے کافی وشافی ثابت ہوتے ہیں، چنانچہ مادی حسن اسے اپنی طرف کھینچنے میں ناکام ثابت ہوتا ہے، اللہ کا یہ نور دراصل اللہ کے لئے مجاہدوں ہی سے حاصل ہوتا ہے، مجاہدے جب اس مقام تک پہنچتے ہیں، جہاں فرد حالت فنا سے حالت بقا میں آتا ہے تو اللہ کی تجلیات اور اس کی شعائیں فرد کے دل کا حصہ بن جاتی ہیں، جس سے توجہ الی اللہ کے قرب کے مقامات (جو نہ ختم ہونے والے ہیں) وہ طے ہوتے رہتے ہیں۔

اللہ کی تجلیات کی ان شعاؤں کے اثرات اور اس کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے حسن کے احساسات کا اگر فرد وافراد کو معمولی ادراک بھی حاصل ہوجائے تو وہ ان سے فیضیاب ہونے کے لئے مجنوں وار ہوکر، اللہ کے لئے مجاہدوں میں مصروف ہوجائے اور مادی حسن اور دنیا ودولت کے فریب اور اس کی حسرتوں واداؤں سے بلند ہوجائے، بلکہ ان غلامانہ اداؤں سے آزاد ہوجائے۔

قرآن کی مذکورہ بالا آیت میں اللہ کے نور سے محرومی کو مردہ انسان سے تشبیہ دی گئی ہے، جو بالکل صحیح تشبیہ ہے، اس لئے کہ اس طرح کے فرد کا دل مردہ ہوتا ہے، وہ مادی حسن کی اشیاء پر فریفتہ ہوتا ہے، ہر طرح کے مادی حسن سے بہرہ وری کے باوجود اس کا سکون غارت ہوجاتا ہے، وہ اپنے کردار وروش سے اللہ کے بندوں کے لئے عذاب ثابت ہوتا ہے۔

فرد اور افراد معاشرہ کی دنیا اوآخرت کی نجات اس بات سے وابستہ ہے کہ وہ مردگی کی اس حالت سے نکلنے کی کوشش کرے، اس کی صورت یہ ہے کہ اللہ کے کثرت ذکر سے کام لے اور اس کے لئے ہرممکن حد تک مجاہدوں وریاضتوں کی مشقت کرے۔

اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ سَيُصِيبُ الَّذِينَ أَجْرَمُوا صَغَارٌ عِندَ اللَّهِ. (سورۃ الانعام، آیت نمبر۱۲۴)

(اس موقع کو تو اللہ ہی خوب جانتا ہے جہاں جہاں اپنا پیغام بھیجتا ہے۔ عنقریب ان لوگوں کو جنہوں نے یہ جرم کیا ہے اللہ کے پاس پہنچ کر ذلت پہنچے گی)۔

کمال استعداد کا حاصل ہونا

یعنی منصب رسالت کا تعلق کثرت مال واولاد اور دنیوی سامان نہیں ہے، بلکہ کمال استعداد ہے جس سے نفس قدسیہ پر رسالت کا فیضان ہوجاتا ہے، روح میں مذکور ہے اور اس کا خلاصہ یہی ہے، پس اس میں دلالت ہوئی کہ استعداد فیضان کی شرط عادی ہے۔

حافظ صاحب نے اس کا حاشیہ کا خلاصہ اس طرح بیان فرمایا ہے:

شیخ سے استفادہ کے لئے استعداد کا ہونا ضروری ہے

شیخ کی صحبت سے استفادہ کے لئے ضروری ہے کہ استعداد بھی ہو، اگر استعداد نہ ہوگی تو فائدہ حاصل نہ ہوگا، اس لئے سارے مریدین اس درجہ تک نہیں پہنچتے، جہاں تک بعض پہنچ جاتے ہیں، اس لئے بعض کو ہی خلافت ملا کرتی ہے۔

تشریح:

استفادہ کی صلاحیت سے مراد اللہ کی محبت کے کام کو فیصلہ کن اہمیت دینا، اس کے لئے صحبت اور ذکر وفکر کے مجاہدوں کے لئے وقت دینا اور اس کام کو دوسرے سارے

کاموں پر ترجیح دینا ہے، یہ استعداد، طلب اور وقت دینے سے اللہ کے فضل خاص سے پیدا ہوجاتی ہے، لیکن عام طور پر کاروباری اور معاشی مصروفیات کی وجہ سے فرد کے لئے وقت نکالنا دشوار ہوجاتا ہے، چنانچہ راہ سلوک میں باقائدہ چلنے کی فرد کی استعداد متاثر ہوتی ہے، اس لئے خلافت کے مقام تک بہت کم افراد پہنچ پاتے ہیں۔ موجودہ دور میں ساری سرگرمیوں کا مرکز معاشی مصروفیات ہوگئی ہیں، جس کی وجہ سے راہ سلوک میں آنا اور پھر کچھ نہ کچھ مجاہدوں سے کام لینے کی استعداد ضعیف ہوگئی ہے، معاشرے میں بہت کم افراد ہیں جن پر اللہ کی محبت کی فکر غالب ہو اور جو اس کام کے لئے قابل ذکر وقت نکالنے کے لئے تیار ہوں، استعداد اگرچہ اللہ کے فضل سے ہی حاصل ہوتی ہے، لیکن اللہ کا یہ فضل افراد کی طلب اور ان کی تڑپ سے ہی وابستہ ہوتا ہے، اللہ کی راہ محبت میں چلنے سے انکار کے نتیجہ میں فرد کے لئے نفسی قوتوں کا ادراک، ان سے بچاؤ کی صورت کا پیدا ہونا اور زندگی کے سارے معاملات میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی سعادت کا حاصل ہونا مشکل ترین کام ہوتا ہے، ھمالیہ پہاڑ پر چڑھنے کے مترادف۔ جب کہ اللہ کی محبت سے یہ سارے کام آسان ہونے لگتے ہیں۔ (مرتب)

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ. (سورۃ الانعام، آیت نمبر ۱۶۲)

(آپ فرمادیجئے کہ بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا، سب خالص اللہ ہی کے لئے ہے، جو مالک ہے سارے جہانوں کا)

توحید کامل کے تقاضے

یہ توحید کامل پر دلالت ہے کہ سارے احوال خواہ شرعی ہوں یا تکوینی، ان کے سامنے سرتسلیم خم کرنا اور انہیں ماننا، عمل اور اطاعت سے بھی تو رضا بالقضا سے بھی۔

تشریح

اس آیت میں بندہ مؤمن کا پورا دستور العمل بیان ہوا ہے، جو توحید کامل کا دستورالعمل ہے، جس کے تحت اس کی ساری زندگی اور زندگی کے سارے اہداف اللہ کی اطاعت وعبادت سے وابستہ ہیں اور زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے، جو اس سے خالی ہو۔

توحید کامل یہی ہے کہ بندہ عبدیت کی راہ اختیار کرے، اللہ کے سامنے سرتسلیم خم کرے اور اللہ کی رضا پر راضی رہنے کی نفسیات ومزاج کا حامل ہوجائے۔

بندہ اللہ کا غلام ہے اور غلام کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی، وہ اپنی مرضی کو اپنے مالک ومولی کی مرضی میں مدغم کرچکا ہوتا ہے اور اس کے احکامات کے سامنے دل سے امنا صدقنا کہنا اس کا مقصدِ زندگی ہوتا ہے۔

بندہ مؤمن اپنا دل اللہ کو دے چکا ہوتا ہے، اس دل میں دوسری ساری محبتیں اس محبت کے مقابلے میں مغلوب ہوجاتی ہیں، بندہ مؤمن، اللہ کی عبادت اور اس کی اطاعت کے لئے اپنے آپ کو وقف کرچکا ہوتا ہے، بلکہ وہ اپنے نفس اور جسم کو اللہ کی اطاعت وعبادت کا خوگر بناتا ہے، توحید کے تقاضے اور عبدیت کی بجاآوری کے آداب اس کے بغیر پورے نہیں ہوتے۔

بندہ مؤمن رضا بالقضا کے مقام پر بھی فائز ہوتا ہے کہ اللہ کی چاہت اس کی چاہت بن جاتی ہے، اللہ اسے جس حالت میں بھی رکھے، وہ اس حالت پر مطمئن ہوتا ہے اور وہ اپنے لئے کسی بھی مقام ودرجہ کی چاہت سے مکمل طور پر دستبردار ہوجاتا ہے۔

تفویض اور خودسپردگی کا یہ ایسا مقام ہے، جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں بندہ مؤمن کو حاصل ہوتا ہے، لیکن اس مقام تک رسائی کے لئے بندہ مؤمن کو عرصہ تک نفسی قوتوں کو پامال کرنا پڑتا ہے اور اس کے لئے غیرمعمولی مجاہدوں سے کام لینا پڑتا ہے۔

یہ آیت جہاں بندہ مؤمن کے لئے دستور العمل متعین کرتی ہے، وہاں اللہ کے لئے اپنے آپ کو فنا کرنے کے مجاہدوں پر بھی اکسانے کا موجب بنتی ہے کہ جب تک نفسی قوتوں کے کچھ بھی اجزاء موجود ہیں، اس مقام تک رسائی اور خالص اللہ کے لئے ہوجانے کی منزل کا حصول دشوار تر ہوتا ہے، یہ مقام نفس کی کامل فنائیت سے وابستہ ہے کہ نفسی خواہشات کی فنائیت کے بعد فرد کو اللہ کے ساتھ حالت بقا کی سعادت حاصل ہو، جہاں اللہ کی عبادت واطاعت میں حائل دشواریاں بڑی حد تک مضمحل ہوجاتی ہیں اور رضا بالقضا کی حالت مستحکم ہونے لگتی ہے۔

یہ آیت اس اعتبار سے بندہ مؤمن کو سراپا مجاہدوں پر اکسانے کا ذریعہ ہے کہ جب

تک اسے کامل توحید کا مقام حاصل نہ ہو (جس کی علامتیں آیت میں بیان فرمائی گئیں) تب تک وہ کامل توحید کے مقصد کے حصول کے لئے مسلسل مجاہدوں سے کام لے اور آرام، سکون اور تھکنے کا نام ہی نہ لے، یہ بات واضح ہے کہ کامل توحید یا اللہ کے سامنے کامل سپردگی اختیار کرنے کا مقام بیک وقت حاصل نہیں ہوسکتا، اس کے لئے نفس کو اس راہ پر بتدریج لانا پڑتا ہے، جب مجاہدوں کا عمل شروع ہوگا تو انشاء اللہ ایک وقت ایسا آئے گا، جب بندہ مؤمن اللہ کے لئے مکمل طور پر یکسو ہوجائے گا، اس کے لئے اللہ کی عبادت واطاعت آسان ہوجائے گی اور اللہ کی رضا پر راضی رہنا اس کے مزاج کا حصہ بن جائے گا۔

اس آیت میں اللہ کو بندے سے جو چیزیں مطلوب ہیں، اس کی تفصیل بھی آگئی، بندہ کی سعادت دارین اس بات سے وابستہ ہے کہ وہ اللہ کو اپنا مقصود بنالے اور اپنی ساری چاہتوں سے دستبردار ہوجائے، اس منزل تک تحصیل کے دوراں اس سے جو غلطیاں سرزد ہوں گی، وہ انشاء اللہ اس سے معاف ہوں گی، اس لئے کہ نفس، شیطان اور مادیت پر مشتمل ماحول سے مقابلہ کرکے، خالص اللہ کے ہوجانے کے لئے بندہ کو روزانہ گرکر اٹھنا پڑتا ہے اور گرنے اور اٹھنے کا یہ عمل برسوں تک جاری رہتا ہے، توحید خالص تک رسائی کی یہی ترتیب وتدریج ہے۔

اللہ کو بندے کے وہ مجاہدے بہت زیادہ پسند ہیں، جو وہ اس کی ذات تک رسائی اور اس کے وصول کے لئے کرتا ہے، یہ مشاہدے کی بات ہے کہ جو شخص زندگی میں اپنے لئے مادی دنیا کے حوالے سے بڑا مقصد متعین کرچکا ہوتا ہے، مثلاً بڑا تاجر، بڑا صنعتکار، بڑا سیاستدان، بڑا ڈاکٹر وغیرہ بننے کا ہدف، تو ایسا فرد اپنی ساری ذہنی وعملی توانائیاں اس مقصد میں صرف کرتا ہے اور اس کے لئے شب وروز مجاہدوں سے کام لیتا ہے اور بہتر سے بہتر منصوبہ بندی سے کام لیتا ہے، ساری توانائیوں کے استعمال کے بعد ایک وقت آتا ہے کہ وہ اس مقصد میں کسی حد تک کامیاب ہوتا ہے، اسی طرح بندہ مؤمن کا اصل ہدف نفسی قوتوں کو فنا کرکے، اللہ کی توحید کامل تک رسائی ہوتا ہے (جسے دوسرے الفاظ میں اللہ کا وصال بھی کہہ سکتے ہیں) اس مقصد کے حصول کے لئے بھی بندہ کو اپنی ساری توانائیاں خرچ کرنی پڑتی ہیں اور غیر معمولی مجاہدوں سے کام لینا ہوتا ہے اور اس راہ میں حائل

دوسرے سارے کاموں سے دوری اختیار کرنی پڑتی ہے، اس طرح بالآخر وہ اپنے مقصود تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔

لیکن مادی مقاصد اور اللہ تک رسائی کے حصول کے مقصد میں جوہری فرق موجود ہے، مادی مقصد کے حصول کے لئے ساری ذہنی وعملی توانائیوں کے استعمال کے باوجود فرد سکون سے محروم رہتا ہے، اس کی یہ زندگی بظاہر تو ہمیں کامیاب نظر آتی ہے، لیکن وجدانی ونفسیاتی طور پر ایسے فرد کی زندگی زہر سے عبارت ہوجاتی ہے، اس لئے کہ ہر مادی مقصد دل اور روح کے نظام کو درہم برہم کرنے اور فرد کے لئے بے قراری کے انگاروں پر لیٹنے کے مترادف ثابت ہوتا ہے، یہ چیز مادی مقاصد کی خصوصیات میں شامل ہے، جب کہ توحید کامل یا اللہ کے وصال کا مقصد دین ودنیا، دنیا وآخرت کی جملہ سعادتوں کا باعث بنتا ہے۔

اگر یہ نکتہ پیش نظر رہے تو اللہ کی رضا اور توحید کامل کے حصول کا مقصد عزیز سے عزیز تر ہوجائے اور اس کے لئے مجاہدوں کی مشقت راحت کا ذریعہ بن جائے۔

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَن تُشْرِكُواْ بِاللّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَاناً. (سورۃ الاعراف، آیت نمبر ۳۳)

(اور آپ فرمایئے کہ البتہ میرے رب نے صرف حرام کیا ہے تمام فحش باتوں کو ان میں کچھ علانیہ بھی ہیں کچھ پوشیدہ بھی)۔

انسان میں حیوانیت ودرندگی کی صفات

اس آیت میں اشارہ ہے، برائیوں کو چھوڑنے کا، جن کا چھوڑنا ضروری اور کرنا حرام ہے، ان میں پہلا ہر قسم کا گناہ ہے، جو علانیہ ہو یا خفیہ ہو، دوسرا ظلم اور تیسرا شرک ہے، ان تینوں گناہوں کا تعلق انسان کے اندر تین طرح کی طاقتوں سے ہے۔

(۱) انسان میں حیوانیت بھی پائی جاتی ہے، جس کی وجہ سے وہ گناہ کرتا ہے۔ (۲) درندگی بھی پائی جاتی ہے، جس کی وجہ سے وہ ظلم کرتا ہے۔ (۳) جھوٹ کی طاقت زبان میں رکھی گئی ہے، جس کی وجہ سے شرک کرتا ہے، تو ان سب طاقتوں کو کنٹرول کرکے گناہوں سے بچنا ہے۔

تشریح:

انسان میں نفس کی صورت میں جو طاقت موجود ہے، وہ حیوانیت ودرندگی کا مظہر

ہے، بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ نفس امارہ میں دنیا میں موجود سارے درندوں سے زیادہ طاقت موجود ہے، اس لئے ہر دور کے فرعونوں نے اس طاقت کا آخری حد تک استعمال کر کے، اللہ کی زمین کو ہر دور میں فساد سے بھر دیا ہے، اس دور کے نفس امارہ کے حامل فرعون بھی یہی کردار ادا کر رہے ہیں، نفس لوامہ کو بیدار کئے بغیر فرد، نفس امارہ کی حیوانیت ودرندگی سے بچ سکے، ممکن نہیں، ہر دور میں عام طور پر لوگوں کی اکثریت نے نفس کی اکساہٹ پر اللہ، اس رسولوں اور اہل اللہ کی مخالفت کی روش اختیار کی ہے، اس دور میں تو حیوانیت ودرندگی نے ہمہ گیر صورت اختیار کر لی ہے، سبب یہ ہے کہ قوموں کی قیادت اور عالمی حکومت جن افراد کے ہاتھوں میں ہے، ان پر حیوانی صفات غالب ہیں، انہوں نے تعلیم وابلاغ کے سارے ذرائع کو حیوانیت اور حیوانی مظاہر کے فروغ کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ (مرتب)

وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِن تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ. (سورۃ الاعراف، آیت نمبر۴۳)

(اور ان کے دلوں میں جو کچھ غبار تھا ہم اس کو دور کر دیں گے، ان کے نیچے نہریں جاری ہوں گی)۔

دل میں ناراضگی کا احساس کمال کے منافی نہیں

دل کے اندر کسی کے خلاف کوئی بات غیر اختیاری طور پر رہ جائے، جان کر فرد اس کو دل میں نہ لائے تو اس پر پکڑ نہیں، اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے دخول جنت سے نہیں روکیں گے، بلکہ (دل کو) اس سے صاف کر کے، جنت میں داخل کریں گے، کیونکہ اس کا نکالنا فرد کے بس میں نہ تھا۔

تشریح:

دنیا میں بعض اوقات تمام تر اخلاص کے باوجود افراد کو ایک دوسرے سے ایسی شکایت وتلخی پیدا ہو جاتی ہے، جس کا اثر دل میں موجود رہتا ہے، یہ اخلاص کے منافی نہیں ہے، یہ بشریت کا تقاضہ ہے، قیامت میں ایسے بندوں کے دل کو صاف کر کے، انہیں جنت میں داخل کیا جائے گا۔ اخلاص پر مبنی اختلاف رائے سے پیدا ہونے والی شکایت وتلخی ایک

حد تک فطری نوعیت کی ہے۔ بعض اوقات سارے اخلاص کے باوجود یہ شکایت پیدا ہو جاتی ہے، جو قابل معافی ہے۔ اس طرح کی شکایت جنت میں دخول کی راہ میں حائل نہیں ہوگی۔ (مرتب)

وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللَّهُ. (سورۃ الاعراف، آیت نمبر۴۳)

(اور ہماری کبھی رسائی نہ ہوتی اگر اللہ تعالیٰ ہم کو نہ پہنچاتے)۔

ہدایت کا اللہ کی نصرت پر منحصر ہونا

ہدایت تک رسائی صرف اور صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی مدد ونصرت سے ہوتی ہے، اس میں کوشش کو دخل نہیں، لیکن ہدایت کی راہ پر چلنے کے لئے کوشش کی ضرورت ہوتی ہے، پہنچاتے پھر اللہ تعالیٰ ہیں۔

تشریح:

ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر لوگ راہ ہدایت پر نہیں آتے، اس کا اکثر سبب یہ ہوتا ہے کہ غلط ماحول کی وجہ سے بچپن سے ہی فطرت سلیمہ متاثر ہونا شروع ہوتی ہے، ورنہ اگر فطرت سلیمہ کی حفاظت ہو تو راہ ہدایت پر گامزن ہونا آسان ہے، اس طرح کے افراد کے اندر چونکہ ہدایت کی طلب ختم ہو جاتی ہے، اس لئے ایسے افراد کو اللہ اپنے فضل خاص سے ہدایت نصیب فرمائے تو فرمائے، ورنہ ہدایت مشکل ہے، جن کو ہدایت کی توفیق نصیب ہے، وہ بھی دراصل ان پر اللہ کا فضل خاص ہی ہے، ہدایت کی راہ حاصل ہونے کے بعد مجاہدوں کی ضرورت ہوتی ہے، مجاہدے کسی پر بھی معاف نہیں الا ماشاء اللہ۔ (مرتب)

وَتَنْحِتُونَ الْجِبَالَ بُيُوتاً فَاذْكُرُواْ آلاءَ اللّهِ. (سورۃ الاعراف، آیت نمبر۷۴)

(اور پہاڑوں کو تراش تراش کر ان میں گھر بناتے ہو سو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو)۔

صنعت میں مہارت کا نعمت ہونا

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی صنعت میں مہارت کا حاصل ہونا بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔

تشریح:

صنعتی ترقی، تمدنی ترقی کا موجب ہے اور دنیا میں عروج کا ایک اہم سبب بھی۔

اگرچہ دنیا میں عروج کے سلسلہ میں ایمانی قوت فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن ایمانی اعتبار سے کمزور قوموں پر صنعتی ترقی (ٹیکنالوجی ترقی جس کا لازمی نتیجہ ہے) کی حامل قومیں غالب ہوجاتی ہیں، موجودہ دور میں صنعتی وٹیکنالوجی ترقی کو مادہ پرست قومیں انسانیت کی گمراہی اور اس کی تباہی کے لئے جس طرح استعمال کررہی ہے، وہ انسانیت کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ (مرتب)

فَتَوَلّٰی عَنْهُمْ وَقَالَ يَا قَوْمِ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ. (سورۃ الاعراف، آیت نمبر۷۹)

(اس وقت صالح ان سے منہ موڑ کر چلے اور فرمانے لگے کہ اے میری قوم میں نے تم کو اپنے پروردگار کا پیغام پہنچا دیا تھا)۔

مردوں کو سننے کی استعداد کا حاصل ہونا

اس آیت سے مردوں کا سننا ثابت ہوتا ہے، کیونکہ حضرت صالح علیہ السلام نے قوم کے مرنے کے بعد ان کو خطاب فرمایا کہ تم خیر خواہی کو پسند نہیں کرتے تھے، یہی ظاہرا معلوم ہوتا ہے۔

تشریح:

مُردوں کا سننا یہ دراصل روح کی صلاحیت وخصوصیت ہے، اس لئے حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ قبرستان جایا کرو تو السلام علیکم یا اہل القبور کہا کرو، روح کی سماعت کی اس نوعیت کو حواس اور عقل کے ذریعہ سمجھنا ممکن نہیں، البتہ اہل کشف کو اس کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، کشف القبور کے صاحبان، روح کی اس استعداد سے آشنا ہوتے ہیں۔ (مرتب)

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَى آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ. (سورۃ الاعراف، آیت نمبر۹۶)

(اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے)۔

دنیاوی مصیبتوں اور نعمتوں میں

گناہ اور نیکی کا دخل ہونا

دنیاوی مصیبت اور نعمت میں گناہ اور نیکی کو دخل حاصل ہے، اگر فرد نیکیاں کرے گا

تو اللہ تعالیٰ اسے مصائب سے محفوظ رکھیں گے اور بالفرض مصائب آ بھی گئے تو اللہ صبر عطا فرمائیں گے اور اس سے وہ پریشان نہ ہوگا، لیکن اگر گناہ کرے گا تو مصیبتوں میں رہے گا اور دنیاوی نعمتیں ملی بھی تو پریشان ہی رہے گا۔

تشریح:

ایمان اور تقویٰ کے نتیجہ میں اللہ کی طرف سے زمین وآسمان کی برکتوں کے کھولنے کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔ یہ چیز ایمان وتقویٰ کی خصوصیات میں شامل ہے، جب کہ گناہوں کی خصوصیت میں یہ بات شامل ہے کہ اس سے دل سیاہ ہوجاتا ہے، حوصلہ وہمت کا فقدان ہوجاتا ہے، صحیح سمت میں کام کرنے اور مثبت سوچ اور مثبت نوعیت کے نکات آنا بند ہوجاتے ہیں، فرد خود اعتمادی کے بحران سے دوچار ہوجاتا ہے، اس طرح گناہوں کے نتیجہ میں وہ نئے نئے بحرانوں اور مفاسد سے دوچار ہوجاتا ہے، کاروبار اور روزی میں برکت رخصت ہوجاتی ہے، جب کہ نیکی کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ اس سے فرد کے ساتھ اللہ کی مدد شامل حال ہوجاتی ہے، ہر قسم کے حالات میں حوصلہ وہمت سے کام کرنے کی صلاحیت ابھرتی ہے، اگر مصائب ومشکلات آتی بھی ہیں تو صبر وشکر کی نفسیات پختہ ہوتی ہے، نیکیاں اپنے ساتھ سکونِ قلبی کی دولت لاتی ہیں، اور اللہ کی ذات پر توکل اور یقین کی کیفیت بھی، یہ دونوں نعمتیں ایسی ہیں، جو مصائب ومشکلات کے احساس کو کالعدم کردیتی ہیں، اس لئے مصیبتوں سے بچنے کی واحد صورت اخلاص کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہے، اس لئے کہ اس سے ہر طرح کے حالات میں فرد وافراد کا احساس پاکیزہ رہتا ہے۔احساس کی یہ پاکیزگی دنیا ودولت سے ملنا ممکن نہیں۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانسَلَخَ مِنْهَا فَأَتْبَعَهُ الشَّيْطَانُ فَكَانَ مِنَ الْغَاوِينَ. (سورۃ الاعراف، آیت نمبر۱۷۵)

(اور ان لوگوں کو اس شخص کا حال پڑھ کر سنائیے کہ اس کو ہم نے اپنی آیتیں دیں پھر وہ ان سے بالکل ہی نکل گیا پھر شیطان اس کے پیچھے لگ گیا سو وہ گمراہ لوگوں میں داخل ہوگیا)۔

بے عمل علماء کی حالت زار

روح میں طیبی سے نقل کیا ہے کہ جو شخص اس مثال پر غور کرے گا،اس کو یہ بات

یقین کے ساتھ معلوم ہوگی کہ بے عمل علماء اس سے زیادہ خراب حالت میں ہیں کہ دنیا کے مال وجاہ اور اس کی لذتوں میں مشغول ہیں۔ اسی میں اس بات کا اشارہ ہے کہ جو شخص سلوک میں آنے کے بعد اس سے ہٹتا ہے، اس پر وبال یہ ہوتا ہے کہ وہ مادی وطبعی وسفلی رجحانات ومیلانات کی طرف مائل ہوجاتا ہے اور نفسانی خواہشات کا اتباع کرتا ہے اور اہل اللہ کے خلاف زبان چلاتا ہے۔

تشریح:

آیت اور شرح کے پہلے حصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا علم، جس سے حب جاہ وحب مال سے بچاؤ کی صورت پیدا نہ ہو، جس سے جبلی تقاضوں پر کنٹرول نہ ہو، ایسا علم فرد کے لئے حب جاہ وحب مال کا موجب ہے، اصل علم تو وہ ہے، جس سے اللہ کی خشیت اور معرفت نفس ومعرفت رب پیدا ہو، اگر علم، فرد کی نفسیات میں بنیادی تبدیلی پیدا نہ کر سکے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ علم نافع اور کارگر ثابت نہ ہوا، اس لئے علم کے ساتھ معرفت کی بھی سخت ضرورت ہے، تاکہ فرد کی بنیادی ساخت میں تبدیلی برپا ہو۔

حاشیہ کے دوسرے حصہ میں سلوک کا ذکر ہے، راہ سلوک بڑی دشوار گذار راہ ہے، اس میں قدم قدم پر نفسی قوتوں سے معرکہ آرائی کرنی پڑتی ہے، جو شخص راہ سلوک میں داخل ہونے اور کچھ عرصہ چلنے کے بعد راہ فرار اختیار کرنے لگتا ہے تو وہ دراصل نفسی قوتوں کے زیر اثر آجاتا ہے، اس دور میں مادیت پرستی کی ہمہ گیر طوفانی لہروں کی وجہ سے اول تو لوگوں کی بہت بڑی اکثریت اس راہ پر آتی نہیں، جو لوگ آتے ہیں، ان میں بھی بہت سارے افراد اس راہ کی دشواریوں کی وجہ سے جلد ہی بھاگ جاتے ہیں، بہت کم خوش نصیب افراد ہوتے ہیں، جو استقامت سے اس راہ پر گامزن ہوتے ہیں، راہ سلوک سے فرار اختیار کرنے کی وجہ سے اکثر دیکھا گیا ہے کہ افراد، مادیت کی دلدل میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ (مرتب)

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيراً مِّنَ الْجِنِّ وَالإِنسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُوْلَـئِكَ كَالأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُوْلَـئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ. (سورۃ الاعراف، آیت نمبر ۱۷۹)

(ہم نے ایسے بہت سے جن وانس دوزخ کے لئے پیدا کئے ہیں جن کے دل ایسے ہیں جن سے سمجھتے نہیں اور جن کی آنکھیں ایسی ہیں جن سے دیکھتے نہیں اور جن کے کان ایسے ہیں جن سے سنتے نہیں، یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ یہ لوگ ان سے زیادہ بے راہ ہیں۔ یہ لوگ غافل ہیں)۔

اللہ سے غفلت کے اثرات ونتائج

اس آیت سے دو نعمتوں پر دلالت ہوتی ہے، ایک تو آیت کے لفظ دلالت کرتے ہیں، کہ جو شخص اللہ سے غافل ہو اور دین پر عمل نہ کرتا ہو، اس کے لئے دوزخ ہے، دوسرا عقلاً اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے غافل ہونے کی وجہ سے دنیا کی محبت اور حرص بڑھتی ہے اور ذکر کرنے سے اللہ سے محبت اور دل پر انوارات پڑتے ہیں اور جو مل جائے اس پر صبر وشکر کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

تشریح:

دل، آنکھیں اور کانوں کی نعمت اس لئے ملی ہیں، تاکہ ان سے کام لے کر معارف وحقائق تک رسائی حاصل کرسکیں اور اپنی محسن خالق ہستی کے زبردست نظام پر غور وفکر کرکے، اس کی شان عظمت کے سامنے اپنے آپ کو پامال کرسکیں، انسانوں کی بہت بڑی اکثریت کی حالت یہ ہے کہ دل کی ادراک کی صلاحیت کو انہوں نے معطل کردیا ہے، کانوں اور آنکھوں پر غفلت کے پردے لگادیئے ہیں، اور اس سلسلہ میں اپنی باطنی حسوں اور سننے، سمجھنے اور دیکھنے کی اصل اور حقیقی حسوں کو معطل کردیا ہے، دل، کان اور آنکھوں کی نعمتیں تو اس لئے ملی ہیں کہ ان سے محبوب حقیقی کے پیغام کا ادراک کرسکیں، اس پیغام کو دیکھ سکیں اور سن سکیں۔

لیکن بدقسمتی سے انسانوں کی طرف سے ان نعمتوں کا اس مقصد کے لئے بہت کم استعمال ہوا۔

اللہ سے غافل ہونا بظاہر معمولی مرض محسوس ہوتا ہے، لیکن یہ غفلت بہت سارے ظاہری اور باطنی گناہوں کا باعث بنتی ہے، عام طور پر افراد کو اللہ اور اس کے ذکر سے غافل ہونے کے اثرات ونتائج کا ادراک نہیں ہوتا، لیکن یہ غفلت جب مزاج کا حصہ بن

جاتی ہے تو حب جاہ وحب مال اور حرص وہوس اس کے مزاج میں شامل ہوجاتے ہیں، معاملات میں بگاڑ پیدا ہوجاتا ہے، اخلاقیات کی درستگی کی صورت پیدا نہیں ہوتی، دین پر عمل پیرا ہونا دشوار ہوجاتا ہے، دینداری رسمی صورت اختیار کر جاتی ہے، اس طرح اللہ سے غفلت بے شمار گناہوں کا ذریعہ بن جاتی ہے، وقت ہونے کے باوجود اس وقت کو لہو ولعب میں ضایع کرنا بڑی نادانی کی بات ہے۔ امام ابن قیمؒ نے ذکر کے سلسلہ میں بہت اہم نکات بیان کئے ہیں، لکھتے ہیں: جو شخص ذکر سے غافل ہو، وہ مقام احسان تک نہیں پہنچ سکتا، جیسا کہ بیٹھ جانے والا گھر نہیں پہنچ سکتا۔

بندہ جس قدر ذکر سے غافل ہوتا ہے، وہ اتنا ہی اللہ سے دور ہوتا ہے، غافل اور اللہ کے درمیان وحشت پیدا ہوجاتی ہے، جو اللہ کے ذکر کے بغیر زائل نہیں ہوسکتی۔ (مرتب)

ذکر سے غفلت کے سلسلہ میں اس آیت کی تشریح میں ہم نے ایک جگہ بحث کی ہے، وہ بحث یہاں پیش کی جارہی ہے۔

ذکر سے غفلت کے جو اثرات فرد پر پڑتے ہیں، جو عام طور پر اس کی زندگی بھر کا حصہ ہوتے ہیں، اس آیت میں اس کا بھی ذکر فرمایا گیا ہے کہ فرد کا محبوب حقیقی سے رشتہ کٹ جاتا ہے، وہ جانوروں سے بدتر ہوجاتا ہے، کھانا پینا اور سونا، کمانا اس کا مقصود زندگی ہوجاتا ہے، اس کے قلب کے فہم کی صلاحیت مجروح ہوجاتی ہے، اس کی آنکھوں کی حقیقی بصارت کی استعداد باقی نہیں رہتی، یعنی بظاہر تو وہ سب کچھ دیکھتا ہے، لیکن محبوب کے انوار وتجلیات، اشیائے کائنات کے مشاہدے سے حقیقی استفادہ کی صلاحیت اور محبوب کے حقوق ادا کرنے کی اس کی عبرت کی آنکھیں مضمحل ہوجاتی ہیں، اور اس کے کانوں کی سماعت مفلوج ہوجاتی ہے کہ وہ کانوں سے دنیا بھر کی آوازیں تو سنتا ہے، لیکن اللہ محبوب کے پیام کو سننے کے اس کے کانوں کی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے، ذکر سے محرومی کا سب سے بُرا انجام جہنم ہے۔

اللہ کا جو ذکر ہمیں ان اثرات ونتائج بد سے بچانے اور اللہ کی اطاعت کے راستہ پر گامزن کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے، اس سے غفلت کے حجابات ہمیں اس راستے سے روک دیتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ذکر سے غفلت کے نتیجہ میں سے فرد کی زندگی میں پیدا ہونے

والے خلا کو کسی بھی طریقہ سے پُر نہیں کیا جاسکتا، محبوب سے دوری فرد کے لئے ان گنت مصائب ومسائل کا موجب بن جاتی ہے، غافل انسان اگر اپنے وجود پر غور کرے تو وہ محبوب کے بے پناہ انعامات میں سے کسی ایک انعام کی بھی شکر ادائیگی سے قاصر ہو، دل کی نعمت، آنکھوں کی نعمت اور سماعت کی نعمت، پوری انسانی شخصیت سراپا اللہ کے انعامات اور اس کی نوازشوں کی مرہون منت ہے، ادھر بندے کی حالت یہ ہے کہ وہ ذکر کی صورت میں اس کی کم سے کم شکر ادائیگی کرنے کے لئے بھی تیار نہیں۔

ذکر تو ایسی چیز ہے، جو انسانی فطرت اور اس کی شخصیت کا ناگزیر حصہ ہے، ذکر سے غفلت انسانی شخصیت کو باطنی طور پر ہولناک بحران سے دوچار کردیتی ہے، ذکر سے محرومی کا سب سے بڑا نقصان جو فرد کو بھگتنا پڑتا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ قساوت قلبی کا شکار ہوجاتا ہے، جس کی وجہ سے اس کے پاکیزہ احساسات اور پاکیزہ حسیں دب جاتی ہیں اور وہ انسانیت اور انسانیت نوازی کی صفات سے بے بہرہ ہوجاتا ہے، ذکر سے محرومی کا دوسرا بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ فرد کی طبیعت اور شخصیت میں ہر طرح کے خیر کو قبول کرنے کی صلاحیت مسدود ہوجاتی ہے۔

تیسرا بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ فرد کا دل اور اس کی شخصیت شیاطین کی آماجگاہ بن جاتی ہے، جس کی وجہ سے اس پر شیطانی خیالات کا تسلط رہنے لگتا ہے۔

ذکر سے محرومی فرد کو اشرف المخلوقات سے گرا کر، اسفل السافلین تک پہنچا دیتی ہے، اس طرح آخرت کے جہنم سے پہلے خود دنیاوی زندگی اس کے لئے جہنم کا منظر بن جاتی ہے۔

اے غافل انسان، ذکر سے غفلت کے نتائج کا ادراک کرلے، بیدار ہوکر ذکر وعبادت کے ذریعہ محبوب کی راہ پر گامزن ہو، تمہارے لئے سلامتی اور سارے بحرانوں سے بچاؤ کی راہ یہی ہے، اس لئے کہ توحید کے عقیدے کے استحکام، اللہ کے رنگ کو غالب کرنے اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے آسان ہونے کا ذریعہ اللہ کا ذکر ہی ہے۔

آج ہماری حالت یہ ہے کہ ہر جگہ افراد معاشرہ کی سنگ دلی، بے رحمی، قساوت قلبی، بداخلاقی، بدمعاملگی، ایک دوسرے کی بدخواہی، بدکرداری، مال کمانے کی خاطر

انسانیت کی پامالی، غریبوں کی عدم پرسانِ حالی، ادب وآداب کے خاتمہ، بے حیائی اور بے غیرتی کا رونا رویا جارہا ہے، کوئی مجلس ایسی نہیں، جو افراد معاشرہ کے اس طرح کے واقعات اور ان کی اس حالت پر نوحہ کناں نہ ہو، لیکن اس ساری صورتحال کی تہہ میں کارفرما بنیادی سبب پر غور وفکر کرنے پر آمادگی نہیں ہے، یہ سب نتیجہ ہے اللہ کو بھلادینے اور اپنے دلوں کو اس کے ذکر کے نور سے آباد اور شاداب بنانے سے انکار کی روش کا، حقیقت یہ ہے کہ جب دل پر نفس وشیطان کے دیو غالب آجاتے ہیں تو اس کے نتیجہ میں **ظهر الفساد في البر والبحر** کا منظر سامنے آتا ہے۔

ایک اہم نکتہ جسے سمجھنے کی سخت ضرورت ہے کہ نفس اور شیطان کی ''خصوصیات'' میں یہ بات شامل ہے کہ وہ مسلسل ۲۴ گھنٹے مصروف عمل ہوتے ہیں، اور ان کی یلغار ہر وقت جاری رہتی ہے اور وہ افراد کو مادیت اور مادی اداؤں پر فریفتہ کرتے رہتے ہیں اور مادی خیالات اور مادی خواہشوں سے انہیں آلودہ کرتے رہتے ہیں، نیند کی حالت میں بھی لاشعور میں موجود قوتیں کارفرما ہوتی ہیں اور شیاطین بھی، انسان کی یہ صورتحال ایسی خوفناک ہے کہ اس سے بچاؤ کی کوئی صورت موجود نہیں، سوائے اللہ کے ذکر کے سہارے کے۔

یہاں اس بات کی توضیح بھی ضروری ہے کہ رسمی عبادت اور رسمی نوعیت کے اذکار سے فرد کی شخصیت میں کچھ نہ کچھ بہتری ضرور آتی ہے، لیکن سیرت وکردار میں پاکیزگی پیدا ہوجائے، معاملات میں بہتری آجائے، انسانی جوہروں سے بہرہ وری ہوجائے اور افراد میں ایک دوسرے کے لئے محبت، شفقت، رحم کے طاقتور جذبات پیدا ہوجائیں، اسلامی شریعت مزاج کا حصہ بن جائے، یہ اوصاف کثرت ذکر کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتے اور کثرت ذکر کی عادت اہل ذکر کی صحبت سے ہی پیدا اور مستحکم ہوتی ہے۔

ہمارا قومی مزاج کچھ اس طرح کا بن گیا ہے کہ عام طور پر ذکر سے غفلت کو کوئی بیماری نہیں سمجھا جاتا، حالانکہ بیشتر بُرائیوں اور فساد کی جڑ ذکر سے غفلت کا مزاج ہی ہے۔ (دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ذکر سے ہماری دوری وغفلت کو دور فرمائے، اور ہمارے دل ودماغ میں ذکر کی اہمیت کو واضح اور اجاگر فرمائے)۔ (آمین)

فَإِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِم مَّنْ خَلْفَهُمْ. (سورۃ الانفال، آیت نمبر ۵۷)

(سو اگر آپ لڑائی میں ان پر قابو پالیں تو ان کے ذریعہ سے اور لوگوں کو جو کہ ان کے علاوہ ہیں منتشر کردیجئے)۔

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ. (سورۃ الانفال، آیت نمبر ۶۰)

(اور ان کافروں کے لئے جس قدر آپ سے ہوسکے ہتھیار اور پلے ہوئے گھوڑوں سے سامان درست رکھو کہ اس کے ذریعہ سے تم ان پر جو اللہ کے دشمن ہیں اور تمہارے دشمن میں رعب جمائے رکھو)۔

دنیاوی اسباب کا اختیار کرنا باطنی کمال کے منافی نہیں

دنیاوی اسباب وآلات کو اختیار کرنا کمال باطنی اور توکل کے خلاف نہیں، کیونکہ خود اللہ تعالیٰ نے کفار کے خلاف ہتھیار جمع کرنے کا حکم دیا ہے۔

تشریح:

ان دونوں آیتوں کے ترجمے ہر آیت کے نیچے شامل کردیئے گئے ہیں۔

سیاسی تدابیر کا باطنی کمال کے منافی نہ ہونا

اس دونوں آیتوں میں دلالت ہے کہ سیاسی تدابیر باطنی کمال کے منافی نہیں، جیسا کہ بعض غلو کے حامل اہل رہبانیت کرتے ہیں۔

تشریح:

ان آیات میں کفار کے خلاف ہتھیار جمع کرنے اور خوب تیاری کرنے کا حکم ہے۔ جو کافر قومیں اسلام کو مٹانے کے درپے ہیں، ان کے خلاف بہتر سے بہتر ہتھیاروں کے ذریعہ جہاد اسلام کا اہم حکم ہے، یہ اسلام اور کفر اور امت مسلمہ اور اہل کفر کے درمیان موت وزیست کا مسئلہ ہے، اس طرح کے اہم مسئلہ سے اعراض کی روش اختیار کرنا، اور تصوف ورہبانیت کے نام پر اہل اسلام کے موت وحیات کے مسائل سے بے نیازی اختیار کرنا، یہ اہل تصوف واہل طریقت کو ہرگز زیبا نہیں، حقیقی تصوف تو اللہ کے لئے مرنے مارنے اور حمیت دین پیدا کرنے کا ذریعہ ہے، نہ کہ جہاد اور سامان جہاد سے بے نیازی

کا۔

آج کافر قومیں مسلم امت کو ہر جگہ جس طرح پامال کررہی ہیں، ظلم وستم کا شکار بنارہی ہیں اور ان کے خون سے ہولی کھیل رہی ہیں۔ اس کا بنیادی سبب سامان حرب اور جہاد اور جذبہ جہاد سے محرومی کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اس مقصد کے لئے پہلے اہل اسلام کے ایمان کو مستحکم کرنا ہے اور ان میں جذبہ جہاد کو بیدار کرنا ہے، لیکن اس کام میں بھی تو کوئی قابل ذکر پیش قدمی نہیں ہورہی ہے۔

اہل تصوف کو براہ راست نہ سہی، بالواسطہ طور پر اس محاذ پر کام کرنا ضروری ہے، اسلام کے تحفظ وبقا کے لئے یہ کام ناگزیر ہے۔

بات یہ ہے کہ دنیا میں ہر دور میں حق وباطل کی جنگ جاری رہتی ہے، ہر دور میں اہل باطل نے اہل حق کی مخالفت ہی نہیں بلکہ ان کا مقابلہ کیا ہے، بیشتر انبیاء کرام کو مفادات کے حامل سرداروں، مالداروں کی طرف شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے رسول اللہ ﷺ سے کفار کی جو جنگیں ہوئی وہ تو عالم آشکار ہیں۔

قیادت اور منصب کے مقام پر فائز سردار اور مالدار ہر دور میں یہ چاہتے ہیں کہ ان کے علاقہ میں ان کی حکومت ہو، لوگ ان کے تابع ہوں، جب کہ ہر دور میں اللہ کے دین کے علمبرداروں کی دعوت یہ رہی ہے کہ غلامی اور وفاداری اور مکمل اطاعت کی مستحق ذات صرف اللہ ہی ہے اس لئے عبادت واطاعت صرف اور صرف اسی کے کرنی چاہئے، غیر اللہ سے انکار کی یہی دعوت وقت کے فرعونوں کو انبیاء کرام کے خلاف برسرپیکار کرتی رہی ہے، قرآن کفار کی طرف سے انبیاء کرام کی مخالفت کے اس طرح کے واقعات سے بھرا ہوا ہے۔

ان آیات میں اہل حق کو تاکید کی جارہی ہے کہ حق وباطن کی اس کشمکش میں حق کے غلبے اور کفار کی پسپائی کے لئے سامان جنگ اور وقت کے مطابقت سے اسلحہ کی تیاری کریں، تاکہ کافر سرداروں اور مالداروں سرغرور توڑنے کی صورت پیدا ہو، اس دور میں بھی اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ دجالی تہذیب کی علمبردار قوتیں مسلمانوں کے خلاف جس طرح حملہ آور ہیں اور سازشوں کا جو وسیع جال انہوں نے مسلمانوں کے خلاف پھیلایا ہوا

ہے، اس سے مقابلہ کے لئے مسلم امت ہر طرح کی تیاری سے کام لے، اسلحہ کے علاوہ پبلسٹی کے ذرائع کو بھی اس مقصد کے لئے استعمال کرے۔

دنیا کی بیشتر کافر قومیں متحد ہوکر اسلام کے مٹانے کے لئے پوری منصوبہ بندی سے حملہ آور ہیں، مسلمانوں کا قتل عام جاری ہے، ان کے جملہ وسائل پر قبضے کی کوششیں جاری ہیں، ان حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے مسلم امت کو جدید اسلحہ جات سے مسلح ہونے کی سخت ضرورت لاحق ہے۔

اس وقت مسلم امت موت وحیات کے حالات سے دوچار ہے، قرآن کی مذکورہ آیتوں میں اس پر زور دیا گیا ہے۔

لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعاً مَّا اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِھِمْ۔ (سورۃ الانفال، آیت نمبر۶۳)

(اگر آپ دنیا بھر کا مال خرچ کرتے تب بھی ان کے دلوں میں الفت پیدا نہ کر سکتے)۔

دل میں اچھی صفت کا پیدا کرنا شیخ کے اختیار میں نہیں

دل کے اندر کوئی اچھی صفت کا پیدا کرنا شیخ کے اختیار میں نہیں، بلکہ یہ اللہ کے اختیار میں ہے، جیسے سخاوت اور اتفاق وغیرہ پیدا کرنا۔

تشریح:

اچھی کیفیات کا پیدا ہونا اللہ کا انعام ہے، جو اللہ کے فضل خاص سے حاصل ہوتی ہے، البتہ اس طرح کے بہت سارے انعامات اہل اللہ کی صحبت اور ذکر میں دوام کی خصوصیات میں شامل ہیں، یہ بزرگ کے اپنے اختیار میں نہیں، اس آیت میں اس بات کی نشاندہی کرنا کہ دنیا کی ساری دولت خرچ کرنے کے باوجود اتفاق پیدا کرنا، یہ بندوں کے بس کی بات نہیں، ہمارا مشاہدہ ہے کہ دینی جماعتوں اور دینی اداروں میں بھی عام طور پر یہ حالت ہوتی ہے کہ ایک دوسرے سے محبت کا سخت فقدان ہوتا ہے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر رنجشوں کی فضا پیدا ہوجاتی ہے، چند افراد کا دوچار سال تک ساتھ چلنا مشکل ہوجاتا ہے، معاشی مجبوریوں کی وجہ سے ساتھ رہتے ہیں، لیکن عام طور پر دل ایک دوسرے سے ملے

ہوئے نہیں ہوتے ہیں، سبب یہ ہے کہ دل اللہ کی محبت سے سرشار نہیں ہوتے، اللہ نے اپنے فضل کو اپنے محبت سے وابستہ کیا ہے۔ اللہ سے والہانہ محبت کے نتیجہ میں ایک دوسرے سے محبت پیدا ہوتی ہے، یہ چیز اللہ سے والہانہ محبت کی خصوصیات میں شامل ہے۔ (مرتب)

وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوبِهِمْ. (سورۃ التوبہ، آیت نمبر ۱۴)

(اور بہت سے مسلمانوں کے قلوب کو شفادے گا اور ان کے قلوب کے غیظ (وغضب) کو دور کرے گا)۔

کاملین میں طبعی امور کا ہونا

کاملین کے اندر بھی طبعی امور ہوتے ہیں، مثلاً غصہ وغیرہ، کیونکہ ان کے ان طبعی اوصاف سے کچھ آثار اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہوتے ہیں، جس سے لوگوں کو فائدہ ہوتا ہے، اس لئے ان کے اندر یہ طبعی امور رکھے جاتے ہیں، لیکن وہ تابع ہوتے ہیں دین کے۔

تشریح:

اگر چہ کاملین میں اشتعال اور غصہ کے جذبات پامال ہوجاتے ہیں، تاہم وہ کسی حد تک موجود ضرور ہوتے ہیں، تاکہ دینی حمیت کے مظاہرے کی صورت پیدا ہو، لوگوں کی طرف سے پریشانی کے وقت اس کا استعمال ہوسکے۔ (مرتب)

أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تُتْرَكُواْ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّهُ الَّذِينَ جَاهَدُواْ مِنكُمْ. (سورۃ التوبہ، آیت نمبر ۱۶)

(کیا تم خیال کرتے ہو کہ تم یوں ہی چھوڑ دیئے جاؤگے، ہنوز اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو تو دیکھا ہی نہیں ہے جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا ہو)۔

ثمرات کا مجاہدوں سے حاصل ہونا

یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ اللہ کی عادت ہے کہ مجاہدات کے بعد ثمرات عطا کرتے ہیں۔

تشریح:

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں افراد کی آزمائش یہ ہے کہ وہ مجاہدوں کے ذریعہ نفس کی قوتوں کو اللہ ورسول کے تابع بنانے کے کام کو کس قدر اہمیت دیتے ہیں، مجاہدوں کے بغیر اللہ کی طرف سے چھوڑ دیئے جانے کے راستے مسدود ہیں۔

اللہ کے لئے کفار سے اخلاص کے ساتھ جہاد کی صلاحیت بھی انہی افراد میں ہی پیدا ہوسکتی ہے، جو نفس کے خلاف مجاہدوں میں قابل ذکر حد تک کامیاب ہوں، جہاد کفار کے خلاف ہو، مادہ پرست معاشرے کے خلاف ہو یا نفس کے خلاف ہو، ہر طرح کے جہاد کے لئے ذکر وفکر کے مجاہدے ناگزیر ہیں، اس کے بغیر نفس میں وہ قوت وصلاحیت پیدا ہی نہیں ہوسکتی کہ وہ محض اللہ کے لئے سب کے ساتھ صف آرا ہو۔

مجاہدوں میں غیر معمولی تاثیر رکھی گئی ہے، اس سے فرد میں موجود حیوانی اثرات پر قابو پایا جاتا ہے، فرد کی سیرت وکردار میں نکھار پیدا ہوتا ہے، انسانی جوہروں سے بہرہ وری ہوتی ہے، اللہ کی مخلوق سے محبت وشفقت کے احساسات طاقتور ہوتے ہیں، یہ اللہ کی سنت ہے، ذکر وفکر کے مجاہدوں کے بغیر اس طرح کے ثمرات پیدا نہیں ہوتے، یہ مجاہدوں کے ثمرات وانعامات ہیں، اللہ کا یہ قانون ایسا ہے، جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، ہاں، اللہ جس کے لئے چاہے، اسے اس قانون سے مستثنا کرسکتا ہے، لیکن عام طور پر اس قانون میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ چنانچہ غیر معمولی مجاہدوں کے بغیر جن کو بھی خلافت عطا کی گئی، ان میں یہ خصوصیات پیدا نہ ہوسکیں۔ اس دور میں ہمارا مشاہدہ ہے کہ جس فرد کو بھی ذکر وفکر کے برسوں کے مجاہدوں کے بغیر خلافت دی گئی، وہ اگر علمی وعملی صلاحیتوں کا حامل ہے تو وہ جلد ہی شہرت ودولت کی طرف راغب ہونے لگتا ہے۔ مجاہدوں کا فقدان اسے حب جاہ وحب مال سے نہیں بچا سکتا، اس طرح تصوف وطریقت کے نام پر دنیاداری کی راہ اختیار کی جاتی ہے، اللہ کے ذکر کے غیر معمولی مجاہدوں کے بغیر خلافت کی سند فرد کو دنیاداری کی راہ اختیار کرنے سے نہیں بچا سکتی، اگر ہم جیسے اہل تصوف بزرگوں کے بیان کردہ اس نکتے کو سمجھیں تو وہ اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ تصوف وطریقت کو معاشرے میں بے وقعتی سے بچانے کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ (مرتب)

لَوْ كَانَ عَرَضاً قَرِيْباً وَسَفَراً قَاصِداً لَّاتَّبَعُوكَ. (سورۃ التوبہ، آیت نمبر ۴۲)
(اور اگر لگتے ہاتھ ملنے والا ہوتا اور سفر میں بھی معمولی سا ہوتا تو یہ لوگ ضرور آپ کے ساتھ ہو لیتے)۔

نفس کے امتحان کا طریقہ

اس آیت میں اپنے نفس کے امتحان لینے کا طریقہ مذکور ہے کہ کوئی دینی کام ایسا ہو، جس کے اندر دنیوی نفع کوئی نہ ہو، بلکہ مشقت ہو، پھر بھی فرد اس کام کو کرتا ہے تو یہ اللہ کی محبت کی دلیل ہے اور اگر ایسا دینی کام ہو، جس کے کرنے میں دنیوی نفع بھی مل سکتا ہے، اس لئے کرتا ہے تو اس کو اللہ سے محبت نہیں۔

تشریح:

ایسا دینی کام جس میں مادی نفع نہ ہو، بلکہ مشقت ہو، مثلاً کچھ لوگ اللہ کے لئے ملنے آتے ہیں، فرد اپنے سارے کاموں کو چھوڑ کر، ان سے اللہ کی محبت کی خاطر وقت گذارتا ہے، انہیں اللہ کے ذکر اور آخرت کی تیاری کی یاد دہانی کراتا ہو، محض اللہ کے لئے تو اس طرح کے ایثار کا مطلب یہ ہے کہ فرد دینی اعتبار سے مستحکم ہے اور وہ امتحان میں کامیاب ہے، جب کہ ایسا دینی کام جس میں مادی منافع ہو، اس دینی کام میں اللہ کی محبت کا جذبہ شامل نہیں، مالی منافع کا جذبہ کارفرما ہے تو یہ دینی کام قابل قبول نہیں، مثلاً مالدار مریدوں کو اس لئے وقت دیا جائے، تاکہ ان سے مالی منافع حاصل ہو، یہ علامت ہے اس بات کی کہ فرد پر نفسی قوتیں حاوی ہیں۔ (مرتب)

عَفَا اللّٰهُ عَنكَ لِمَ أَذِنتَ لَهُمْ. (سورۃ التوبہ، آیت نمبر ۴۳)
(اللہ تعالیٰ نے آپ کو معاف کردیا لیکن آپ نے ان کو اجازت کیوں دیدی تھی)۔

کاملین کے ساتھ اللہ کے عتاب کی نوعیت

اس میں عفو کو شکایت سے پہلے ذکر فرمایا، اللہ تعالیٰ کا باطن میں کاملین کے ساتھ یہی معاملہ ہوتا ہے کہ عین عتاب کے وقت ان پر لطف کا معاملہ بھی فرماتے ہیں، تاکہ ان کو وحشت نہ ہو اور اس میں ایسے شخص کے ساتھ خطاب کرنے کا ادب بھی بتایا گیا ہے، جس

کی حرمت کی رعایت کی جائے۔

تشریح:

کامل کے ساتھ اللہ کے عتاب کے وقت اس میں محبت کی آمیزش بھی موجود ہوتی ہے، تاکہ گھبراہٹ میں اضافہ نہ ہو، اللہ کے رسول ﷺ کی بات تو بالکل جداگانہ ہے، لیکن راہ محبت میں چلنے والوں کو بھی اکثر مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ اگر ان سے کوئی گناہ صادر ہوتا ہے یا ذکر ومجاہدہ میں غفلت واقع ہوتی ہے تو قلب میں انوار کا ورود روک دیا جاتا ہے، جس سے وہ حجابات محسوس کرنے لگتے ہیں، لیکن چونکہ وہ گناہ یا غفلت شعوری نہیں ہوتی، اس لئے حجاب کے فوراً بعد سینہ کو کھول دیا جاتا ہے، اور طالب محسوس کرنے لگتا ہے کہ محبوب کا یہ عتاب سنبھلنے اور محبوب کی طرف مزید رجوع کرنے کا ذریعہ ہوجاتا ہے، یعنی عتاب کے معاً بعد شفقت کا اظہار، یہ اللہ محبوب کی اپنے محبوں کے ساتھ خاص ادا ہوتی ہے، اس ادا سے مقصود طالبوں کی راہ محبت میں ارتقا اور رجوع میں ترقی ہی ہوتی ہے۔

قُل لَّن يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ.
(سورۃ التوبہ، آیت نمبر ۵۱)
(آپ فرمادیجئے کہ ہم پر کوئی حادثہ نہیں پڑ سکتا مگر وہی جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے مقدر فرما دیا ہے، وہ ہمارا مالک ہے اور (اللہ، تو وہ ذات ہے کہ) سب مسلمانوں کو اپنے سارے کام اس کے سپرد کرنے چاہئے، (اس آیت میں توکل کو آسان بنانے کا مراقبہ بتایا گیا ہے اور اس کے بعد تو توکل کا صریح حکم ہے)۔

توکل کے مراقبے کی اہمیت

توکل کا مراقبہ اللہ کی ذات پر اعتماد میں اضافہ کا باعث بنتا ہے اور اپنے سارے کاموں کو اللہ کے حوالے کرنے کا موجب بھی۔

تشریح:

مراقبۂ توکل سے صبر وشکر کی نفسیات پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ کی طرف سے مدد کی بھی عجیب وغریب صورتیں نکلتی رہتی ہیں، توکل کے مراقبہ سے زندگی بھر پیش آنے والے مصائب کے احساس کی شدت ختم ہوجاتی ہے، ذکر کے معمولات کے علاوہ بھی اگر توکل کے مراقبہ کے لئے تھوڑا سا وقت مل سکے تو بہتر ہے، ورنہ کثرت ذکر خود توکل، صبر

وشکر جیسی صفات پیدا کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔(مرتب)

وَلَا يَأْتُونَ الصَّلَاةَ إِلَّا وَهُمْ كُسَالَى. (سورۃ التوبہ، آیت نمبر ۵۴)

(لوگ نماز نہیں پڑھتے مگر کاہلی سے)۔

نیک کاموں میں سستی سے عبادت کے کاموں میں لذت سے محروم ہونا

جو لوگ عبادت اور اللہ کے راستے میں خرچ کرنے اور دوسرے نیک کاموں کے کرنے میں سستی کا مظاہرہ کرتے ہیں یا ناگواری سے کرتے ہیں، جیسے کوئی بوجھ لاد دیا گیا ہو، ایسے لوگ عبادت اور بندگی کی لذت سے محروم ہیں اور اللہ کے حسن وجمال سے ناآشنا ہیں۔

تشریح:

عبادت اور ذکر وفکر سے محرومی، اور نماز میں کاہلی اللہ کے حسن وجمال سے ناآشنائی ہی کا نتیجہ ہوتی ہے، اس صورت میں اعمال صالحہ کی خوش دلی سے سرانجامی دشوار تر ہوتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے حسن وجمال سے بے بہری اور ناآشنائی کی وجہ سے فرد، مادیت کی طوفانی لہروں کی زد میں آجاتا ہے، بڑے سے بڑا علم اور ذہانت بھی اسے مادیت کے ان طوفانی تھپیڑوں سے بچانہیں سکتی۔

ایسا فرد سکون سے محروم ہوگا اور نااتفاقی اور ناراضگی کے ساتھ ساتھ کشیدہ تعلقات کے نہ ختم ہونے والے سلسلہ سے دوچار ہوگا، اللہ کے حسن سے عدم بہرہ وری کی وجہ سے اُسے جتنی بھی سزا ملے، وہ کم ہے، اس صورت میں مال ودولت، علم وذہانت سب لاحاصل ہوجاتے ہیں اور فرد کو ظلمات وتاریکی اور نفسی حجابات سے بچانے میں ناکام رہتے ہیں۔

اللہ کے حسن وجمال سے بہرہ وری نماز اور کثرت ذکر سے ہی حاصل ہوتی ہے، جو دل کی آنکھوں کے منور ہونے کا ذریعہ بنتی ہے۔

اس کا ایک نتیجہ معاملات میں بہتری وپاکیزگی اور سب کے ساتھ محبت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، اس طرح اللہ تعالیٰ کا حسن وجمال فرد کو حسنِ کردار کا صاحب بنادیتا ہے۔

فَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا. (سورۃ التوبہ، آیت نمبر ۵۵)

(سو ان کے اموال واولاد آپ کو تعجب میں نہ ڈالیں اللہ چاہتے ہیں کہ ان چیزوں کے ذریعہ ان کو دنیوی زندگی میں عذاب میں گرفتار رکھے)۔

اللہ کے مشاہدہ جمال سے حالت پردہ میں ہونا

اس میں اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ لوگ عبودیت (بندگی) کی لذت سے اور اللہ کے مشاہدہ جمال سے حالت پردے میں ہیں، محمد بن فضیل کا قول ہے کہ جس شخص کو آمر (حکم دینے والا یعنی اللہ تبارک تعالیٰ) کی معرفت حاصل نہ ہوگی وہ امر (حکم پر عمل پیرا ہونے کے لئے) سستی کا مظاہرہ کرتا ہے اور جب شخص کو آمر (حکم دینے والے یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ) کی معرفت حاصل ہوگی وہ اس کے امر (حکم) کو راحت وغنیمت سمجھکر اس پر عمل پیرا ہوگا۔

آیت کے دوسرے حصہ میں محجوبین (حجاب کی حالت میں رہنے والوں کو تنبیہ ہے کہ وہ جس (دولت) کو راحت کی خاطر جمع کرتے ہیں اس میں ان کو راحت حاصل نہیں ہوگی بلکہ اس کے جمع کرنے اور اس کی حفاظت کے لئے محض مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں پھر اس میں ان کو ثواب کا اعتقاد اور تعلق مع اللہ بھی نہیں، جس سے ان کی یہ مشقت آسان ہوجائے)۔

تشریح:

اہل دنیا کے مال ودولت سے متاثر ہوکر، ان جیسا بننے کی آرزوؤں کا ہونا، یہ اس بات کی علامت ہے کہ فرد ابھی نفس سے مقابلہ میں ناکامی سے دوچار ہے، ان کے سامانِ زینت کو مستحسن سمجھنے کا لازمی نتیجہ اس مال کے حصول کی آرزوؤں کا ہونا ہے، اس کا نتیجہ آخرت کی فکر کے دب جانے اور مضمحل ہوجانے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، جو بڑے خطرے کی بات ہے، حقیقت یہ ہے کہ جب تک دنیاداروں اور مالداروں کے زیب وزینت اور راحت کے سامان سے دل میں کراہت پیدا نہ ہوگی، تب تک نفس نہیں سنورے گا۔ اس سلسلہ میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوب کے درج ذیل الفاظ ہمارے لئے

انتباہ کی حیثیت رکھتے ہیں، جس طالب کے دل میں دنیا کی طرف ذرہ برابر بھی میلان موجود ہوگا، وہ واصل باللہ نہیں ہوسکتا، اس کے بعد آپ نے یہ حدیث نقل فرمائی ہے "**الدنیا ملعونة وما فیها ملعون الا ذکر الله** دنیا ملعون ہے اور دنیا میں جو کچھ بھی ہے وہ سب ملعون ہے، سوائے اللہ کے ذکر کے (یعنی اللہ کے کثرت ذکر کی برکت سے دنیا کی ملعونیت کے یہ اثرات مضمحل ہو سکتے ہیں) خط کے یہ الفاظ اور یہ حدیث شریف ایسی ہے، جس کی روشنی میں ہم سب کو جائزہ لینا چاہئے کہ دنیا کے بارے میں ہماری روش کیا ہے؟ (مرتب)

وَقَالُوْا لَاتَنْفِرُوْ فِیْ الْحَرِ. (سورۃ التوبہ، آیت نمبر ۸۱)

(اور کہنے لگے کہ تم گرمی میں مت نکلو)

تصوف وسلوک کی ریاضتوں سے روکنے کی روش

جس طرح منافقین لوگوں کو جہاد سے روکتے تھے اور کہتے تھے کہ گرمی میں مت نکلو، اسی طرح حال ہے ان لوگوں کا، جو تصوف وسلوک سے روکتے ہیں اور اس کی سختیاں اور لذتِ دنیا کے چھوٹنے کے ارادے سے، حالانکہ جو عاشق ہوتا ہے، وہ ہر طرح کے مصائب برداشت کرتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنا چاہتے ہیں، ان کو کچھ مصائب اور لذتیں چھوڑنی پڑتی ہیں۔

تشریح:

اللہ کی راہ محبت میں قدم قدم پر نفس سے معرکہ آرائی کرنی پڑتی ہے، دنیا کے اپنے حصہ سے ایک حد تک دستبردار ہونا پڑتا ہے، اپنا قابل ذکر وقت ذکر وفکر کے لئے دینا پڑتا ہے، غیر ضروری میل وملاقات وتعلقات کو قطع کرنا پڑتا ہے، اس کے بعد کہیں جا کر نفس مہذب ہوتا ہے اور سنورتا ہے، اللہ سے والہانہ محبت کی نعمت عظمیٰ سے محروم افراد، راہ محبت کے طالبوں کو اس راہ پر جانے سے روکنے کے لئے کوشاں ہوتے ہیں، ایک تو خود راہ محبت سے فرار اختیار کرتے ہیں، دوسرے چلنے والوں کو روکتے ہیں، یہ المیہ کی بات ہے، راہ محبت میں چلنے والے کو اس راہ میں جو حلاوت محسوس ہوتی ہے، وہ ایسی حلاوت ہوتی ہے کہ اس راہ میں درپیش اس کی ساری مشکلات ومصائب کو آسان کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے، اس

لئے حوصلہ مند طالب اس راہ کی ساری مشکلات کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہوجاتا ہے، اس کے نزدیک سارے کام اللہ کی محبت کے تابع ہوتے ہیں، ہر وہ کام جو اس راہ میں رکاوٹ ہو، وہ اسے چھوڑنے کے لئے تیار ہوجاتا ہے، اس لئے کہ اللہ سے محبت کا ذوق شوق اسے ایسا کرنے پر اکساتا رہتا ہے۔ (مرتب)

فَلْیَضْحَکُوْا قَلِیْلاً وَلْیَبْکُوْا کَثِیْراً جَزَاء بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ. (سورۃ التوبہ، آیت نمبر ۸۲)

(سو تھوڑے دنوں ہنس لیں اور بہت دنوں روتے رہیں، ان کاموں کے بدلہ میں جو کچھ کیا کرتے تھے)۔

رونے کی حالت نہ ہونے پر تشویش میں مبتلا ہونا

بعض لوگوں نے اس کو امر کا صیغہ سمجھا پھر اس بنا پر شیوخ سے شکایت کی جاتی ہے کہ ہمیں رونا نہیں آتا، حالانکہ اس آیت میں مراد خبر انشا کی صورت میں ہے یعنی قیامت میں ان کو ہنسنا نصیب نہ ہوگا اور وہاں رونا ہی پڑے گا، اس کا سبب بما کانو یکسبون یعنی انہیں اپنے کاموں کے بدلہ میں رونا پڑے گا۔

اگر رونا محبت اور خشیت سے ہو تو بہتر ہے، لیکن بہتر ہونے کا مطلب یہ نہیں ہر صورت میں رونا ضروری ہے، اس لئے کہ رونا اختیار کے ساتھ خاص ہے، جب کہ یہ غیر اختیاری چیز ہے۔

تشریح:

اس آیت میں ایک بڑا مسئلہ جو بیان ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ کی دی ہوئی قیمتی زندگی کھیل وتماشہ اور ہنسنے میں گزارنا، انسانیت کا سب سے بڑا المیہ ہے، اس کے نتیجہ میں دائمی زندگی میں انہیں مسلسل رونا ہوگا اور رونے سے بچاؤ کی صورت پیدا نہ ہوگی، اس لئے کہ انہوں نے قیمتی زندگی کو دنیاوی مستقبل کو بہتر بنانے کی جدوجہد (جو کھیل کود اور ہنسنے سے ہی عبارت ہے) میں صرف کردیا، نہ صرف یہ کہ آخرت کی تیاری نہیں کی بلکہ وہ اعمال بد اور کردار بد کے ساتھ رخصت ہوئے، اللہ سے بغاوت والی زندگی اختیار کی اور اسی حالت پر ان کی موت واقع ہوئی، ایسے لوگوں کو اپنے اعمال بد کی بنا پر وہاں روتا رہنا پڑے گا۔

آیت میں دوسرا مسئلہ جو واضح ہوا کہ اللہ کی محبت اور خشیت سے رونا اگرچہ بہت بہتر حالت ہے، لیکن یہ حالت غیر اختیاری ہے، اس لئے اگر رونے کی کیفیت پیدا نہ ہو تو اس پر رنجیدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، البتہ اللہ کی محبت میں چلنے والے سالک کی عام طور جو حالت ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ وہ محبوب کے غم فراق سے اس کا دل روتا ہی رہتا ہے، بلکہ اس کے دل پر ایک طرح کے ماتم ہی کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔

جب وہ محبوب کے جلالی صفات کے عکس سے گزرتا ہے (اسے لگ بھگ روزانہ ان حالات سے گزرنا پڑتا ہے) اس وقت اس کی حالت ایسی ہوتی ہے، گویا اس پر حشر برپا ہے، یہ حوصلہ مند اور خوش نصیب سالک کا دل ہے، جو محبوب کے جلال کو برداشت کرتا ہے ورنہ یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

لَّيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ وَلاَ عَلَى الْمَرْضَى وَلاَ عَلَى الَّذِيْنَ لاَ يَجِدُونَ مَا يُنفِقُونَ حَرَجٌ إِذَا نَصَحُواْ لِلّهِ وَرَسُولِهِ . (سورۃ التوبہ، آیت نمبر ۹۱)

(ضعیفوں پر کوئی گناہ نہیں نہ بیماروں پر اور نہ ان لوگوں پر جن کو خرچ کرنے کو میسر نہیں جب کہ یہ لوگ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خلوص رکھیں)۔

کسی عذر سے عمل سے قاصر رہنا

اس آیت میں دلیل ہے، اس پر کہ جو شخص کسی عذر کے سبب کسی عمل سے قاصر رہے، مگر نیت اس کی یہ ہو کہ اگر مجھے قدرت ہوتی تو یہ عمل ضرور کرتا تو وہ برکات سے محروم نہیں رہتا۔

تشریح:

ضعف اور بیماری وغیرہ کی وجہ سے ذکر وفکر اور نوافل وغیرہ میں جو کمی واقع ہوتی ہے، یا سخت کمزوری کی وجہ سے جماعت میں شرکت دشوار ہوجاتی ہے، بندہ مؤمن کو اس کا اجر وثواب اسی طرح ملتا ہے، جو حالت صحت میں ان اعمال کے کرنے سے ملتا تھا۔اس طرح بندہ مومن کے لئے بیماری اور ضعف بھی ایک اعتبار سے باعث خیر وبرکت ہیں۔

بیماری وضعف میں ایک تو بندے کے صبر کی آزمائش ہوتی ہے، دوسرے یہ کہ

بندہ اپنی بے بسی کو دیکھکر اللہ محبوب سے رحم کی بھیک مانگنے لگتا ہے۔ بندے کی یہ عاجزی اللہ کو پسند ہے۔ (مرتب)

الأَعْرَابُ أَشَدُّ كُفْراً وَنِفَاقاً. (سورۃ التوبہ، آیت نمبر ۹۷)

(دیہاتی لوگ کفر ونفاق میں بہت ہی سخت ہیں)۔

اہل اللہ سے دوری کے اثرات

جب تک فرد اپنے آپ کو کسی متبع سنت بزرگ کے حوالے نہیں کرے گا اور اپنے اعمال کی درستگی کے لئے ان سے رہنمائی نہیں لے گا اور نیک لوگوں سے دوری اختیار کرے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ گناہوں کی دلدل میں جا گرے گا اور منزل مقصود تک پہنچ نہیں سکے گا، لہٰذا کسی صاحب کمال شیخ کی ہم نشینی اختیار کرنا ضروری ہے۔

تشریح:

کسی متبع سنت اہل اللہ سے اصلاحی تعلق کے بغیر فرد پر نہ تو اندر کی وسیع تر دنیا منکشف ہوتی ہے، اور نہ ہی نفسی خرابیوں اور باطنی بیماریوں سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے، انسانی جوہروں کا پیدا ہونا تو بہت زیادہ دشوار ہے، اہل اللہ سے دوری کا لازمی نتیجہ حب جاہ وحب مال اور حرص وہوس جیسی بیماریوں کی دلدل میں مبتلا ہونے کی صورت میں ہی ظاہر ہوتا ہے، اعمال کی درستگی کی صورت کا پیدا ہونا بھی دشوار تر ہوتا ہے، فرد کے ساتھ مزید بدقسمتی یہ ہوتی ہے کہ وہ اہل اللہ کی مخالفت پر اتر آتا ہے۔ اس دور کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ صاحبان علم اور معاشرے کے مؤثر طبقات کی بڑی اکثریت اہل اللہ کی صحبت کو غیر ضروری اور لایعنی سمجھتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دل میں دنیا کی محبت موجزن ہے اور معاشرہ ہر طرح کے فساد سے دوچار ہے۔ (مرتب)

ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُواْ (سورۃ التوبہ، آیت نمبر ۱۱۸)

(پھر ان کے حال پر توجہ فرمائی تا کہ وہ آئندہ بھی رجوع رہا کریں)

حجاب کے بعد کرم کی بارش کا ہونا

اللہ تعالیٰ کی اپنے محبین کے ساتھ یہ عادت جاری ہے کہ جب ان سے کوئی کام ان

کے مقام کے خلاف صادر ہوجاتا ہے تو ایک قسم کے حجاب سے انہیں سزا دی جاتی ہے اور جب وہ اس کی تلخی چکھ چکتے ہیں تو ان پر کرم کی بارش کی جاتی ہے۔

تشریح:

راہ محبت میں چلنے والے ہر سالک کو نفس کی جن طوفانی لہروں سے گزرنا پڑتا ہے، اس کے اثرات سے بچنا مشکل ہوتا ہے، چنانچہ کبھی حب جاہ تو کبھی حب مال، کبھی ریا وشہرت تو کبھی دعویٰ کے مظاہرے کی صورت میں ان سے گناہوں کا صدور ہوتا رہتا ہے، نفس کی یہ طوفانی لہریں اتنی تیز ہوتی ہیں کہ بالخصوص متوسط طالب ان اثرات کی زد سے بچ سکے، مشکل ہے، طالب جوں ہی ذکر سے غافل ہوا اور صحبت ورابطہ میں تاخیر ہوئی اور کثرت گفتگو یا ناجنس (یعنی اللہ کی محبت سے باہر کے افراد) سے غیر ضروری رابطہ میں رہا نیز اس نے بحث ومباحث سے کام لیا تو فوراً وہ محبوب کے حجابات کی زد میں آجاتا ہے اور اس کی کیفیات سلب کردی جاتی ہیں، کیفیات سلب ہوتے ہی اس کے دل میں ماتم کی حالت برپا ہونے لگتی ہے اور اس کے دل کا نظام درہم برہم ہونے لگتا ہے، نیز اس پر اذیت کے شدید احساسات طاری ہوجاتے ہیں، لیکن سزا بھگتنے کے بعد طالب پر کرم کی بارش ہونے لگتی ہے، اس کی کیفیات نہ صرف بحال کردی جاتی ہیں، بلکہ پاکیزہ کیفیات میں بہتری پیدا ہوجاتی ہے، لیکن پھر نفس کی اکساہٹ پر محبوب کے خلاف عمل ہوتا ہے، یہ بعض اوقات زیادہ گفتگو اور ناجنس افراد (راہ سلوک کے مخالف افراد) سے میل ملاقات وتبادلہ خیال کی صورت میں ہوتا ہے، زیادہ گفتگو اور میل جول دراصل طالب کے نفس میں اپنی فضیلت، اپنی بزرگی، دعویٰ اور ضد کی نفسیات کے مظاہرہ کا ذریعہ بن جاتی ہے، محبوب کو طالب کی یہ حالت اس کے مقام کے منافی نظر آتی ہے اور اس میں خدا پرستی کے بجائے نفس پرستی کی آمیزش شامل ہوتی ہے، اس طرح طالب کو نفس پرستی کی ان قوتوں سے اوپر اٹھانے اور اسے مہذب بنانے کے لئے یکے بعد دیگرے حجابات کی صورت میں سزا ملتی رہتی ہے، اس سزا سے اس کے دل میں رونے دھونے کی حالت طاری ہوتی ہے، نفس پر ملامت، محبوب کے سامنے شرمساری اور آہ وزاری کی اس کی حالت میں اضافہ ہوجاتا ہے، جب تک نفس کی فنائیت کا یہ عمل مکمل نہیں ہوتا، طالب کے دل پر حجابات کا یہ

سلسلہ یکے بعد دیگرے جاری رہتا ہے۔

چنانچہ سالک کا دل زیادہ تر دکھی رہتا ہے، وہ زیادہ گفتگو اور زیادہ ملنے ملانے کے معاملہ میں محتاط ہوتا ہے، لیکن معاشرتی واجتماعی زندگی کے معاملات کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ طالب کو عملاً اس کے بغیر چارہ کار نہیں، تاہم جو طالب غیر ضروری معاملات سے کٹ جاتا ہے، اس کے لئے محبوب کی طرف سے حالات سازگار بنائے جاتے ہیں اور اس کے لئے حجابات سے بچاؤ کی کافی صورتیں پیدا ہوتی رہتے ہیں، ایسا طالب جو اس معاملے میں زیادہ حساس ہوتا ہے، وہ سلوک کے کاموں کو اولیت دیتا ہے، اور نفس کو مہذب بنانے کے لئے مجاہدوں کے دوران وہ اس کام کو سارے کاموں پر ترجیح دیتا ہے، ایک تو اس پر محبوب کی طرف سے نصرت ومدد کا دوسرا قانون لاگو ہوتا ہے، جسے **وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مِنْ أَمْرِهِ يُسْراً** (جو اللہ سے ڈرتا ہے اس کے کاموں میں آسانی پیدا کردی جاتی ہے) جیسی متعدد قرآنی آیتوں میں بیان کیا گیا ہے، دوم یہ کہ اس طرح کا طالب چونکہ محبوب کے لئے مکمل طور پر یکسو ہوجاتا ہے، اس لئے اس کے راہ سلوک کے سفر کے جلد طے ہونے کی صورت پیدا ہوتی ہے۔

بہرحال سلوک کے اس پورے سفر کے دوران طالب کو ایک تو قدم قدم پر نفس کی ہولناک قوتوں کا مشاہدہ ہوتا ہے، دوم یہ کہ محبوب کے حجابات اس کے دل کو چھلنی کردیتے ہیں، تاہم محبوب، جلال کے ساتھ جمال کی صاحب ہستی بھی ہے، اس لئے جلال کے معاً بعد اس کے حسن وجمال کی کرنیں طالب کے دل پر گرتی ہیں تو وہ خوشی ومسرت کے ایسے احساسات سے دوچار ہونے لگتا ہے کہ حجابات کی احساسِ اذیت کو وہ بھول جاتا ہے۔

ایسا طالب جو اس دور میں نفس کو مہذب بنانے کی خاطر معاشرے کی روش سے ہٹ کر، محبوب کی محبت کی راہ پر گامزن ہے، وہ ایسا خوش نصیب فرد ہے، جس سے بڑھکر خوش نصیب فرد کوئی ہو نہیں سکتا، اس لئے کہ مادہ پرست اور نفس پرست معاشرے کے جبری حالات واثرات اور اس کی زد سے بچ کر نکلنا اور محبوب کو مقصود بنا کر اس کی محبت کی راہ پر یکسو ہوکر چلنا اس کے فضل خاص ہی پر منحصر ہے، جب ہر فرد بڑی گاڑی، شاندار بنگلہ، دولت، شان ومان کی زندگی اور شیخی کے جنون میں مبتلا ہو، ایسی حالت میں اللہ کو مقصود بنانا اور اللہ کی طرف سے مسلسل حجابات کو برداشت کرنا ہر ایک کے بس کی بات

نہیں۔

آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں، وہ انسانی تاریخ کا سب سے زیادہ پیچیدہ، مادہ پرست اور انوکھا دور ہے، اس دور کی خاصیت ہی یہ ہے کہ جو فرد بھی اچھی ملازمت، اچھے کاروبار اور معاشی خوشحالی کے جنون میں مبتلا ہوگا، وہ دنیا داروں اور مالداروں کی شب وروز کی صحبت کے ماحول کے زیر اثر اپنی فطرت سلیمہ کے بچے کھچے اثرات بھی ضایع کردے گا، وہ پاکیزہ باطنی خصوصیات سے محروم ہوکر، اللہ کی راہ محبت کے ادراک سے قاصر ہوگا، اگر وہ تھوڑا بہت اس راہ پر چل بھی رہا ہو تو دنیا دار دوستوں کی صحبت کے یہ تاریک اثرات اس کے لئے اللہ کی محبت کی راہ کو مسدود کردیں گے۔

موجودہ دور کی مادہ پرستی کی اس ہولناکی کو سمجھنا ازحد ضروری ہے، اس دور کی ہولناکی کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ موبائل نے ابلاغ کے سارے ذرائع کو غیر مؤثر کرکے عورت ومرد اور بالخصوص نوجوانوں اور کچی عمر کے بچوں پر حیوانیت، جبلت اور جنس کے شیطان کو مسلط کردیا ہے، موبائل کے ذریعہ روزانہ ایک آدھ گھنٹہ تک مادہ پرست انسانوں کے مظاہر، دولت ودنیا اور جنسی مناظر کو دیکھنے کے بعد تعلیم وتربیت کے سارے اثرات کالعدم ہوجاتے ہیں اور افراد، مادی حسن پر پروانوں کی طرح گرنے لگتے ہیں، نئی نسل دین ومذہب اور اخلاق کے حوالے سے بھی کوئی بات قبول کرنے اور اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں۔

ان حالات میں اللہ کی محبت کے ذریعہ اللہ کے انوار حسن سے فیضیابی کی راہ ہی وہ واحد راہ ہے، جس سے مرد وعورت اور نئی نسلیں حیوانیت اور جنس زدگی کے اثرات سے بچ سکتی ہیں، دوسری کوئی راہ بھائی نہیں دیتی، اللہ کی راہ محبت میں مدوجزر ضرور آتے ہیں، فرد کو محبوب کے جلال وجمال کے صفات کے عکسوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے، لیکن مادیت اور مادی حسن پر فدائیت اور اخلاقی وروحانی نظام کی تباہی سے بچاؤ کی بھی واحد راہ یہی ہے۔

جو افراد حقیقی طلب کے ساتھ اللہ کا ذکر کرتے ہیں اور اہل اللہ سے صحبت ورابطہ کے لئے مضطرب رہتے ہوں، وہی افراد ہیں، جنہیں محبوبِ حقیقی، دجالی تہذیب کے ہمہ گیر اثرات سے بچالے گا۔

محبین کے ساتھ اللہ کی یہ ادا ایسی ہے، جو ان کی اصلاح کے لئے ناگزیر ہوتی ہے،

اس لئے بالخصوص متوسط صوفی اکثر حالت قبض وحالت بسط کے درمیاں رہتا ہے۔ گناہ کی صورت میں قبض کی نوعیت سنگین ہوجاتی ہے اور حجاب کی صورت میں طالب کو سزا دی جاتی ہے۔ اس سزا سے طالب لرز جاتا ہے اور آہ وفریاد کرنے لگتا ہے۔

چنانچہ سزا بھگتنے کے بعد طالب کے دل پر کرم کی بارش ہونے لگتی ہے۔ بالخصوص متوسط صوفی پر یہ حالات زیادہ طاری رہتے ہیں، اس لئے کہ زیادہ مجاہدوں کی وجہ سے وہ نفس سے شدید معرکہ آرائی کی حالت میں ہوتا ہے اور دعویٰ اور دوسروں کی تردید کی اس کی نفسیات کروٹ لیتی رہتی ہے، متوسط طالب کو اکثر اضطراب اور بے چینی کی حالت میں رکھا جاتا ہے، اس سے مقصود طالب کے نفس میں موجود انانیت کے بت کو توڑنا ہوتا ہے، انانیت کا یہ بت اتنا طاقتور ہوتا ہے کہ وہ آسانی سے نہیں ٹوٹتا، طالب جب ایک عرصے تک اضطراب کے حالات سے گزرتا ہے تو یہ اضطراب اس میں عاجزی پیدا کردیتا ہے۔ اس طرح وہ فنائیت کے مراحل طے کرکے حالت بقا میں آتا ہے۔ (مرتب)

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ اتَّقُواْ اللّٰهَ وَكُونُواْ مَعَ الصَّادِقِيْنَ . (سورۃ التوبہ، آیت نمبر ۱۱۹)

(اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو)

اہل اللہ کی صحبت کی اہمیت

بعض افراد نے معیت کی تفسیر مخالطت اور مقارنت (اختلاط اور گھل مل جانا) سے کی ہے، جس طرح روح میں کی گئی ہے، اس میں صحبت صالحین کی ترغیب ہے۔

تشریح:

اس آیت میں صحبت کی تلقین ہے، صحبت اہل اللہ ایسی چیز ہے، جس سے بڑھکر زندگی میں صحتمند خطوط پر فیصلہ کن تبدیلی اور تہذیب نفس کی زیادہ بہتر اور مؤثر صورت کوئی نہیں ہے، دنیا میں علوم وفنون سیکھنے اور ان میں مہارت حاصل کرنے کا اصل طریقہ ہی استاد کے زیر نگرانی اور اس کی رہبری میں سیکھنے، سمجھنے اور علوم وفنون میں آگے بڑھنے کا ہے، استاد کے بغیر اپنے طور پر کتاب پڑھنے سے کوئی بھی علم وفن حاصل کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا، اس کی مثال اس طرح دی جاسکتی ہے کہ کسی فرد کو جو اَن پڑھ ہو، لیکن غیر

معمولی ذہین فرد ہو، اسے اگر کتاب دی جائے اور چھ ماہ تک کمرے میں بند کردیا جائے، اور اسے کہا جائے کہ کمرے میں اس کی ضرورت اور کھانے پینے کا اس کا مکمل انتظام ہوگا، وہ کمرے میں تنہا ہوگا اور چھ ماہ کی کوششوں سے وہ اس کتاب کو پڑھ ڈالے اور اس کے پڑھنے کی صلاحیت پیدا کرے، چھ ماہ گزرنے کے بعد اس کا امتحان لیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ وہ کتاب کا نہ صرف یہ کہ ایک صفحہ بلکہ ایک جملہ بھی نہ پڑھ سکا ہے، سبب یہ ہے کہ پڑھنے اور سکھانے کا اصل ذریعہ استاد ہے، استاد سے بے نیاز ہوکر، کسی بھی علم وفن میں فرد مہارت تو کیا، اس کے ابتدائی سلیقہ سے بھی آشنا نہیں ہوسکتا، ایک بہت بڑے سائنسدان نے لکھا ہے کہ مجھے اگر فلاں سائنسدان کی صحبت حاصل نہ ہوتی تو میں سائنسدان بن ہی نہ سکتا تھا۔

یہی اصول شخصیت کی تہذیب وتربیت، اس کے تزکیہ اور اس کے نفس کی اصلاح کے سلسلہ میں بھی ہے کہ تہذیب نفس اور تربیت نفس بذریعہ مربی ومعلم کے ہوتا ہے، معلم وہ ہوتا ہے، جو اللہ کی محبت واطاعت میں اپنی نفسی قوتوں کو فنا کرچکا ہوتا ہے، جو وحی کے ذریعہ انسانوں کی تعلیم وتربیت کرتا ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں معلم کی حیثیت سے بھیجا گیا ہوں، صحیح معلم وہی ہوتا ہے، جو اپنی صحبت کے ذریعہ افراد کو اخلاق عالیہ سے آراستہ کرتا ہے، انہیں انسانیت کے آداب سکھاتا ہے، انہیں اپنے خالق سے آشنا کرکے، اس کی اطاعت کا سلیقہ سکھاتا ہے، اس کے نفس کے اندر موجود گندگی کے ڈھیروں کی صفائی کا کارنامہ سرانجام دیتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تزکیہ وتربیت اور تہذیب نفس کا یہ منصب صحابہ کرام کی طرف منتقل ہوا، اس کے بعد ان کے صحبت یافتہ تابعین کی طرف، اس طرح امت میں یہ سلسلہ علماء ربانی کی طرف منتقل ہوتا رہا ہے، اس آیت میں سچوں کے ساتھ رہنے، ان کی معیت اختیار کرنے اور ان کی صحبت اختیار کرتے رہنے پر زور دیا گیا ہے، مربی ومزکی اور روحانی استاد کی صحبت کے بغیر فرد کا تزکیہ نہیں ہوسکتا اور اس کی تہذیب نفس کے عمل میں نہ صرف ارتقا نہیں ہوسکتا، بلکہ اس کے تہذیب نفس کے ابتدائی مراحل بھی طے نہیں ہوسکتے، اس لئے کہ چراغ چراغ سے ہی جلتا ہے، نفس کی اصلاح وتہذیب کے لئے جس سلیقۂ انسانیت کی ضرورت ہے، جو انوارحسن مطلوب ہیں، وہ مربی ومزکی اور اہل اللہ

کے پاس ہوتے ہیں۔

تہذیب نفس کے لئے نفس کی غیر معمولی ہولناک قوتوں، بلکہ نفس کے سب سے بڑے طاقتور درندے پر قابو پانے کا جو سلیقہ چاہئے، روحانی استاد ہی اس سلیقہ کا حامل ہوتا ہے۔

تزکیہ اور تربیت کے لئے اللہ کا یہ اصول ہے کہ اللہ نے ہر دور میں انبیاء کرام بھیجے، تاکہ وہ اپنی پاکیزہ صحبت کے ذریعہ انہیں معرفت نفس اور معرفت رب کے مراحل طے کرکے، انہیں مہذب بناسکیں، چنانچہ دنیا میں سوا لاکھ انبیاء کرام تشریف لائے، جب کہ کل کتابیں صحیفوں سمیت ۱۰۲ ہیں، اللہ کا یہ اصول بتاتا ہے کہ انبیاء کرام کے بعد اہل اللہ کی صحبت سے ہی تزکیہ کا عمل جاری ہوتا ہے، اہل اللہ کی صحبت کا عمل جوں جوں آگے بڑھتا ہے، اسی حساب سے فرد کی معنوی زندگی میں ارتقا کا عمل جاری رہتا ہے، صحبت کا عمل منقطع ہونے یا اس میں کمی آجانے کی وجہ سے فرد مادیت کی دلدل میں پھنسنے لگتا ہے، وہ حجابات، تاریکیوں اور ظلمات میں مبتلا ہوکر، معاشرے کے لئے باعث فساد ثابت ہوتا ہے، اس لئے کہ اس کے نفس کے اندر موجود درندہ طاقتور صورت میں موجود ہوتا ہے، جو اسے اپنی عزت، وقار، وانانیت اور مفادات کی خاطر دوسروں سے تصادم کے لئے اکساتا رہتا ہے۔

مربی کی صحبت اور تزکیہ کے بغیر فرد اگر علم کا دریا بھی ہوتو عام طور پر اس کی تہذیب نفس نہیں ہوتی، اس کی زبان سے پاکیزہ باتیں جاری ہوتی ہیں، لیکن اس کی اپنی عملی زندگی ان باتوں سے مناسبت نہیں رکھتی، مزاج کی سختی، ضد، تکرار اور حسد وجلن کی نفسیات اس پر غالب ہوتی ہے۔

ان ساری بیماریوں کا علاج مربی ومزکی کی صحبت کے ذریعہ ہی ہوسکتا ہے، صحبت سے مربی کی دل سے طاقتور پاکیزہ شعائیں منتقل ہوکر، طالب کے دل کی پاکیزگی کا ذریعہ بنتی ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ صحبت کا عمل کب تک جاری ہو، اس سلسلہ میں بعض اہل اللہ نے کہا ہے کہ جب تک فرد سیرت وکردار، اخلاق، محبت ورواداری کے معاملات میں ان جیسا نہ ہوجائے، تب تک صحبت سے دوری طالب کے لئے نقصان دہ ہوگی۔

اہل اللہ نے اس کو فنائیت کے عمل سے بھی تشبیہ دی ہے، جب تک صحبتِ مسلسل

کے ذریعہ طالب نفس کی فنائیت کے مراحل طے نہیں کرتا، تب تک اسے صحبت سے دوری ہرگز اختیار نہ کرنا چاہئے، اس لئے کہ ایسا کرنے سے نفس کی طاقتیں اس پر لوٹ کر حملہ آور ہوں گی، اور اس کے تربیت کے نظام کو معطل کر دیں گی۔

ویسے بھی دیکھا جائے تو ہر طرح کی صحبت اثر انداز ہوتی ہے، برائی کی عادتیں بڑے لوگوں کی صحبت کے ذریعہ ہی طاقتور ہوتی ہیں، اسی طرح نیکی کی عادتیں صالح لوگوں کی صحبت سے، لیکن اہل اللہ کی صحبت تو ایک نئی پاکیزہ اور معنوی زندگی کی تخلیق کا موجب ہوتی ہیں، اس لئے فرد اور افراد اگر چاہتے ہیں کہ وہ اللہ کے ساتھ وفاداری کے رشتے میں منسلک ہوں، اور اللہ کے بندوں کے ساتھ ان کے تعلقات صحتمند خطوط پر استوار ہوں، ان کے معاملات میں بہتری و پاکیزگی پیدا ہو، ان پر اللہ سے ملاقات کا احساس غالب ہو، ان کے لئے ہر طرح کی باطنی برائیوں سے بچاؤ کی صورت پیدا ہو تو انہیں اہل اللہ کی صحبت اختیار کئے بغیر چارہ کار نہیں، نفس اس راہ میں شدید حائل ہوگا، لیکن نفس کی مزاحمت کر کے بھی صحبت کے سلسلہ کو جاری رکھنا ضروری ہے، اس سے سعادت دارین کی راہ کھل جاتی ہے۔

امت میں اہل اللہ کو جو بھی سعادتیں اور مقام حاصل ہوا ہے، وہ اپنے مربی مزکی اور اہل اللہ کی صحبت سے ہی حاصل ہوا ہے، کوئی بھی اہل اللہ اپنے روحانی معالج اور مربی ومزکی کی صحبت کے بغیر اہل اللہ نہیں بنا ہے، یہ ایسی بات ہے جو ہماری تاریخ کی مسلمہ حقیقت ہے۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُواْ كَآفَّةً فَلَوْلاَ نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُواْ فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُواْ قَوْمَهُمْ. (سورۃ التوبہ، آیت نمبر ۱۲۲)

(اور مسلمانوں کو یہ نہیں چاہئے کہ وہ سب کے سب نکل کھڑے ہوں، سو ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت جایا کرے تاکہ باقی ماندہ لوگ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرتے رہیں اور تاکہ یہ لوگ اپنی قوم کو جب کہ وہ ان کے پاس آئیں انہیں ڈرائیں)۔

دینی کاموں میں ترتیب، ضروریات اور انتظام کا ہونا

اس میں دلیل ہے کہ دینی مہم کا انتظام ایسا ہونا چاہئے کہ دوسری مصروفیات جن میں

معاش بھی شامل ہے ان میں خلل نہ ہو۔

تشریح:

یہ آیت جہاد وقتال کے پس منظر میں ہے کہ جب جہاد بمعنی قتال درپیش ہو تو اس میں سب کے سب نکل کھڑے نہ ہوں، بلکہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں، جو فہم دین کے حصول میں مصروف ہوں، تاکہ وہ اپنے لوگوں کے پاس جائیں تو انہیں دین کی دعوت سے آشنا کریں، ان تک اللہ ورسول کی تعلیمات پہنچائیں اور ان میں دینی فہم پیدا کریں، مقصد یہ ہے کہ دین کا کوئی بھی شعبہ ایسا ہو، جو خالی ہو، جس کے لئے افراد کار موجود نہ ہوں، سارے دینی کاموں کا اہتمام وانتظام اس طرح ہو، جس سے دین کے دوسرے کام متاثر نہ ہوں، اس میں معاش کا مسئلہ بھی ہے، مسلمانوں کی معاشی ضروریات بھی ایسی ہیں، جو دوسرے دینی کاموں کی وجہ سے متاثر نہ ہوں۔

ہمارے یہاں اس دور میں بعض دینی طبقات میں سیاست اور سیاسی جدوجہد ایسی غالب ہوئی ہے کہ سارے وسائل اور ساری جدوجہد سیاست اور سیاسی تبدیلی میں صرف ہورہی ہے، ملت کے دوسرے کاموں، یعنی دینی تربیت، اخلاقی تربیت وغیرہ کے سارے کام متاثر ہیں۔

ایسا ہونا اسلام جیسے ہمہ گیر، اور ہمہ پہلو اور کامل دین کے تقاضوں کے منافی ہے۔

مسلمانوں میں اس بات کی فکر ہونا ضروری ہے کہ ان کا کوئی محاذ ایسا نہ ہو جو خالی ہو، اور جہاں سے دشمن حملہ آور ہو کر مسلمانوں کی فکر ونظر پر حملہ آور ہو، مثلاً اس دور میں ایک بڑا فکری اور نظریاتی محاذ ہے، مغربی فکر اور اس کی تہذیب کے ہمہ گیر غلبہ کی وجہ سے ہماری نسلیں مغربی فکر سے مرعوب ہو کر الحاد، دہریت اور سیکولرزم کی طرف تیزی سے جارہی ہیں الحادی تحریکوں کی روک تھام اور فکری اور نظریاتی محاذ پر علمی طور پر پوری پاکستانی ملت میں کوئی ایک بھی طاقتور ادارہ موجود نہیں ہے، جو اس کے مقابلے اور اسلام کی جدید اسلوب میں پیش کش کے لئے بہتر اور مؤثر طور پر کام کرتا ہو، اس کے لئے پوری طرح منصوبہ بندی سے سرگرم ہو۔

اس آیت میں اس طرح کے سارے کاموں کی اہمیت ظاہر فرمائی گئی ہے۔

إِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَ نَا وَرَضُواْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّواْ بِهَا. (سورۃ یونس، آیت نمبر۷)

(جن لوگوں کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے اور وہ دنیوی زندگی پر راضی ہوگئے ہیں اور اس میں جی لگا بیٹھے ہیں)۔

ختم ہونے والی دنیا میں گم ہونا

دنیا کی زندگی پر راضی رہنا اور اس پر مطمئن ہونے کی مذمت کرنا، یہ ان دونوں کے مذموم ہونے پر دلیل ظاہر ہے۔

تشریح:

دنیوی زندگی کی راحت کا سامان ایسا ہے، جو لوگ بھگ ہر فرد کو اپنی طرف کھینچتا ہے لیکن دنیوی زندگی پر راضی ہونا اور اس سے طمانیت حاصل کرنا ایسی چیز ہے جو بندہ مؤمن کے شان کے بالکل منافی ہے، یہ کفار کی بڑی علامت ہے، ایسی لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہی ہے، دنیوی نعمتوں سے محبت کا ہونا اور ان کو مقصود بنانا، اپنی ساری سرگرمیوں کا ہدف اسی کو قرار دینا، مذہب کو محض رسمی حیثیت دینا اس آیت میں ایسے لوگوں کیلئے سخت انتباہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی کل زندگی چند لمحوں یا چند دنوں سے زیادہ نہیں ہے، فرد کی زندگی کے ساٹھ ستر سال اس طرح گزر جاتے ہیں کہ پیچھے مڑکر جب وہ دیکھتا ہے تو اسے ساری زندگی چند لمحوں سے زیادہ نظر نہیں آتی، آخر باپ، دادا، پردادا بھی اس دنیا میں آئے تھے نا، اب ان میں سے کوئی نہ رہا، اتنی ناپائیدار اور عارضی زندگی پر خوش اور مطمئن رہنا اور دل کی ساری چاہتیں اس سے وابستہ کرنا سب سے بڑی نادانی ہے، جس کا نتیجہ دائمی زندگی میں عذاب کی صورت میں بھگتنا پڑے گا، سنبھلنے اور بیدار ہونے کی ضرور ہے، مرنے کے بعد دوبارہ موقعہ ہرگز نہ ملے گا۔

دنیاوی زندگی کی راحت اور عیش وعشرت کو مقصود کی حیثیت دینا، یہ تو مادہ پرست قوموں کا وتیرہ ہے، مادہ پرست قوموں کی اس روش کو اپنی روش بنانا عقل میں خلل ہی کا نتیجہ ہے اور کچھ نہیں۔

مادی دنیا پر راضی اور مطمئن ہونا اور آخرت کی زندگی کو عملی زندگی میں بے معنیٰ وبے

حقیقت سمجھنا، یہ ہر دور کے انسان کی سب سے بڑی بیماری رہی ہے، جو انسان کی تباہی اور سارے فساد کی جڑ ہے۔

مادی دنیا میں استغراق وفنائیت، اس دور کے سب سے بڑے مرض کی صورت اختیار کرگیا ہے، ہر باصلاحیت فرد چاہتا ہے اور اس کے لئے کوشاں ہے کہ اس کے پاس دنیا اور راحت دنیا کا زیادہ سے زیادہ سامان موجود ہو، دنیا کے لئے اس تگ ودو کی وجہ سے آخرت کی دائمی زندگی کی تیاری کی فکرمندی لگ بھگ رخصت ہوگئی ہے، اس طرح فرد وافراد دنیا میں گم ہوکر، اپنے آپ کو فانی دنیا میں ہی فنا کر دیتے ہیں، اور اپنا قصہ پورا کر دیتے ہیں، جو سب سے بڑے المیہ کی بات ہے اور دکھ کی بات یہ ہے کہ نئی نسلوں سے یہ ادراک وشعور ہی سلب ہوگیا ہے کہ وہ چند دنوں کی دنیا کے مستقبل کی بہتری میں مستغرق ہوکر، آخرت کی دائمی زندگی کا کتنا بڑا نقصان کر رہے ہیں۔ دنیا اور نوجوانی کا نشہ اتنا خطرناک ہے کہ فرد، عام طور پر دنیا کے راحت کے سامان کے حصول کی جدوجہد میں مستغرق ہوکر اپنا قصہ تمام کر لیتے ہیں اور ابدی زندگی کو برباد کردیتے ہیں۔ یہ بات ایسی ہے جس کا تصور کرتے ہی دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے۔ (مرتب)

الذین احسنو الحسنیٰ وزیادہ (سورۃ یونس، آیت نمبر۲۶)

(جن لوگوں نے نیکی کی ہے ان کے واسطے بہتری ہے اور اس سے زیادہ بھی)

اللہ کی زیارت کا آخرت کی ساری نعمتوں سے افضل ہونا

حدیث مسلم میں اس کی تفسیر رویت باری تعالیٰ (اللہ کے مشاہدے) سے آئی ہے اور اس کو زیادت فرمانا، اس بات پر دلیل ہے کہ یہ آخرت کی ساری نعمتوں سے زیادہ افضل ہے۔

تشریح:

نیکوکاروں کے لئے آخرت میں جنت کی خوش خبری ہے، جو بہت بڑی نعمت ہے، لیکن جنت میں نیکوکاروں کو سب سے بڑی نعمت جو عطا ہوگی، وہ اللہ کا دیدار ہوگا، اللہ جو کائنات میں موجود سارے حسن کی خالق ہستی ہے، جنت میں موجود سارا حسن اسی ہستی کے حسن کا عکس ہے، اس ہستی کا دیدار اور اس کا براہ راست مشاہدہ ایسی چیز ہے، جس کے تصور ہی سے فرد مسرت کے بے پناہ احساسات سے لبریز ہوجاتا ہے، کہاں یہ خاکی بندہ

اور کہاں اللہ کی ہستی کے حسن کا مشاہدہ۔

نیکوکاروں سے اللہ کا یہ وعدہ ہے، اگر بندہ مؤمن اللہ تبارک وتعالیٰ کی اس خوش خبری کا استحضار کرے تو وہ دنیا میں اللہ کے لئے فنا ہوجائے اور دنیا میں اپنے کم سے کم حصے پر راضی ہوکر، ذکر وفکر کے غیر معمولی مجاہدوں سے کام لے اور اس طرح دل وروح کو محبوب کے انوارِ حسن سے فیضیاب کرلے، آخرت میں اللہ کا دیدار براہ راست ہوگا، جب کہ اس دنیا میں اللہ کے ذکر پر غیر معمولی مجاہدوں کی برکت سے دل وروح اللہ کے انوار حسن کے اجزاء سے فیضیاب ہوتے ہیں، جس سے خود دنیا میں بندہ مؤمن کے سارے جذباتِ حسن کی تسکین ہونے لگتی ہے۔

ومایتبع اکثرھم الا ظنا (سورۃ یونس، آیت نمبر۳۵)

(اور ان میں سے اکثر لوگ بے اصل خیالات پر چل رہے ہیں)

فلاسفروں کی فکر سے بچنے کی ضرورت

اور اس کی صورت

روح میں ہے کہ اس سے رسمی علماء بہت کم محفوظ ہیں، چنانچہ اکثر اہل ظاہر متکلمین کے دلائل (ذات وصفات کے بارے میں) ایک دوسرے سے مختلف پائے جاتے ہیں (جو گمان کا نتیجہ ہوتا ہے) پس جو شخص ان سے بچنا چاہے، وہ سلف صالحین کا اتباع کرے اور فلسفوں میں مشغول نہ ہو، جس سے شکوک وشبہات بڑھنے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

تشریح:

فلاسفر اور متکلمین کی فکر کی بنیاد عقل محض ہوتی ہے اور عقل محض ایسی ہوتی ہے جو حقائق تک رسائی سے قاصر ہوتی ہے، فلاسفروں نے ہر دور میں اپنی عقلی موشگافیوں کی وجہ سے بے شمار افراد کو گمراہ کیا ہے، خود اس دور میں بڑے مادہ پرست فلاسفر پیدا ہوئے، جنھوں نے اپنی گمراہ کن فکر سے دوسرے مذاہب سے وابستہ لوگوں کے ساتھ ساتھ مسلم دنیا کے لاکھوں بلکہ کروڑوں افراد کو شکوک وشبہات سے بھر دیا اور ان کے ذہن کو اللہ کے وجود تک سے متزلزل کردیا۔

جدید مغربی تعلیمی نظام دراصل ان مادہ پرست فلاسفروں کے فکر ہی سے ماخوذ ہے

جو ان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے اور جو مسلم معاشرے پر بھی مسلط کردیا گیا ہے، اس نظام تعلیم میں شکوک وشبہات کے ایسے زہریلے اثرات موجود ہیں کہ اس سے فارغ افراد کی اکثریت دین اسلام کو کوئی اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں ہوتی، اس لئے کہ وہ ذہنی طور پر مغرب کے مادہ پرست فکر سے مرعوب ومتاثر ہیں اور مادی ترقی ہی ان کا ہدف بن جاتی ہے، اب تو دینی مدارس بھی جدید مغربی تعلیم کو اپنے نصاب کا حصہ بنانے پر تیار ہوچکے ہیں اور اس کے انتظامات ہو رہے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ جدید نظام تعلیم کی بنیاد میں مادہ پرستی کی فکر شامل ہے، اس نظام تعلیم کی خاصیت ہی یہی ہے کہ وہ مادی جذبات وخواہشات کو مشتعل کرتا ہے اور دین مذہب پر اعتماد کو مجروح کرتا ہے۔اور آخرت کے مقابلہ بجائے دنیا کو ترجیح دینے کی راہ پر گامزن کرتا ہے۔

ہمارے لئے صحیح راہ عمل وہی ہے، جس کا حکیم الامت نے حاشیہ میں ذکر فرمایا کہ فلاسفروں کی فکر کے بجائے سلف صالحین کی فکر کو اپنایا جائے، دین کی صحیح راہ پر گامزن ہونے اور سلامتیٔ ایمان کا یہی راستہ ہے۔

پہلے دور کے فلاسفروں اور موجودہ دور کے فلاسفروں کے درمیاں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ اس دور کے مادہ پرست فلاسفروں کی فکر کو عالمی طاغوتی قوتوں اور عالمی سرمایہ دار کی مکمل سرپرستی حاصل ہے اور عالمی سطح سے لے کر قوموں اور ریاستوں کی سطح تک اور ان کے اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ میں اس فکر کی روح شامل کردی گئی ہے، عالمی سامراجی قوتوں نے مادہ پرستی پر مبنی اس فکر کو اپنی تہذیب کا حصہ بنایا ہے اور اس تہذیب کو پوری دنیا پر مسلط کرنے کے کام کو اپنی زندگی اور موت کا مسئلہ بنالیا ہے، چنانچہ ان کی پوری کوشش ہے کہ مسلم دنیا اس مادی فکر اور مادہ پرست تہذیب کو اختیار کرلے، اب تک دینی مدارس اس راہ میں حائل تھے لیکن اب دینی مدارس بھی جدید مادی علوم کی طرف راغب ہوکر، بالواسطہ طور پر مادہ پرست فلاسفروں کے فکر کے جراثیم کو مدارس کے ماحول میں پروان چڑھانے کی راہ پر گامزن ہیں۔

مادہ پرست عالمی قوت اور عالمی سرمایہ دار دینی مدارس سے جو کام دھمکیوں کے ذریعہ نہیں لے سکا، وہ کام ترغیب سے لینے میں کامیاب ہوا ہے، اس پر شدید تشویش کے اظہار کے سوا اور کیا کیا جاسکتا ہے۔ دینی مداس تزکیہ واحسان کے کام کو تو اپنے نصاب کا

حصہ بنانے کے لئے تیار نہیں، لیکن جدید انگریزی تعلیم کو حصہ بنانے پر آمادہ ہیں۔

خالص مادی نوعیت کی تعلیم، مادی فلسفہ کو اپنے ساتھ لاتی ہے، اس کے ازالہ کی صورت اللہ کی محبت ہی ہے، اس محبت کو فیصلہ کن اہمیت دینے سے ہی اس کے مضر اثرات سے بچا جاسکتا ہے، اس کے مضر اثرات سے بچاؤ کی دوسری کوئی صورت موجود نہیں۔

ہمارا ایک دور تو وہ تھا کہ ہماری درسگاہوں کا نظام ریاست کو جملہ قسم کے افراد فراہم کرتا تھا، کلارک بھی، آفسر بھی، حکیم بھی، معلم بھی، انجینئر بھی، ماہرین حساب، ماہرین آب پاشی وغیرہ وغیرہ، لیکن وہ دور دنیا میں مسلمانوں کے غلبہ کا دور تھا، اور مسلم ریاستیں سامراج کے فکری اور تہذیبی اثرات سے آزاد تھی، اب جو دور آیا ہے، اس میں ہماری ساری ریاست اور سارے مؤثر طبقات مغربی فکر اور اس کی تہذیب کے غلبہ کی فضا میں سانس لے رہے ہیں اور وہ ذہنی، فکری، معاشی اور معاشرتی طور پر بُری طرح ان کی غلام ہیں اور یہ غلامی دراصل ان کے نظام تعلیم کو اپنانے کے نتیجہ میں ہی حاصل ہوئی ہے، اس طرح کے فاسد عالمی حالات، فاسد ریاستی نظام اور فاسد تعلیمی نظام کی صورت میں مغرب کے علمی اور فکری کو ورثہ دینی مدارس کا حصہ بنانا، بہت سارے مضرات کو اپنے ساتھ لانے کا باعث بنے گا، عالمی شاہوکار کی یہی خواہش ہے کہ ایسا ہی ہو۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اس وقت حالات ایسے ہیں کہ ہماری تہذیب، مذہبی وثقافتی اقدار، دینی شعائر، ہمارا اخلاقی وروحانی نظام اور ہمارے معاشرتی نظام کو مغرب کی طرف سے شدید خطرہ درپیش ہے، مغرب پچھلے دوسو سال سے مسلمان دنیا کے جملہ وسائل پر قبضہ کے لئے کوشاں رہا ہے، اس میں وہ کامیاب بھی ہوا ہے، وہ اس کامیابی کو مستحکم کرنا چاہتا ہے، مغرب سمجھتا ہے کہ جب تک مسلم معاشرے میں دینی حمیت، دینی غیرت اور اپنے جداگانہ امتیازی تہذیبی تشخص کا جذبہ موجود ہے، اس وقت تک اس کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکے گا، اس لئے کہ مسلم معاشرے کو دین ومذہب سے مکمل طور پر باغی بنانے کے لئے جب بھی مغرب زدہ افراد کی کاوشیں تیز ہوتی ہیں اور اس سلسلہ میں میڈیا پر مہم چلائی جاتی ہیں اور حکومت کی طرف سے اقدامات ہوتے ہیں تو دینی مدارس سے وابستہ افراد اور دعوتی تحریک کے لوگ دینی حمیت کا مظاہرہ کر کے ملک بھر میں ہلچل برپا کردیتے ہیں، جس سے مسلم معاشرے کو پوری طرح بے حمیت بنانے اور مادی تہذیب سے ہمہ آہنگ بنانے میں

ناکامی ہوتی ہے۔

مدارس میں جدید تعلیم شروع کرنے کے لئے مغرب عرصہ سے اپنے ہمنوا حکمرانوں کے ذریعہ دباؤ ڈالتا رہا ہے، لیکن اس کوشش میں اب اسے پہلی بار بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی ہے کہ دینی مدارس کے زعماء نے رضا کارانہ طور پر جدید تعلیم کو مدارس کا حصہ بنانے کے عمل کا آغاز کردیا ہے اور اس میں آہستہ آہستہ مزید ترقی کا عمل جاری رہے گا۔

ہماری نظر میں یہ کام اخلاص نیت سے ہو یا اس میں مصلحتیں شامل ہوں، ہر اعتبار سے اس کے نتائج ملت اسلامیہ کے لئے مضر ثابت ہوں گے۔

مسئلہ کسی زبان (انگریزی زبان) کو نصاب کا حصہ بنانے یا نہ بنانے کا نہیں، بلکہ مسئلہ جدید تعلیم کے بہانے سے اپنی تہذیبی حمیت سے دستبرداری، جدید فکر سے اثر پذیری اور مادی تہذیب سے مرعوبیت کا ہے، یہ ساری چیزیں ایسی ہیں، جو جدید تعلیم کی خصوصیات میں شامل ہیں، مولانا تھانویؒ کے بقول کانٹوں کے پودے پر میٹھے پانی کی کتنی ہی بالٹیاں انڈیل دیں، اس سے کانٹوں کا درخت ہی ابھرے ہوگا، کوئی پھل آور درخت سامنے نہیں آئے گا۔

اب تک کا ہمارا تجربہ یہی ہے کہ دینی مدارس کے جو بھی فارغ علماء امتحانات دے کر کالجوں اور یونیورسٹیوں میں لیکچرار بنے، ان کی اکثریت اپنی مذہبی شناخت کو قائم وبرقرار رکھنے میں بُری طرح ناکام ہوئی ہے، ڈاڑھیاں مختصر ہوگئیں، نمازیں متاثر ہوئیں، بہتر سے بہتر اور خوشحال مادی زندگی کا حصول مقصود بن گیا۔

ان تجربات کو دیکھتے ہوئے حکیم الامت کے مذکورہ قرآنی حاشیہ پر ہمارے فضلا وزعماء کو ازسرنو غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔

دینی مدارس کے اہداف میں علم کے ساتھ ساتھ تقویٰ، تعلق مع اللہ، کردار کی بلندی، زہد وفقر، محبت ورواداری، دنیا واہل دنیا سے بے نیازی، افراد معاشرہ کی آخرت کی زندگی بنانے کے لئے فکر مندی، حمیت دین اور دعوتی صلاحیتوں کے حامل علماء تیار کرنے جیسے اہداف شامل تھے۔ لیکن اس اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اب یہ اہداف ایک حد تک پس منظر میں چلے گئے ہیں، بڑی بڑی عمارتوں کی تعمیر، ظاہری خوبصورتی، مالداروں سے تعلقات کا استحکام، جامعات کے لئے زیادہ سے زیادہ مال کی فکرمندی اور اس کے

لئے منصوبہ بندی وغیرہ یہ ساری چیزیں اب مدارس کی ترجیحات میں اولیت اختیار کر گئی ہیں، چنانچہ دینی مدارس کے طلبہ کی ذہنی نشوونما میں مدارس کی ظاہری شان وشوکت کا رنگ غالب ہونے لگاہے اور فارغ شدہ ہر ذہین عالم میں اسی نوعیت کے اپنے مدارس قائم کرنے کے میلانات غالب ہوئے ہیں، اس طرح مزاج میں دنیا کو ترجیح دینے کا رجحان پیدا ہوا ہے، معاشرے کو دینی واخلاقی اعتبار سے سنبھالنے کا کام، دعوتی وتربیتی کام، آخرت بنانے کی فکرمندی کا کام، زہد وفقر کی مثالیں پیش کرنے کا کام، کردار میں نورانیت پیدا کرنے کا کام، یہ سارے کام ایسے ہیں، جو عام طور پر مدارس کی ترجیحات میں قابل ذکر حیثیت اختیار نہ کر سکے ہیں، ان حالات میں مدارس میں جدید تعلیم کا اہتمام، علماء کرام کو دنیاداری کی راہ پر گامزن ہونے کا ذریعہ بنے بغیر رہ سکے، دشوار نظر آتا ہے۔

اگر مدارس میں تقویٰ، زہد اور کردار میں نورانیت پیدا کرنے کا خصوصی اہتمام موجود ہوتا تو اس صورت میں تو جدید تعلیم یقیناً افادیت کی حامل ہوتی، اور وہ جدید طبقات میں دعوتی کام کے فروغ اور ان کی بہتر ذہن سازی کا موجب ہوتی۔

لیکن ہماری نظر میں موجودہ صورتحال میں جدید تعلیم کو مدارس کا حصہ بنانے سے مدارس سے وابستہ طلبہ کی دینی واخلاقی زندگی کو خطرات درپیش ہوں گے۔

حکیم الامت کے مذکورہ حواشی کے حوالے سے گفتگو کا رخ مدارس کی طرف مڑ گیا ہے، جس کے لئے یہ عاجز معذرت خواہ ہے۔

بل كذبوا بمالم يحيطوا بعلمه ولما ياتهم تاويله (سورۃ یونس، آیت نمبر۳۹)

(بلکہ ایسی چیز کو جھٹلانے لگے، جس کو اپنے احاطہ علمی میں نہیں لائے اور اب تک ان کو اخیر نتیجہ نہ ملا۔)

غور وفکر سے کام نہ لینے کا نتیجہ

روح میں ہے کہ یہ ان لوگوں کی مذمت ہے، جو پوری طرح غور وفکر اور حقیقت تک رسائی کے لئے تدبر سے کام لئے بغیر انکار کی روش اختیار کرتے ہیں اور اس میں جلدی کرتے ہیں، یہی عادت ہے بزرگوں کے منکرین کی (جو اہل اللہ ہیں) وہ نہ تو ان کے کلام پر غور کرتے ہیں، نہ ہی ان اصطلاحات کو سمجھتے ہیں، جن پر وہ کلام مبنی ہے اور یوں

ہی انکار کر بیٹھتے ہیں، حالانکہ ان کو تو ایسی حالت میں تحقیق اور تدبر کی ضرورت تھی۔

تشریح:

اکثر لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ قرآن پر غور وفکر سے کام نہیں لیتے اور اس کا انکار کردیتے ہیں، اس دور میں بھی انسانوں کی بڑی اکثریت اللہ کے کتاب کی طرف آنے کے لئے تیار نہیں، اللہ تعالیٰ نے خود انسان کی شخصیت کی گہرائیوں اور نظام کائنات میں ایسی نشانیاں رکھی ہیں، جن پر غور وفکر کے نتیجہ میں خالق کائنات تک رسائی ہوسکتی ہے، لیکن مادیت میں استغراق کی وجہ سے انسان ایسا کرنے سے قاصر ہے۔

اہل اللہ جو قرآن کے فیوض وبرکات سے بہرہ ور ہوتے ہیں، ذکر میں مداومت کے نتیجہ میں جن پر اللہ کی طرف سے معارف وحقائق کھول دیئے جاتے ہیں، ان کے ساتھ بھی حالت یہ ہے کہ علم واستدلال اور ذہانت کے پردے میں ان کی تردید میں اپنی توانائیاں خرچ کی جاتی ہیں، حالانکہ اگر ان کے کلام پر دل کی گہرائیوں سے غور وفکر کرتے اور ان کی اصطلاحات کا فہم حاصل کرتے تو اہل اللہ کا یہ کلام انہیں اللہ کی محبت ومعرفت کی راہ پر گامزن کرنے کا ذریعہ بنتا۔

يا ايها الناس قدجاء تكم موعظة من ربكم وشفاء لما فى الصدوروهدىٰ ورحمة للمؤمنين (سورۃ یونس، آیت نمبر۵۷)

(اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایسی چیز آئی ہے، جو نصیحت ہے اور دلوں میں جو روگ ہیں، ان کے لئے شفاء ہے اور رہنمائی کرنے والی ہے اور رحمت ہے ایمان والوں کے لئے۔

دلوں کے امراض کا جسمانی امراض سے شدید تر ہونا

یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ دلوں میں بھی امراض ہوتے ہیں، دلوں کی بیماریاں جسمانی بیماریوں سے زیادہ شدید ہوتی ہیں، جیسے شک، نفاق اور حسد وغیرہ۔

تشریح:

دلوں کی بیماریاں ایسی ہوتی ہیں جو فرد، افراد، پورے معاشرے اور ریاست کے جملہ نظام کو فساد سے بھر دیتی ہیں، دنیا میں موجود سارا فساد دلوں کی بیماریوں ہی کا نتیجہ ہوتا

ہے، بلکہ ہر شعبہ زندگی سے وابستہ افراد میں تصادم، تناؤ، کشیدگی، تعصب، دولت کے حصول کے لئے جنگ، باہم ایک دوسرے سے نفرت وغیرہ یہ ساری چیزیں نتیجہ ہے دلوں کی بیاریوں کا، دلوں کی بیماریاں جسمانی بیماریوں سے شدید ترین ہوتی ہیں، جسمانی بیماری کے نتیجہ میں فرد اگر موت سے دوچار ہوتا ہے تو اس سے جسمانی موت واقع ہوتی ہے، اور فرد کی دنیاوی زندگی کا نقصان ہوتا ہے، جب کہ دلوں کی بیماری کی وجہ سے دلیں مردگی سے دوچار ہوجاتی ہیں اور دلوں کی یہ بیماریاں دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت کی ابدی زندگی میں بھی فرد وافراد کے لئے ہلاکت کا باعث ثابت ہوں گی، لیکن بدقسمتی سے تکبر، بڑے پن اور اپنے علمی زعم کی وجہ سے اس سلسلہ میں روحانی ماہرین اور دلوں کے حقیقی معالج اہل اللہ کی طرف رجوع کرنے سے انکار کی روش غالب ہے، جسمانی بیماریوں کے علاج کی فکر تو غالب ہے اور اس سلسلہ میں ماہر سے ماہر معالج کی تلاش رہتی ہے، لیکن دلوں کی بیماریوں کا ادراک سلب ہونے کی وجہ سے اس کی فکر نہ ہونے کے برابر ہے، ہمارے جملہ تعلیمی اداروں میں دلوں میں موجود امراض کے سلسلہ میں ادراک پیدا کرنے کی کوششیں بھی نہ ہونے کے برابر ہیں، یہ انسانیت اور مسلم ملت کا سب سے بڑا المیہ ہے، جس کی وجہ سے انسانیت خود دنیا میں چھوٹے سے جہنم کے منظر سے دوچار ہے۔

آج مادی علوم وفنوں اور مادی نوعیت کی تحقیق پر جو کام ہورہا ہے اور جو صلاحیتیں صرف ہورہی ہیں، اگر اس تحقیق کا ایک ہی حصہ دلوں اور روحانی بیماریوں کی تشخیص اور اس کے معالجہ پر صرف ہوتا تو انسانیت کی موجودہ قابل رحم حالت میں بنیادی تغیر واقع ہوتا، لیکن مادہ پرست افراد معاشرہ کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ مادہ اور مادی دنیا سے بلند ہوکر سوچنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتے۔

كذالك نطبع علىٰ قلوب المعتدين (سورۃ یونس آیت نمبر ۷۴)

(اللہ تعالیٰ اسی طرح کافروں کے دلوں پر مہر لگادیتے ہیں)۔

استعداد میں فساد پیدا ہونے کی صورت

یہ طبع (مہر لگانا) وہی ہے، جسے استعداد (وصلاحیت) میں فساد پیدا ہونے کے معنیٰ میں استعمال کیا جاتا ہے۔

تشریح:

نیکی کے کاموں میں سستی وغفلت کا مظاہرہ اور عاداتِ بد کو مستحکم کرنے کا جو نتیجہ ظاہر ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ طبیعت میں فساد پیدا ہونے لگتا ہے اور نیکی کو قبول کرنے یا اسے اختیار کرنے کے لئے طبیعت مائل نہیں ہوتی، اسی کو اللہ نے مہر لگانے سے عبارت کیا ہے، اگرچہ یہ فرد وافراد کی اپنی کارگزاری ہوتی ہے، جس کا نتیجہ مہر لگنے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، لیکن اشیائے کائنات کا خالق ہونے سے اس کا انتساب اللہ نے اپنی طرف کیا ہے۔

اس لئے بزرگوں نے کہا ہے کہ نیک اعمال میں تاخیر سے ہرگز کام نہ لیا جائے ورنہ نیک اعمال کی توفیق سلب ہونا شروع ہوجاتی ہے، ظاہری اعمال کے ساتھ باطنی اعمال صالحہ میں بھی چستی سے کام لیتے رہنے کی ضرورت ہے، ورنہ عادات بد کے استحکام کی وجہ سے اصلاح کی راہیں مسدود ہوجاتی ہیں۔

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ. (سورۃ یونس، آیت نمبر ۸۵)

(اے ہمارے پروردگار ہمیں ان ظالموں کا تختۂ مشق نہ بنا)۔

دعا کا توکل کے منافی نہ ہونا

دعا، توکل کے منافی نہیں، یہ سمجھنا کہ دعا توکل کے منافی ہے اور اگر پریشانی میں دعا مانگی جائے تو توکل باقی نہ رہے گا، صحیح اسباب پیدا کرنے والے پر نظر رکھتے ہوئے دنیاوی اسباب کو اختیار کرنے سے توکل میں کمی نہیں آتی، تو دعا سے جو مادی سبب سے بہت دور ہے، اس سے توکل میں کمی کیسے واقع ہوسکتی ہے۔

تشریح:

بندہ مؤمن کا سب سے بڑا سہارا دعا ہی ہے، اس کی ہر مشکل کا حل دعا میں پوشیدہ ہے، دعا، توکل کے خلاف ہرگز نہیں، البتہ متوسط صوفی ذکر میں ایسا مستغرق ہوتا ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ دعا والا وقت بھی وہ ذکر ہی میں خرچ کردے، حدیث شریف کے مطابق ایسے فرد کو دعا مانگنے والوں سے زیادہ عطا کردیا جاتا ہے، دعا تو ایسی چیز ہے کہ زندگی کے کسی بھی موڑ پر اس کا سہارا نہ چھوڑنا چاہئے، بندہ مؤمن کی نفسیات تو یہ ہونی چاہئے کہ وہ ہر معاملہ میں دعا کے بغیر رہ نہ سکے۔ (مرتب)

لَمَّا آمَنُوا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ. (سورۃ یونس، آیت نمبر ۹۸)
(جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے ان پر دنیاوی زندگی میں رسوائی کے عذاب کو ٹال دیا)۔

مرید کو ملنے والے فیض کا بعض اوقات شیخ کو علم نہ ہونا

اس میں دلالت ہے، اس بات پر مرید کو ایسا فیض ہو، جس کی شیخ کو خبر نہ ہو، جیسا یونس علیہ السلام کو ان کے قبول ایمان کی اطلاع نہ ہوئی، گو فیض شیخ ہی کی برکت سے ہو، جیسا ان کا ایمان حضرت یونس علیہ السلام کی برکت سے ہوا۔

تشریح:

بعض مریدوں کو بڑی قابل قدر کیفیات حاصل ہوتی ہیں اور ان کے عجیب وغریب حالات ہوتے ہیں، یا وہ صبر وشکر وسخاوت میں بہت آگے بڑھ جاتے ہیں، ذکر میں ان کو حلاوت بھی بہت ہوتی ہے، کشف وخواب میں انہیں بشارتیں بھی ملتی رہتی ہیں۔ یا اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے انہیں بے پناہ خوشی محسوس ہوتی ہے۔ یہ اگرچہ شیخ کی صحبت کی برکت کا نتیجہ ہوتا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ شیخ کو اس کا علم بھی ہو۔ شیخ چونکہ ذکر وفکر کے غیر معمولی مجاہدوں سے حالت فنا سے حالت بقا میں آ چکا ہوتا ہے، اس لئے وہ سکون وسکینت سے سرشار ہوتا ہے، اللہ کی رضا پر راضی ہوتا ہے، صبر وشکر کا پیکر ہوتا ہے، اخلاص وللھیت اور بے نفسی سے سرشار ہوتا ہے، دنیا کے بارے میں اس کا دل سرد ہو چکا ہوتا ہے، اس لئے شیخ کی صحبت اور ان کے دیئے ہوئے ذکر کی برکت سے سالکوں میں شیخ کے ان اوصاف کے اجزا منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ (مرتب)

أَفَأَنتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ. (سورۃ یونس، آیت نمبر ۹۹)
(سو کیا آپ لوگوں پر زبردستی کر سکتے ہیں کہ وہ ایمان ہی لے آئیں)۔

دوسروں کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں

جب دین کی بات پہنچائی جائے تو پھر اس کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں۔

تشریح:

دینی بات پہنچادینا، بغاوت یا گناہ سے آگاہ کرنا، حکمت کے ساتھ ظاہری و باطنی

بیماریوں کی طرف توجہ دلانا کافی ہے، پیچھے پڑنا صحیح نہیں، اس کے فوائد کم اور نقصانات زیادہ ہیں۔ پیچھے پڑنے سے ضد اور دشمنی پیدا ہونے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے اور حجابات بڑھنے لگتے ہیں۔ جبکہ حکمت سے بات بتانا اور کمزوریوں کی نشاندہی کرنے سے یہ صورتحال پیدا نہیں ہوتی۔ (مرتب)

قُلِ انظُرُوا مَاذَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ. (سورۃ یونس، آیت نمبر ۱۰۱)
(آپ کہہ دیجئے کہ تم غور کرو کہ کیا کیا چیزیں ہیں آسمانوں میں اور زمین میں)۔

مظاہر قدرت سے معرفت حاصل کرنا

اس آیت میں دلیل ہے کہ خلق پر حق کے لئے نظر کرنا، اللہ کی طرف نظر کرنے کے منافی نہیں ہے۔

اس حاشیہ کو محترم حافظ فضل الرحیم نے ان الفاظ میں پیش فرمایا ہے۔

شرعی حدود کا خیال رکھتے ہوئے مخلوق کو دیکھنا، اس وجہ سے کہ خالق کی پہچان حاصل ہو، بالکل درست عمل ہے، جیسا کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ، جابجا مظاہر قدرت کی طرف توجہ فرماتے ہیں، تاکہ اپنے رب کی معرفت حاصل ہو، جیسے کہ فرمایا گیا کہ تم نے نہیں دیکھا کہ کیسے اللہ تعالیٰ نے سات آسمان تہہ بتہہ پیدا فرمائے، کیا تم نے اونٹ کو نہیں دیکھا وغیرہ۔

تشریح:

اشیائے کائنات پر غور وفکر اور ان کے مشاہدے سے معرفت کا عجیب وغریب علم حاصل ہوتا ہے، اللہ کی قدرت اور اس کی شان عظمت کے رازوں سے آگاہی حاصل ہوتی ہے، اس لئے قرآن میں اس پر زور دیا گیا ہے، یہ علم ومعرفت کا ایک اہم ذریعہ بھی ہے، اشیائے کائنات پر تھوڑا بہت غور وفکر کرنے سے فرد جب اس کا مشاہدہ کرتا ہے تو وہ کائنات کی وسعت اور پھیلاؤ پر انگشت بدنداں ہوجاتا ہے، اور اللہ کی شان عظمت کا نقش اس پر ثبت ہونے لگتا ہے، "دنیا کے چالیس سائنسدانوں کی گواہی" کے نام سے چھپنے والی کتاب میں ہر سائنسداں نے اپنی تلاش وتحقیق کے نتیجے میں اللہ کے اس عظیم الشان نظام پر اس کی تسبیح وتحمید کی ہے اور اللہ واحد کے سامنے سجدہ ریزی کی

راہ اختیار کی ہے۔ (مرتب)

مَن كَانَ يُرِيْدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لاَ يُبْخَسُون. (سورۃ ہود، آیت نمبر ۱۵)

(جو شخص محض دنیوی زندگی اور اس کی رونق چاہتا ہے تو ہم ان لوگوں کے اعمال کو دنیا میں ہی پورے طور سے بھگتا دیتے ہیں اور ان کے لئے دنیا میں کوئی کمی نہیں ہوتی)۔

آخرت کی قیمت پر دنیا کی بہتری

روح میں ہے کہ اس کی تفسیر اس طرح ہے کہ جو شخص اپنے آخرت کے عمل سے دنیا میں منصب اور مدح وغیرہ کا ارادہ کرے، ہم اس کو ان کے اعمال کی جزا دنیا میں پوری دیدیتے ہیں، بشرطیکہ ہم چاہیں، الخ، میں کہتا ہوں کہ اس کے معنی میں نفسانی لذتیں اور طبعی ذوق بھی داخل ہوگئے، کیونکہ یہ بھی دنیا ہی میں داخل ہیں۔

اعمال میں آخرت کو پیش نظر رکھنے کی بجائے منصب، مدح، ریا اور دیگر نفسانی خواہشوں کی تکمیل کا ہونا، یہ اعمال کو غارت کرنے کے مترادف ہے، اس طرح دنیا میں تو اللہ جس کے لئے چاہتا ہے، اسے عزت، شہرت اور دولت وغیرہ سب کچھ دیدیتا ہے، لیکن آخرت میں ان کے لئے کوئی حصہ نہیں۔

کتنے بڑے خسارہ کا سودہ ہے، جو محض اعمال میں فساد کی نیت کی وجہ سے ہوتا ہے، ہم اگر اپنا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ہماری ظاہری دینداری کے پس پردہ نفس کی گہرائیوں میں دنیا کے طاقتور جذبات اور خواہشیں پوشیدہ طور پر کارفرما ہوتی ہیں، نفسی خواہشات کی اس طوفان خیزی کی وجہ سے خود احتسابی کی سخت ضرورت ہے، تاکہ ہمارے اعمال میں آخرت کی نجات کا تقاضا طاقتور صورت میں پیدا ہوجائے، دوسری صورت میں آخرت کی زندگی کی تباہی کی صورت میں دنیا کے چند دنوں کے مستقبل کی بہتری لاحاصل ہے۔

تشریح:

دنیاوی حصول اور مادی فوائد کی نیت سے نیک کام کرنا، بڑے خطرے کی بات ہے، مثلاً بزرگی کو مریدوں سے مال کمانے یا اسے شہرت کا ذریعہ بنانے کے لئے استعمال کرنا، اس سے بعض اوقات مال اور شہرت تو حاصل ہوجاتی ہے، لیکن یہ بزرگی آخرت میں وبال

کا باعث ثابت ہوگی، بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، اس دور میں مجاہدوں کی کمی کی وجہ سے بزرگوں کے ان خلیفوں میں بھی یہ مرض عام ہوگیا ہے، جنہیں حسن ظن کی بنا پر جلد خلافت عطا کی جاتی ہے۔ اکابر بزرگوں کے یہاں طالب کو نفس کی بھٹی سے پوری طرح گذارنے کے بعد ہی خلافت دی جاتی رہی ہے، تاکہ طالب کی نفسی قوت بڑی حد تک مضمحل ہوجائے اور ذلیل دنیا اسے اپنی طرف راغب کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے، اس دور میں اس سلسلہ میں عدم احتیاط کی وجہ سے تصوف عام طور پر خود دنیا داری کا ذریعہ بن گیا ہے۔(مرتب)

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَى عَلَى اللّهِ كَذِباً. (سورۃ ہود، آیت نمبر ۱۸)

(اور اس شخص سے بڑھکر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے)۔

ولایت کی دعویٰ

اس کی نظیر وہ شخص ہے، جو اپنی وضع ودعویٰ سے ولایت ظاہر کرتا ہو، اولیاء اللہ کے کلمات کے ساتھ گفتگو کرتا ہو، مگر باطن میں فاسق وجاہل ہو۔

تشریح:

باطن کی قابل ذکر حد تک اصلاح نہ ہونے کے باوجود بزرگی اور دوسروں کی تربیت کے مقام پر فائز ہونا، اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہے، آج کل دنیا کے سامان زینت اور دولت کے حصول کی خاطر حقیقی اہل اللہ کا روپ اختیار کرنے اور ان جیسی گفتگو کرنے کی روش عام ہوگئی ہے اور اس سب سے مقصود شہرت، نام وری اور دولت کا حصول ہے، نفس جب تک غیر معمولی مجاہدوں کے ذریعہ فنا نہیں ہوتا، تب تک دنیا پر ٹوٹ پڑنے کی نفس کی خصوصیت میں تبدیلی واقع نہیں ہوتی (اللہ تعالیٰ ہمیں اس بیماری سے محفوظ فرمائے)۔ آمین (مرتب)

أَنُلْزِمُكُمُوهَا وَأَنتُمْ لَهَا كَارِهُون. (سورۃ ہود، آیت نمبر ۲۸)

(کیا ہم اسکو تمہارے گلے منڈھ دیں اور تم اس سے نفرت کئے چلے جاؤ)۔

اہل اللہ کے انکار سے استفادہ کا حاصل نہ ہونا

اس میں اشارہ ہے، اس طرف کہ منکر کو اہل اللہ سے استفادہ نہیں ہوسکتا، جب تک

وہ منکر رہے گا، وہ محروم رہے گا۔

تشریح:

اہل اللہ کے انکار سے ان کے روحانی فیوض وبرکات سے محرومی ہوتی ہے، چاہے بظاہر ان سے قریبی خاندانی تعلقات ہی کیوں نہ ہوں۔ اہل اللہ سے انکار کی روش کا ایک بڑا نقصان جو ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ باطنی امراض کا ادراک سلب ہوجاتا ہے، اس لئے کہ باطن کی دنیا بہت زیادہ گہری ہے، اس کا ادراک، علم وذہانت سے نہیں ہوتا، بلکہ محض علم وذہانت پر اکتفا کرنے سے باطنی حجابات گہرے ہوجاتے ہیں، اہل اللہ جو طویل عرصہ تک نفسی قوتوں کو فنا کے گھاٹ اتارنے کے مجاہدوں سے گذر چکے ہوتے ہیں، جب ان کی صحبت نصیب ہوتی ہے تو ان کے باطن میں موجود نورانیت سے قلب میں زندگی کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں اور ان کے آئینہ میں نفس کی کثافتیں نظر آنے لگتی ہیں۔ (مرتب)

وَيَا قَوْمِ اسْتَغْفِرُواْ رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُواْ إِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُم مِّدْرَاراً وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَى قُوَّتِكُمْ. (سورۃ ہود، آیت نمبر ۵۲)

(اور میری قوم تم اپنے گناہ اپنے رب سے معاف کراؤ پھر اس کی طرف متوجہ ہو وہ تم پر خوب بارشیں برسائے گا اور تم کو اور قوت دے کر، تمہاری قوت میں اضافہ کرے گا)۔

راحت وسکون کی زندگی

اس میں دلیل ہے اس بات پر کہ اطاعت پر دنیوی راحت اور خوش عیشی کو عمل دخل حاصل ہے اور اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے۔

تشریح:

اللہ کی مخلصانہ اطاعت پر اللہ کی طرف سے دنیوی زندگی میں بھی بہتری اور خوشی کا وعدہ ہے، ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ سکون وسکینت کی دولت عطا فرمانے کے ساتھ ساتھ معاشی طور پر بھی کشادگی عطا فرماتا ہے، اور ان کے دنیوی حالات میں بھی بہتری کی صورت پیدا فرماتا رہتا ہے، اس طرح ان کی اطاعت میں اضافہ پر اضافہ ہوتا جاتا ہے، اللہ کے نیک بندوں کے ساتھ اللہ کا یہ وعدہ ایسا ہے، جس کا اکثر مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، تاہم اللہ کے مقبول بندے خود اختیار کردہ فقر کی زندگی کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ (مرتب)

وَلاَ تَرْكَنُواْ إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُواْ فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ. (سورۃ ہود، آیت نمبر ۱۱۳)

(اور ظالموں کی طرف مت جھکو کہیں تم کو دوزخ کی آگ نہ لگ جائے)۔

مالدار کی صحبت کے اثرات

کسی بد دین شخص کی محض اس واسطہ عزت کرنا کہ اس سے مجھے مالی منفعت حاصل ہو اور ان کو بُرے کاموں سے روکنا بھی نہیں، اور ان کی وضع قطع اختیار کرنا، یہ ساری چیزیں ناجائز ہیں، البتہ اصلاح اعمال کے لئے ان سے مجالست کرنا درست ہے۔

تشریح:

بے دین مالدار کی صحبت اختیار کرنا سم قاتل ہے، اس سے فرد (وہ چاہے بزرگ ہی ہو) رفتہ رفتہ وہ اس کے کشش کے اثرات میں آنے لگتا ہے، بالآخر وہ دولت اور دنیاداری کی راہ پر چل پڑتا ہے، ہاں، اگر مالدار خود بزرگ کی صحبت میں آجائے تو دوسری بات ہے، اس وقت بھی بزرگ کی توجہ اس کے مال پر نہ ہو، بلکہ اس کی اصلاح کی طرف ہو، کامل شیخ اس معاملہ میں زندگی کی آخری سانس تک محتاط رہتا ہے، اس لئے کہ نفس کا سانپ مرتا نہیں، وہ مضمحل ہوتا ہے، عدم احتیاط کی وجہ سے وہ کروٹ لے سکتا ہے، اور دولتمندوں کی صحبت سے وہ ان کے اثرات کی زد میں آسکتا ہے، اس سلسلہ میں قرآن وسنت اور اکابر بزرگان دین کی کتابوں میں سخت تنبیہات موجود ہیں کہ جو مالداروں سے دولت کی خاطر تعلق رکھتا ہے، وہ اللہ کی محبت کی لذت سے آشنا نہیں ہوسکتا۔ وغیرہ وغیرہ آیت کے یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ بے دین کی صحبت کی خاصیت ہی یہ ہے کہ وہ فرد کے لئے آگ میں جھلسا دینے کا ذریعہ بنتی ہے، موجودہ دور میں بے دین افراد کی صحبت سے بچنا سب سے زیادہ دشوار مسئلہ ہوگیا ہے۔

اچھے اچھے لوگوں پر بے دین مالداروں کی صحبت کی وجہ سے دنیادارانہ رنگ غالب ہوتا جارہا ہے، سبب یہ ہے کہ دنیاوی زندگی کی خوشحالی وکامیابی ہی اصل ہدف بن گئی ہے، اور یہ خوشحال زندگی عام طور پر دنیاداروں سے گہرے تعلقات اور دنیا میں استغراق کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ (مرتب)

إِذْ قَالُواْ لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَى أَبِينَا مِنَّا. (سورۃ یوسف، آیت نمبر ۸)

(وہ وقت قابل ذکر ہے کہ ان کے بھائیوں نے یہ گفتگو کی کہ یوسف اور ان کا بھائی ہمارے باپ کو ہم سے زیادہ پیارے ہیں)۔

شیخ کا کسی مرید سے امتیازی سلوک اختیار کرنا

اس میں دلالت ہے کہ شیخ کو جائز ہے کہ کسی مرید کے ساتھ دوسرے مریدوں سے زیادہ محبت رکھے، جب کہ اس میں اوروں سے زیادہ رشد کے اشارے پائے جاتے ہوں، اور بعض اوقات ان مریدوں کو شک پر خطاء اجتہادی کا ویسا ہی گمان ہوتا ہے، جیسا ان بھائیوں کو حضرت یعقوب علیہ السلام پر ہوا تھا۔

تشریح:

بزرگوں کے ہاں بعض مریدوں پر خاص توجہ کا اہتمام ہوتا ہے، اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ انہیں روحانی طور پر ان سے زیادہ توقعات ہوتی ہیں کہ وہ دوسروں کے مقابلہ میں راہ سلوک میں زیادہ تیز رفتاری سے چلیں گے اور ان میں یہ استعداد دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ ہے، ویسے عام طور پر بزرگ اپنے حلقہ سے وابستہ سارے افراد سے شفقت ومحبت کا معاملہ کرتا ہے، کسی سے زیادہ محبت کا سبب وہی ہے، جس کا ذکر کیا گیا۔ (مرتب)

قَالَ لَا يَأْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهٖ اِلَّا نَبَّأْتُكُمَا بِتَأْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّأْتِيَكُمَا. (سورۃ یوسف، آیت نمبر ۳۷)

(یوسف نے کہا کہ جو کھانا تمہارے پاس آتا ہے جو کہ تم کو کھانے کے لئے ملتا ہے میں اس کے آنے سے پہلے تم کو اس کی حقیقت بتاتا ہوں اور یہ بتلا دینا اس علم کی بدولت ہے جو مجھ کو میرے رب نے تعلیم فرمایا ہے)۔

لوگوں کے نفع کے لئے

اپنے اوصاف کا بیان

روح میں ہے کہ جب کوئی عالم اپنے اوصاف اس لئے بیان کرے کہ لوگ اس سے نفع حاصل کریں تو جائز ہے، یہ تزکیہ کے خلاف نہیں ہے اور بعض بزرگوں نے جو اپنے کمالات ظاہر کئے ہیں اور اس کی کوئی پرواہ نہیں کی کہ لوگ ان کو مدعی کہیں گے، اس کا منشا

یہی ہے۔

تشریح:

بعض اوقات علمائے ربانی کی طرف سے اپنے اوصاف کا اظہار ہوتا ہے، ان کی یہ حالت مستقل نہیں ہوتی، خاص مواقع پر ہوتی ہے، اس سے ان کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ جو ان سے نفع حاصل کرنا چاہیں، وہ حاصل کر سکیں، عام طور پر اہل اللہ کی، اللہ سے والہانہ محبت کی کیفیات اور دوسروں کو فیض رسانی کی صلاحیت کا علم واندازہ نہیں ہوتا، عالم ربانی ان کے اپنے علاقے اور اپنے محلے میں موجود ہوتا ہے، جب کہ لوگ تزکیہ کرنے کی اس کی صلاحیت سے لاعلم ہوتے ہیں، اس طرح کے حالات میں اگر عالم ربانی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ اس کی اس صلاحیت کے اظہار سے شاید کچھ افراد میں اپنی تربیت وتزکیہ کے حصول کا احساس بیدار ہو تو ایسا کرنا صحیح ہے اور یہ تقویٰ کے منافی نہیں۔

بزرگوں کی اس طرح کی باتوں کو دعویٰ میں شمار نہیں کیا جائے گا، البتہ ایسا کرتے وقت دل حب جاہ وحب مال اور اپنی مدح چاہنے کے جذبات واحساسات سے پاک ہو، جو عالم ربانی اس مقام تک رسائی حاصل کر چکا ہو، وہ اگر حالات ومواقع اور ضرورت کے تحت اپنے اوصاف بیان کرتا ہو تو ایسا کرنا نفع سے خالی نہیں، لیکن موجودہ دور میں ہم جیسے تصوف وبزرگی کے دعویدار ایسا کریں گے تو اس بات کا زیادہ خطرہ موجود ہے کہ کہیں ہمیں نفس کے رحم وکرم پر نہ چھوڑ دیا جائے، اس لئے کہ اخلاص وبے نفسی کے معاملہ میں ہماری حالت قابل رحم ہے، جب اپنی اصلاح متاثر ہو تو دوسروں کی اصلاح کی قیمت پر اپنے آپ کو خطرات میں ڈالنا غیر معمولی خسارہ کا سودہ ہے۔ (مرتب)

وَقَالَ لِلَّذِیْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ. (سورۃ یوسف، آیت نمبر ۴۲)

(اور جس شخص پر رہائی کا گمان تھا اس سے یوسف نے فرمایا کہ اپنے آقا کے سامنے میرا تذکرہ کرنا)۔

مصیبت کے ازالہ کے وقت

کسی سے مدد چاہنا

اس میں دلالت ہے کہ اگر مصیبت کے ازالہ کے لئے کسی فرد سے مدد چاہے، خاص

طور پر جس پر احسان کیا ہو تو اس میں کچھ حرج نہیں، کیونکہ یہ شرعی اسباب میں سے ہے اور اس کو احسان کا عوض چاہنا نہ کہا جائے گا، احسان سے محبت پیدا ہوتی ہے اور محبت سے تعاون ومدد کرنا ناگوار نہیں۔

تشریح:

تکلیف وبلا کے وقت کسی سے مدد چاہنا، نیکی کے منافی نہیں ہے، بالخصوص جس پر احسان کیا ہو، اس سے بلا کے وقت مدد طلب کرنا بزرگی کے منافی نہیں، اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا اسباب کے تابع رکھی ہے، اسباب کو اختیار کرنا صحیح ہے، جب کہ اصل نگاہ اسباب کی خالص ہستی پر ہو۔ (مرتب)

أَلَا تَرَوْنَ أَنِّيْ أُوفِيْ الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنزِلِيْنَ. (سورۃ یوسف، آیت نمبر ۵۹)

(تم دیکھتے نہیں ہو کہ میں پورا ناپ کر دیتا ہوں اور میں سب سے زیادہ مہمان نوازی کرتا ہوں)۔

اپنی صلاحیتوں کا اظہار
تواضع کے خلاف نہیں

اس میں دلالت ہے کہ اگر اپنی خوش معاملہ کی (اپنی صلاحیت) کے اظہار کی ضرورت ہو، اس میں اپنی مدح مقصود نہ ہو، بلکہ اس میں کوئی مصلحت ہو تو یہ تواضع کے خلاف نہیں۔

تشریح:

اپنی صلاحیت واستعداد کا اظہار کرنا، جب اس کی حقیقی ضرورت محسوس ہو اور دوسروں کو اپنی صلاحیتوں سے فائدہ پہنچانا مقصود ہو تو ایسا کرنا ایک حد تک ضروری ہے، البتہ ایسا کرتے وقت اپنی مدح اور اپنی بڑائی پیش نظر نہ ہو، بالخصوص وہ افراد بے غرضانہ طور پر خلق کو نفع رسانی کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوں، وہ اگر ایسا کریں تو زیادہ بہتر ہے، اس لئے کہ ایسے باصلاحیت افراد جو حددرجہ نیکو کار ہوں، ان سے اللہ کی مخلوق کو نفع ہی حاصل ہوسکتا ہے نہ کہ نقصان، ایک نفع تو ان کی نیکو کاری کی وجہ سے دوسرا نفع ان کی صلاحیتوں سے۔ (مرتب)

وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يَا أَسَفٰى عَلٰى يُوسُفَ. (سورۃ یوسف، آیت نمبر ۸۴)

(اور ان سے دوسری طرف رخ کرلیا اور اور کہنے لگے ہائے یوسف)۔

اللہ کی مخلوق سے محبت اللہ کی محبت کے منافی نہیں

یہ شبہ نہ کیا جائے کہ یہ منصب نبوت کے خلاف ہے، کیونکہ معرفت کاملہ اور محبت کاملہ کا تقاضا ہے کہ (دوسروں سے ایسی محبت پیدا نہ ہو،) دوسروں کے ساتھ ایسی محبت کی گنجائش کہاں؟

جواب یہ ہے کہ یہ طبعی محبت ہے، جو حق تعالیٰ سے محبت کے ساتھ جمع ہوسکتی ہے اور کاملین کی یہ محبت ان کو حق تعالیٰ کی رضا سے غافل نہیں کرتی، بلکہ اس میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔

تشریح:

اللہ کی مخلوق سے اللہ کی خاطر محبت کرنا، یہ اللہ کی محبت کے منافی نہیں، سب کے ساتھ محبت کے دائرے مختلف ہیں، اپنے اہل خانہ کے ساتھ محبت، عام لوگوں سے محبت، اپنے مریدوں سے محبت، یہ ساری محبتیں اللہ کی محبت کے تابع ہوتی ہیں، البتہ بندہ مؤمن کو سب سے زیادہ اللہ ہی سے محبت ہوتی ہے، اللہ کی مخلوق سے محبت اس لئے ہوتی ہے کہ ان کی حیثیت اللہ کے عیال کی سی ہے۔

اللہ کے طالب کا قلبی سانچہ اس طرح کا بن جاتا ہے کہ وہ سراپا محبت بن جاتا ہے۔ (مرتب)

قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ. (سورۃ یوسف، آیت نمبر ۹۲)

(یوسف نے فرمایا کہ نہیں تم پر آج کوئی الزام نہیں اللہ تعالیٰ تمہارا قصور معاف کرے اور وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے)۔

مخلوق کو حق کی نظر سے
دیکھنے کے اثرات

روح میں شاہ کرمانی سے منقول ہے کہ جو شخص مخلوق کو حق کی نظر سے دیکھے گا، وہ ان

کی مخالفت کی پرواہ نہ کرے گا، جو شخص ان کو اپنی نظر سے دیکھے گا، وہ اپنی پوری عمر، ان سے بحث وتکرار میں ختم کردے گا، دیکھئے، یوسف علیہ السلام کو چونکہ مجازی قضا کا علم تھا، اس لئے انہوں نے اپنے بھائیوں کا کس طرح عذر قبول کیا۔

تشریح:

اہل اللہ کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ مخلوق کی طرف سے پہنچنے والے نفع ونقصان کو من جانب اللہ تصور کرتے ہیں، اس لئے اس طرح کے مواقع پر وہ مخلوق سے شاکی نہیں ہوتے، ان سے انتقام نہیں لیتے، بلکہ انہیں معاف کردیتے ہیں، وہ اسے تقدیری معاملہ تصور کرتے ہیں، اس سے ان کے درجات میں مزید بلندی آجاتی ہے، مخلوق کی طرف سے پہنچنے والے نقصان کو ان کی طرف سے تصور نہ کرے گا اس کے برعکس دوسرے افراد کی حالت یہ ہوگی کہ وہ عمر بھر بحث وتکرار، ضد اور انتقام لینے کے جذبات واحساسات اور بدلہ لینے کی حرکتوں میں صرف کرے گا، لوگوں کی طرف سے پہنچنے والا معمولی نقصان بھی اس کے نفس کو اذیت سے بھردے گا اور اس کی بدلہ لینے کی نفسیات کو اجاگر کردے گا۔

چونکہ زندگی بھر لوگوں کی طرف سے اس طرح کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، اس لئے اس طرح کے لوگ ان واقعات کو حق کی نظر سے دیکھنے کے بجائے لوگوں کی حرکات پر محمول سمجھکر، ان سے الجھنے میں اپنی توانائیاں صرف کردیتے ہیں۔

اہل اللہ کی شان اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے، وہ اپنے جانی ومالی نقصان کو مشیت سمجھکر، دل سے اس کے احساس کو نکال دیتے ہیں۔ (مرتب)

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُم مُّشْرِكُونَ. (سورۃ یوسف، آیت نمبر ۱۰۶)

(اور اکثر لوگ جو اللہ کو مانتے بھی ہیں تو اس طرح کہ شرک بھی کرتے جاتے ہیں)۔

شرک اور اس کی اقسام

بعض نے اس سے ریا مراد لی ہے، بعض نے اسباب اور اسباب پر اعتماد کرنے کی نظر سے اس کی تاویل کی ہے، بعض نے خلق کی اطاعت خالق سے نافرمانی کے ساتھ مراد لی ہے اور بعض نے اس میں ہر قسم کے شرک کو داخل کیا ہے، اس میں قبر پرستی، اللہ کے علاوہ دوسروں کی نذر ماننا اور غیر اللہ کے نافع اور نقصان کار ہونے کا اعتقاد بھی آگیا اور

بعض صوفیہ نے غیر اللہ کی طرف بالکل التفاف کو شرک کہا ہے۔

تشریح:

اس آیت کے حاشیہ میں جو تشریح فرمائی گئی ہے، وہ کافی جامع تشریح ہے، شرک کی یہ ساری صورتیں موجود ہیں، شرک کی ان ساری صورتوں سے بچنے کے لئے کوشاں ہونا، ایمان کے بنیادی تقاضوں میں شامل ہے، ورنہ شرک کی موجودگی میں اعمال کے غارت ہونے کے خطرات لاحق رہیں گے اور شرک کے ساتھ نجات ممکن نہیں، شرک کی سب سے بُری صورت قبر پرستی، غیر اللہ کی عبادت کرنا، غیر اللہ کو اس طور پر پکارنا کہ وہ سنتا ہے اور دست گیری کرکے، فرد کو ہر طرح کے مصائب سے نجات دلاتا ہے۔ دوسروں کی نذر ماننا کہ یہ قربانی کسی بزرگ یا شخصیت کے نام پر کرتا ہوں، گویا اس شخصیت کو اللہ کا درجہ دیا گیا، شرک کی یہ بدترین صورتیں ہیں۔ (مرتب)

قُلْ هَـٰذِهِ سَبِيْلِىْ أَدْعُو إِلَى اللّٰهِ عَلَى بَصِيْرَةٍ. (سورۃ یوسف، آیت نمبر ۱۰۶)

(آپ فرما دیجئے کہ میرا طریقہ ہے کہ میں اللہ کی طرف اس طرح بلاتا ہوں کہ میں دلیل (بصیرت) پر قائم ہوں)۔

داعی الی اللہ کے لئے
اللہ کی معرفت کا حاصل ہونا

روح میں ہے کہ اس میں اشارہ ہے داعی الی اللہ کو راہ سلوک کا ماہر اور اللہ کی ذات وصفات کا عارف ہونا چاہئے۔

تشریح:

حقیقی داعی کے لئے فرد وافراد کی نفسیات اور راہ سلوک کے مدوجزر اور مدعو کی شخصیت کے نشیب وفراز کو سمجھنا ضروری ہے، یہ اسی وقت ہوسکتا ہے، جب داعی اپنی نفسی قوتوں کے خلاف غیر معمولی مجاہدوں کے عمل سے گذر چکا ہو، ایسا داعی ہی معرفت نفس کے ساتھ ساتھ معرفت رب کا حامل ہوتا ہے۔

اللہ کی معرفت سے اللہ کی شان عظمت پیدا ہوتی ہے اور اللہ کی ذات کا استحضار قائم

ہوتا ہے، اس طرح کے داعی کا قول وعمل خیر وبرکت کا باعث ہوتا ہے اور اس کے دعوتی کام میں تاثیر ہوتی ہے، نیز ایسا داعی دعوتی کام اس اہتمام وحکمت سے سرانجام دیتا ہے، جس سے دوسروں کی ذرہ برابر بھی تحقیر ہونے کی بجائے، ان کی توقیر کے سارے آداب شامل ہوتے ہیں اور ان کی نفسیات کو پوری طرح ملحوظ رکھتا ہے۔

لیکن اگر داعی، معرفت نفس اور معرفت رب کے مراحل سے گذرے بغیر دعوتی کام سرانجام دے گا تو ایک تو وہ فرد کی نفسیات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اندھیرے میں لاٹھی مارے گا اور الجھاؤ کا شکار ہوگا، دوسرے یہ کہ اس کی اپنی شخصیت قول وفعل کے تضاد سے دوچار ہوگی، اس لئے مجاہدوں کے ذریعہ نفسی قوتوں کو شکست دیئے بغیر نفسی جذبات موجود ہوتے ہیں اور دعوتی کام کے دوران یہ جذبات ضد، بحث ومباحثہ اور مدعو سے گفتگو برائے گفتگو اور ہر صورت میں اپنی بات منوانے کی صورت میں سامنے آتے رہتے ہیں۔ (مرتب)

إِنَّ اللّٰهَ لاَ يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُواْ مَا بِأَنْفُسِهِمْ. (سورۃ الرعد، آیت نمبر ۱۱)

(بیشک اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت میں تغیر برپا نہیں کرتا، جب تک وہ لوگ خود اپنی حالت کو نہیں بدلتے)۔

کاوشوں کے بغیر افراد کی زندگیوں میں تبدیلیوں کا واقع نہ ہونا

روح میں نصر آبادی سے منقول ہے کہ یہ حکم عوام اور خواص سب کے لئے ہے اور خواص کو زیادہ کاوش کی ضرورت (لاحق) ہوتی ہے۔

تشریح:

اس آیت میں یہ اہم اصول بیان فرمایا گیا ہے کہ افراد اور قوموں کی تبدیلی کے کام کا سارا تعلق افراد کی داخلی زندگی میں تبدیلی سے ہے، جب تک فرد وافراد اپنے باطن کی تعمیر نہیں کرتے، اندر کو سنوارنے کے کام کو فیصلہ کن اہمیت نہیں دیتے اور باطنی تبدیلی کے ذریعہ ظاہر کو بہتر نہیں بناتے، تب تک ان کی انفرادی واجتماعی زندگی میں بہتری پیدا نہیں ہوسکتی، البتہ خاص افراد جس میں قوم کی قیادت اور علمائے ربانی وغیرہ شامل ہیں، ان کو

باطن کی پاکیزگی کے سلسلہ میں زیادہ مجاہدوں کی ضرورت ہے، قوموں کی حقیقی تبدیلی کا سارا تعلق باطنی انقلاب سے ہے، باطن جب پاکیزہ ہوجاتا ہے، تو اس کے نتیجہ میں قلب سلیم کے ساتھ عقل سلیم بھی عطا ہوتی ہے، یہ عقل سلیم دنیا میں فرد کو اپنے نفع ونقصان سے آشنا کرتی رہتی ہے اس طرح دنیاوی معاملات میں بھی بصیرت، بصارت اور فہم بہتر سے بہتر ہوجاتا ہے۔

إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُوْلُواْ الْأَلْبَابِ الَّذِيْنَ يُوفُونَ بِعَهْدِ اللّٰهِ. (سورۃ الرعد، آیت نمبر ۱۹-۲۰)

(پس نصیحت تو عقلمند لوگ ہی قبول کرتے ہیں، اور یہ لوگ ایسے ہیں کہ اللہ سے انہوں نے جو عہد کیا ہے اس کو پورا کرتے ہیں)۔

آخرت آشنا عقل کا معتبر ہونا

اولو الاباب کے ان جملوں میں مذکورہ صفات ذکر کرنا، اس بات کی دلیل ہے کہ معتبر عقل وہی ہے، جو آخرت آشنا ہو اور ایسا شخص ہی عقلمند کہلانے کا مستحق ہے، اگرچہ وہ دنیا سے ناواقف ہو۔

تشریح:

عقلمند کی بہت بہترین تشریح ہے، ہمارے ہاں عقلمند اور دانشور اسی کو سمجھا جاتا ہے، جو اپنی بات کو مادی فکر اور استدلال کے ساتھ پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، اور ہر مسئلہ کی بہتر توجیہ کرسکتا ہو، لچھیدار علمی گفتگو کرتا ہو، دانشور، عام طور پر عمل کے معاملہ میں پست ہوتا ہے، وہ زیادہ حساس ہوتا ہے، اپنی بات کو صحیح اور حتمی سمجھتا ہے، اس کی ساری گفتگو دنیاوی ترقی، مادی اسباب اور مادی علوم وفنون کے حوالے سے ہوتی ہے۔

وہ دنیا بھر کی معلومات رکھتا ہے، لیکن اپنی ذات، اپنی شخصیت اور اپنے نفس کی قوتوں اور آخرت کی فکر کے اعتبار سے وہ بے حس وبے فکر ہوتا ہے، حالانکہ دانشور اور عقلمند کا حقیقی معیار یہی ہے کہ وہ ابدالاباد والی زندگی کے بارے میں سب سے زیادہ فکرمند ہو کہ وہاں کی نجات کی صورت کس طرح ہو اور وہ اس کی تیاری میں مصروف ہو، اکثر دیکھا گیا ہے کہ دنیا آشنا عقل آخرت کی باتوں کے فہم کے حوالے سے ناقص ہوتی ہے، اس کی سوچ کا

مرکز دنیا کی زندگی اور دنیاوی حسن سے بہرہ وری ہوتی ہے۔

اسلام کی نظر میں عقلمند ہونے کا حقیقی معیار یہی ہے، ایسا عقلمند اگرچہ دنیاوی علوم وفنون سے واقفیت نہ بھی رکھتا ہو تو وہ سب سے بڑا عقلمند شمار ہوگا، اس لئے کہ وہ اصل اور حقیقی زندگی کے بارے میں زیادہ حساس ہے اور اس کی فکرمندی اسے بے چین رکھتی ہے، ایسے عقلمند فرد پر دنیاوی معاملات میں ہزاروں ماہر وذہین افراد قربان کئے جا سکتے ہیں۔ (مرتب)

وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَا أَمَرَ اللّٰهُ بِهِ أَن يُوصَلَ. (سورۃ الرعد، آیت نمبر ۲۱)

(اور یہ ایسے ہیں کہ اللہ نے جن چیزوں کے قائم رکھنے کا حکم کیا ہے اور ان کو قائم رکھتے ہیں)۔

حقوق سے کوتاہی میں
نیکوکاری میں خلل واقع ہونا

روح میں ہے کہ اس میں سب اوامر آگئے اور اس میں عام طور پر سب حقوق داخل ہیں، یہاں تک کہ حضرت فضیلؒ کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص نیک کام کرے اور اس کے پاس ایک مرغی ہو، اس کا حق ادا نہ کرے تو وہ نیکوکار نہیں، میں کہتا ہوں کہ جب مرغی کے حق میں کہا گیا ہے تو شیخ کا کیا کچھ حق وادب ہوگا جس میں سخت کوتاہی کی جاتی ہے۔

تشریح:

اسلام زندگی بھر کے سارے معاملات کے بارے میں تعلیم دیتا ہے اور سب کے حقوق کو ملحوظ رکھنے کی تلقین کرتا ہے، حقوق میں کمی وکوتاہی ایسا عمل ہے، جس سے فرد کی نیکوکاری میں خلل پڑتا ہے، اس طرح معاشرے میں حق تلفی کو فروغ ملتا ہے، ماں باپ کے حقوق، عزیز واقارب کے حقوق، دوستوں وساتھیوں کے حقوق سے لے کر شیخ اور استاد کے حقوق، سارے حقوق کو ملحوظ خاطر رکھنا ہے، اس دور میں شیخ کے حقوق سے غفلت کا رجحان غالب ہے، شیخ، طالب کی اصلاح کے لئے جو امور تجویز کرتا ہے، طالب اکثر ان امور کے معاملہ میں غفلت کا شکار ہوتا ہے، اس کا ایک نتیجہ تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ طالب کی اصلاح کا عمل بُری طرح متاثر ہوتا ہے، دوسرا نقصان یہ ہوتا ہے کہ شیخ کو اذیت ہوتی ہے

اور اسے یہ شکایت ہوتی ہے کہ اللہ کی راہ محبت میں چلنے والے افراد بہت کم ہیں، جو چلتے بھی ہیں تو وہ شیخ کی ہدایات سے زیادہ خود رائی سے کام لیتے ہیں اور خودرائی کا نتیجہ طالب کو سخت نقصان کی صورت میں بھگتنا پڑتا ہے اور اس کے حالات ومعاملات میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے، یہ ساری صورتحال شیخ سے محبت میں کمی اور اس کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ (مرتب)

أَلاَ بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوب. (سورۃ الرعد، آیت نمبر ۲۸)

(خوب سمجھ لو کہ دلوں کو اللہ کے ذکر سے ہی اطمینان ہوجاتا ہے)۔

ذکر سے دل میں نور کا حاصل ہونا

روح میں ہے کہ اس اطمینان کا سبب ایک نور ہے، جس کو اللہ تعالیٰ مومنوں کے دلوں میں داخل فرماتے ہیں، جس سے پریشانی اور وحشت جاتی رہتی ہے۔

تشریح:

ذکر کے نتیجے میں دل میں اللہ کی طرف سے نور داخل ہوتا رہتا ہے، کثرتِ ذکر سے یہ نور دل کے سارے حصوں کو منور کر دیتا ہے، جس کی وجہ سے فرد سکون وخوشی کے ساتھ ساتھ اس نور کے ساتھ چلتا ہے، ذکر کا نور اس کی زندگی کا ایسا حصہ بن جاتا ہے کہ اس کے بغیر وہ اپنی زندگی میں زبردست خلا محسوس کرتا ہے، بلکہ اس کی شخصیت اداسی، غمگینی اور ظلمات کا نمونہ بن جاتی ہے، ایک حدیث شریف ہے کہ ذکر کرنے والا زندہ ہے، جب کہ ذکر نہ کرنے والا مردہ ہے، دوسری حدیث شریف ہے کہ ہر چیز کو صاف کرنے والا کوئی نہ کوئی آلہ ہوتا ہے، دل کو صاف کرنے والا آلہ اللہ کا ذکر ہے۔

ذکر دنیا میں اللہ کی اتنی بڑی نعمت ہے کہ ساری نعمتوں پر بھاری ہے، ذکر سے فرد کے احساسات پاکیزہ ہوجاتے ہیں، وہ ہر معاملے کے مثبت پہلوؤں کو دیکھتا ہے، معاملے کے منفی پہلوؤں کے فہم کے باوجود اس کا احساس پاکیزہ ہوتا ہے، ذکر کے جتنے بھی فوائد بیان کئے جائیں کم ہیں۔ (مرتب)

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلاً مِّن قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجاً وَذُرِّيَّةً. (سورۃ الرعد، آیت نمبر ۳۸)

(اور ہم نے یقیناً آپ سے پہلے رسول بھیجے اور ہم نے ان کو بیبیاں اور بچے بھی دیئے)۔

کامل کے لئے دنیا کا مضر نہ ہونا

روح میں ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ کامل کے لئے اہل دنیا اور دولت مضر نہیں ہوتی اور نہ یہ ولایت کے منافی ہے۔

تشریح:

حقیقی اہل اللہ پر ہمہ وقت اللہ کی محبت غالب رہتی ہے، وہ عام لوگوں اور مالداروں سب کی اصلاح کا فکرمند ہوتا ہے، اس فکرمندی کے پیش نظر اسے مالداروں سے بھی رابطے رکھنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، ایسے مالدار جو خود بھی اہل اللہ سے عقیدت رکھتے ہوں، انہیں اہل اللہ کی صحبت سے استفادہ ہی ہوتا ہے، تاہم اہل اللہ اس معاملہ میں محتاط ہوتے ہیں، اہل اللہ، مالداروں سے دوستانہ تعلقات قائم نہیں رکھتے، اس لئے کہ اس سے انہیں مالداروں کے مال کی کشش اپنی طرف متوجہ کرسکتی ہے، جو خطرے کی بات ہے۔ (مرتب)

أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللّٰهِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ. (سورۃ ابراہیم، آیت نمبر ۵)

(کہ ان کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لاؤ، اور ان کو اللہ تعالی کے معاملات یاد دلاؤ، بلاشبہ ان معاملات میں عبرتیں ہیں، ہر صابر وشاکر کے لئے)۔

اصلاح وتربیت میں شیخ کا

بطور ذریعہ کے اہم کردار ہونا

باوجود اس کے گناہوں سے نجات دینے والی حقیقی ذات اللہ تعالی کی ہے، اس کے باوجود نجات کی نسبت نبی کی طرف کرنا، یہ اس بات کی قوی دلیل ہے کہ طالب کی تربیت کی تکمیل میں شیخ کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔

تشریح:

فرد کی اصلاح وہدایت میں اصل تو اللہ کا فضل خاص ہی شامل ہوتا ہے، اللہ کے فضل خاص کے بغیر راہ محبت کی مشکلات اور مصائب برداشت کرنا ممکن نہیں، اللہ کے خاص فضل

کے بعد راہ سلوک میں طالب کی تربیت میں شیخ کا اہم کردار ہوتا ہے، شیخ، طالب کے محبوب کے ساتھ عشق کے جذبات کو بیدار کرکے، انہیں طاقتور بناتا ہے، اس میں ذکر وفکر کا ذوق وشوق پیدا کرتا ہے، قبض وبسط کے حالات میں طالب کی طرف سے متزلزل ہونے کے وقت اسے سہارا دیتا ہے اور اس کی ہمت افزائی کرتا ہے، غرض کہ شیخ قدم قدم پر طالب کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ شیخ سے رابطہ کے بغیر راہ سلوک میں چلنا دشوار تر ہوتا ہے، طالب کو طرح طرح کے وسوسے گھیر لیتے ہیں اور باطن سے نکلنے والے احساسات وجذبات اسے خوف زدہ کرتے رہتے ہیں ان سارے حالات میں شیخ ان کی رہنمائی کرتا ہے۔ (مرتب)

وَفِي ذَٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ. (سورۃ ابراہیم، آیت نمبر ۶)

(اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑا امتحان تھا)۔

تکالیف ومصائب کا آزمائش وتربیت کا ذریعہ ہونا

کسی مؤمن بندے کو جب تکالیف ومصائب آگھیرتی ہیں تو یہ دراصل اس کی آزمائش وتربیت کے لئے ہوتی ہیں، جس میں اگر یہ صبر سے کام لے تو کندن بن کر نکلتا ہے، جو بہرحال نفع سے خالی نہیں۔

تشریح:

راہ سلوک میں پیش آنے والی تکالیف دراصل تربیت ہی کا ذریعہ ہوتی ہیں، ان تکالیف میں کبھی ذکر کے لئے ذوق وشوق کا ہونا، کبھی نہ ہونا، کبھی بہتر کیفیات کا ہونا، کبھی کیفیات کا سلب ہونا، کبھی فرائض کی ادائیگی کے لئے ذوق وشوق کا ہونا، کبھی جبر کے ساتھ فرائض کا ادا کرنا، کبھی صبر وتحمل وبردباری کا ہونا، کبھی نہ چاہتے ہوئے بھی شدید اشتعال کا ہونا، روزمرہ زندگی میں طاقتور نفسی قوتوں کا مشاہدہ ہونا، کبھی روزگار میں تنگی کے احساس کا غالب ہونا، کبھی روزی میں برکت کا ہونا وغیرہ ان ساری چیزوں سے مقصود طالب کی تربیت ہوتی ہے۔ (مرتب)

جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَرَدُّوا أَيْدِيَهُمْ فِي أَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوا إِنَّا كَفَرْنَا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ وَإِنَّا لَفِي شَكٍّ مِمَّا تَدْعُونَنَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ. (سورۃ ابراہیم، آیت نمبر ۹)

(ان کے پیغمبر ان کے پاس دلائل لے کر آئے، سو ان کی قوم نے اپنے ہاتھ پیغمبر کے منہ میں دے دیئے اور کہنے لگے کہ تمہیں جو حکم دے کر بھیجا گیا ہے، ہم اس کے منکر ہیں اور جس چیز کی طرف تم ہم کو بلاتے ہو، ہم تو اس کی جانب سے بہت بڑے شبہ میں ہیں، جو تردد میں ڈالے ہوئے ہے)۔

گستاخی کے نتائج

انہوں نے اپنے ہاتھوں کو پیغمبر کے منہ پر رکھ دیا، تا کہ ان کو بولنے نہ دیں، میں کہتا ہوں کہ اس کا قصداً ذکر کرنا، حالانکہ اصل مقصود کے لئے کفر کا ذکر کافی تھا، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سوء ادب (گستاخی) کفر کے علاوہ ایک مستقل جرم ہے، اسی لئے اہل طریق سوء ادب سے سخت ممانعت کرتے ہیں۔

تشریح:

راہ سلوک میں مربی کی گستاخی ایسی چیز ہے، جس سے طالب، فیوض وبرکات سے محروم ہوسکتا ہے، اس لئے کہ گستاخی کا عمل بتاتا ہے کہ اس کے دل میں اپنے مصلح کی محبت اور اس کے آداب کی بجا آوری کا سلیقہ موجود نہیں، گستاخی والدین سے ہو یا استاد سے یا اپنے مربی سے، فرد کے لئے خطرے سے خالی نہیں، اس سے فرد خیر وبرکات سے محروم ہوسکتا ہے، راہ سلوک تو سراپا محبت، ادب وآداب اور شیخ کے ساتھ محبت کی راہ ہے۔ شیخ سے محبت کے نتیجہ میں ہی فرد میں ذکر وفکر کا ذوق پیدا ہوتا ہے اور اس کے سلوک کی تکمیل کی صورت پیدا ہوتی ہے، جس شیخ کی صحبت ومحبت سے سالک کی روحانی ترقی وابستہ ہو، اس سے گستاخی، سالک کے لئے کسی اعتبار سے صحیح نہیں، بلکہ اس کی اسے نقد سزا مل جاتی ہے۔ (مرتب)

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَـٰذَا الْبَلَدَ آمِناً وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَن نَّعْبُدَ الْأَصْنَامَ رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيراً مِّنَ النَّاسِ. (سورۃ ابراہیم، آیت نمبر ۳۵-۳۶)

(اور جب کہ ابراہیم نے کہا کہ اے میرے رب اس شہر کو امن والا بنادیجئے اور مجھ کو میرے خاص فرزندوں کو بتوں کی عبادت سے بچائے رکھئے اے میرے پروردگار ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کردیا)۔

ہر وقت ڈرتے رہنے کی ضرورت

اس میں دلالت ہے کہ انبیاء علیہم السلام بھی بے خوف نہیں ہوئے، سو ان کا تو ذکر ہی کیا، جو ہر وقت نفس وشیطان کے پھندوں میں پھنسے ہیں، تو کسی کو اپنے حال وکمال پر ناز نہ کرنا چاہئے۔

تشریح:

حضرت ابراہیم علیہ السلام، اللہ سے دعا فرماتے ہیں کہ یا اللہ ان بتوں نے بے شمار مخلوق کو گمراہ کیا ہے، مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی پوجا سے بچالیجیے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرب کے مقام کی حامل شخصیتوں پر اللہ کی شان عظمت کتنی غالب رہتی ہے، جب اتنی بڑی شخصیت بے خوف نہیں تو ہمیں اپنے اعمال اور کمالات پر ناز کرنا، سب سے بڑی نااہلی ہے اور اللہ کے عتاب کو دعوت دینے کے مترادف بھی، حقیقی اہل اللہ کی علامت ہی فنائیت ہے یعنی اپنے آپ کو ہر طرح کے کمال سے خالی سمجھنا اور اللہ کی ذات سے سب سے زیادہ ڈرتے رہنا، اہل اللہ اپنے کسی بھی کمال کو اپنی طرف منسوب نہیں کرتا، وہ اسے اللہ کا فضل خاص سمجھتا ہے وہ اپنے دور کے فتنوں کے حوالے سے اللہ سے پناہ مانگتا رہتا ہے کہ وہ اپنے فضل خاص سے اسے ان فتنوں سے بچالے اور اس کے دین وایمان کی حفاظت کرے، اللہ کو ان کی یہی ادا سب سے زیادہ پسند ہے۔ (مرتب)

فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُم مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ. (سورۃ ابراہیم، آیت نمبر ۳۷)

(تو آپ لوگوں کے قلوب ان کی طرف مائل کر دیجئے اور ان کو پھل کھانے کو دیجئے تاکہ یہ لوگ شکر کریں)۔

مال کی طلب اور اس کی نوعیت وحیثیت

اگر کوئی شخص مال واسباب طلب کرتا ہے، بقدر ضرورت تو یہ برا نہیں اور اگر دینی کام مدنظر ہو تو ایسی طلب بالکل بری نہیں۔

تشریح:

اللہ سے اپنی ذاتی ضروریات کے لئے مال طلب کرنا، بزرگی کے منافی نہیں، اگر مال کی طلب دینی مقاصد کے لئے ہوتو یہ طلب بہتر ہے، تاکہ دینی خدمت کے کاموں کی بہتر طور پر سرانجامی کی صورت پیدا ہوسکے، لیکن حقیقی بندہ مؤمن مالدار بننے کے لئے مال طلب نہیں کرتا، بلکہ اپنی بنیادی ضروریات کے لئے مال کی دعا کرتا ہے، تاکہ وہ لوگوں کی محتاجی سے بچ کر، ذکر وفکر وعبادت میں یکسو ہوسکے اور لوگوں کی بے غرضانہ طور پر تربیت وخدمت کا کام کرسکے۔ (مرتب)

ذَرْهُمْ يَأْكُلُواْ وَيَتَمَتَّعُواْ وَيُلْهِهِمُ الأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ. (سورۃ الحجر، آیت نمبر۳)

(آپ ان کو ان کے حال پر رہنے دیجئے کہ وہ کھالیں اور چین اڑالیں اور خیالی منصوبے ان کو غفلت میں ڈالے رکھیں ان کو پ ابھی حقیقت معلوم ہوہی جاتی ہے)۔

شکم پروری اور شہرت رانی کی بیماری

اس میں ایسے شخص کی مذمت کی طرف اشارہ ہے، جس کو بڑی فکر شکم پروری اور شہرت رانی کی رہتی ہو، ایسا شخص حرم قرب میں پہنچنے سے محروم رہتا ہے۔

تشریح:

یہ دونوں بیماریاں ایسی ہیں، جو اس وقت ہمہ گیر صورت اختیار کرچکی ہیں اور عام طور پر زندگی کا بنیادی ہدف شکم پروری اور شہرت رانی ہی بن گئیے ہیں، مادی زندگی پر زور اور جنس زدگی کی وبا نے لوگوں کو آخرت سے دور کردیا ہے اور شکم پروری اور شہوت رانی میں اتنا مستغرق کردیا ہے کہ ساری سرگرمیوں کا حاصل یہی چیزیں بن کر رہ گئی ہیں، اگرچہ انسانوں کی بڑی اکثریت ہمیشہ انہی دونوں بیماریوں میں مبتلا رہی ہے، لیکن اس دور میں یہ چیزیں جنون کی صورت اختیار کرچکی ہیں، لوگوں کی اکثریت دین ومذہب اور آخرت کی باتیں سننے پر آمادہ ہی نہیں، دنیا ہی ان کو اس لئے مقصود ہے، تاکہ ان دونوں کے حصول کے لئے وسائل مہیا ہوسکیں۔

جو شخص شکم پروری اور شہوت رانی کا مریض بن گیا، وہ اللہ کا قرب حاصل کر سکے

ممکن نہیں۔

نفس ان دونوں جذبات وخواہشات کے سہارے طاقتور سے طاقتور تر ہوتا ہے، اور فرد وافراد کو اللہ سے دور سے دور تر کردیتا ہے۔

موجودہ دور میں عالمگیری سطح سے لے کر محلے کی سطح تک معاشرے کی جو تشکیل ہوئی ہے، اس میں یہی دونوں چیزیں شامل ہیں، شکم پروری اور ہوس رانی نے پوری انسانیت کو اخلاقی وروحانی، ذہنی ونفسیاتی طور پر تباہی کے دہانے پر کھڑا کردیا ہے اور آٹھ دس سال کے بچوں تک کو شہوت رانی کے مرض میں مبتلا کردیا ہے، انسانیت کے اس بحران پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ (مرتب)

فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُواْ لَهُ سَاجِدِينَ. (سورۃ الحجر، آیت نمبر۲۹)

(سو میں جب اس کو پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی طرف سے جان ڈالوں تو سب ان کے روبرو سجدہ میں گر پڑنا)۔

روح کی اصل غذا

بدن انسانی میں موجود روح انتہائی تکریم کی حامل ہے، کیونکہ اس کی نسبت اللہ نے اپنی طرف کی ہے، لہٰذا اس کی غذا اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے احکام ہیں۔

تشریح:

روح لطیف ترین چیز ہے، اس کی غذا اللہ کی عبادت ذکر وفکر اور اس کی اطاعت ہے، روح محبوب کے لئے ہر وقت بے چین رہتی ہے، وہ محبوب کا مشاہدہ چاہتی ہے، اس دنیا میں مشاہدہ تو ممکن نہیں، اس لئے کہ نفس کی مادی قوتیں اور مادہ کی جسمانی ساخت اس راہ میں حائل ہے، تاہم کثرت ذکر سے محبوب کے لئے روح کی پیاس ایک حد تک کم ہوسکتی ہے اور وہ محبوب کے انوار حسن سے بہرہ ور ہوکر، ایک حد تک طمانیت حاصل کرتی رہتی ہے، روح کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے مادی جسم میں روح کے داخلہ سے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو اس کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم فرمایا، روح چونکہ امر ربی ہے، جوہری چیز ہے، اس لئے وہ ہر وقت محبوب حقیقی کے لئے

ترس رہی ہے،اس مادی دنیا میں روح کی غذا اللہ محبوب کا ذکر، اس کی عبادت واطاعت ہی ہے، اس کے علاوہ روح کو کسی چیز سے تسکین حاصل نہیں ہوسکتی ۔ (مرتب)

لاَ تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَى مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجاً مِّنْهُمْ. (سورۃ الحجر، آیت نمبر ۸۸)

(آپ اپنی آنکھ اٹھا کر اس چیز کی طرف نہ دیکھئے کہ جو ہم نے مختلف قسم کے کافروں کو برتنے کے لئے دے رکھی ہیں)۔

اغیار کی طرف نظر کرنے سے اللہ کی غیرت کا ہونا

اس میں حق تعالی کی غیرت معلوم ہوتی ہے، اغیار کی طرف نظر کرنے سے۔

تشریح:

بندہ کا سارا وجود اور اس کی پوری شخصیت اور زندگی اللہ کی مرہون منت ہے، ان نعمتوں کی کسی حد تک حق ادائیگی کی صورت یہی ہے کہ بندہ غیروں کی طرف دل سے متوجہ نہ ہو، غیروں کی پرستش نہ کرے، غیروں سے توقعات وابستہ نہ کرے، محبوب سے والہانہ محبت کا مظاہرہ کرے، سندھ کے ایک صوفی شاعر کا شعر ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ محبوب بہت غیرتمند ہے، وہ تمہارا دوسروں کی طرف دل کی آنکھوں سے دیکھنا برداشت نہیں کرتا، صوفی کی حالت تو یہ ہوتی ہے کہ اسے محبوب کے علاوہ کسی کی حقیقی فکرمندی لاحق نہیں ہوتی، اس کی ساری زندگی محبوب ہی سے وابستہ ہوجاتی ہے، یہ آیت اس اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے کہ اللہ تعالی اپنے بندے کے دل کو اپنی محبت ومعرفت سے سرشار دیکھنا چاہتا ہے، دنیا بھر کی چیزیں اس قابل ہی نہیں ہیں کہ وہ بندے کے دل میں اپنی جگہ حاصل کرسکیں اور اس کی توانائیاں اس میں صرف ہونے لگیں۔ (مرتب)

وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُن مِّنَ السَّاجِدِينَ. (سورۃ الحجر، آیت نمبر ۹۸ ـ ۹۷)

(اور واقعی ہم کو معلوم ہے کہ یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں، اس سے آپ تنگ دل ہوتے ہیں، سو آپ اپنے پروردگار کی تسبیح وتعریف کرتے رہئے اور نماز پڑھنے اور سجدہ کرنے میں رہئے)۔

غم اور تنگی کا علاج

اس میں غم اور (سینہ کی) تنگی کا علاج بتایا گیا ہے کہ ذکر اور اللہ کی طرف توجہ ہے۔

تشریح:

اللہ کے رسول ﷺ کے لئے بھی سینہ کی تنگی سے بچنے کا جو طریقہ بتایا جارہا ہے، وہ اللہ کا ذکر، اس کی تسبیح اور اس کی طرف یکسوئی سے متوجہ ہونا ہے، اللہ کے رسول ﷺ سے بڑھ کر اللہ کے ساتھ یکسوئی اور کس کی ہوسکتی ہے، لیکن کفار کے انکار وسرکشی کی باتوں سے دل میں رنجیدہ ہونا فطری بات ہے، پھر دعوتی کاموں کے دوران توجہ کا متاثر ہونا بھی ضروری ہے، اس طرح کے حالات میں پوری یکسوئی سے اللہ کا ذکر دکھ واذیت کے ان احساسات کو ختم کرنے کا باعث بنتا ہے، جب اللہ کے رسول ﷺ کے اذیت کے احساس کا یہ علاج بتایا گیا تو ہمیں تو اس کی بہت زیادہ ضرورت ہے کہ دنیا کے حالات ومسائل ومصائب ہمارے دل کو متزلزل کردیتے ہیں، اللہ کے ذکر میں وہ توانائی اور حلاوت موجود ہے کہ فرد کی شخصیت ایک نئی توانائی اور ناقابل بیان حلاوت سے سرشار ہوجاتی ہے۔

اس لئے بندہ مومن بالخصوص داعی کے لئے ذکر سب سے بڑی قوت ہے، جس کے ذریعہ وہ ہر طرح کے حالات کے مقابلہ کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوجاتا ہے اور اللہ پر اس کے اعتماد ویقین میں اضافہ ہوجاتا ہے اور افراد کی ناگوار باتیں اس کے دل کو متزلزل کرنے میں ناکام ثابت ہوتی ہیں۔

اس آیت سے ذکر اور متوجہ الی اللہ ہونے کی اہمیت واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالی اپنی سب سے محبوب شخصیت کو اس کی تاکید فرمارہے ہیں۔ (مرتب)

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّى يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ. (سورۃ الحجر، آیت نمبر ۹۹)

(اور اپنے رب کی عبادت کرتے رہئے، یہاں تک کہ آپ کو موت آجائے)۔

شرعی احکام کا کسی قیمت پر معاف نہ ہونا

یقین کی تفسیر موت ہے تو اس میں ان لوگوں پر رد ہے کہ سلوک میں کوئی مرتبہ (اور

مقام) ایسا بھی ہے جس میں شرعی تکلیفیں ساقط ہوجاتی ہیں، یہ اعتقاد محض الحاد ہے۔

تشریح:

راہ سلوک ومحبت اللہ ورسول کی اطاعت میں اخلاص، مستعدی اور استحکام پیدا کرنے کی راہ ہے، تصوف کی ساری ریاضتوں کا حاصل یہی ہے کہ اسلامی شریعت، مزاج کا حصہ بن جائے اور اس میں آسانی وحلاوت پیدا ہوجائے۔

شرعی احکام کسی کو معاف نہیں ہوسکتے، راہ سلوک کا کوئی مقام ایسا نہیں ہے، جہاں اسلامی شریعت کے احکام معاف ہوں، ایسا اعتقاد رکھنا الحاد محض ہے، سارے اکابر صوفیاء اسلامی شریعت اور ہر سنت کے عامل وحامل رہے ہیں، یہ جاہل صوفیاء ہیں، جو شریعت سے فرار کے لئے راہیں تلاش کرتے رہتے ہیں، بدقسمتی سے موجودہ دور میں ایسے جاہل صوفیاء زیادہ ہوگئے ہیں، جو تصوف کی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

فَالَّذِيْنَ لاَ يُؤْمِنُونَ بِالآخِرَةِ قُلُوبُهُم مُنكِرَةٌ وَهُم مُسْتَكْبِرُونَ. (سورۃ النحل، آیت نمبر۲۲)

(تو جولوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کے دل منکر ہورہے ہیں اور وہ تکبر کرتے ہیں)۔

تکبر کی خطرناکیاں

تکبر ایسی مذموم صفت ہے کہ متکبر کو کفر کی سرحد پار کرتے ہوئے دیر نہیں لگتی، جیسا ایک بزرگ کا قول ہے کہ 'تکبر کو ذرا سا رگڑیں گے تو نیچے سے کفر نکلے گا۔ **اللھم احفظنا منه.**

تشریح:

تکبر کی بیماری ساری برائیوں کی جڑ ہے، عزازیل کو شیطان بنانے میں تکبر ہی نے اصل کردار ادا کیا، افراد میں ہر دور میں تکبر کی بیماری موجود رہی ہے، اس دور میں تو یہ بیماری اس قدر عام وخاص ہے کہ بہت کم افراد ہیں، جو اس بیماری سے بچے ہوں، راہ سلوک کے طالب کو برسوں تک نفس، تکبر اور بڑے پن کی صورت میں جس طرح پریشان کرتا ہے، اس سے طالب کو اس مرض کے ہولناک ہونے کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، اللہ اپنے فضل خاص سے اس بیماری سے نجات دلائے، ورنہ بظاہر اس سے بچنا دشوار ہے۔

من عمل صالحاً من ذکر او انثیٰ وھو مؤمن فلنحیینه حیوۃ طیبه (سورۃ

النحل، آیت نمبر ۹۷)

(جو شخص نیک کام کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ صاحب ایمان ہو تو ہم اس شخص کو لطف والی زندگی عطا کریں گے۔)

حیاۃ طیبہ وہ ہے، جو محبوب کے ساتھ ہو

روح میں بعض کا قول نقل کیا گیا ہے کہ حیاۃ طیبہ وہ (زندگی) ہے، جو محبوب کے ساتھ ہو، اور یہ زندگی اولیاء کو دنیا میں بھی میسر ہے۔

تشریح:

دنیا میں ہر شخص خوشی، حلاوت، سکون، مسرت اور پاکیزہ زندگی کا متلاشی ہے لیکن یہ ساری چیزیں عمل صالحہ پر محنت کے نتیجہ میں ہی حاصل ہوسکتی ہیں، ایسا عمل صالح، جس میں ایمان بھی موجود ہو، عمل صالحہ میں اخلاق حسنہ، باطنی بیماریوں سے بچاؤ اور اللہ ورسول کی مخلصانہ اطاعت بھی شامل ہے، بلکہ یہ چیزیں اعمال صالحہ کی روح ہیں، ان چیزوں کی سعادت کے نتیجہ میں ہی مسرت، حلاوت اور پاکیزہ زندگی نصیب ہوتی ہے اور یہ زندگی ہر طرح کے غم سے محفوظ زندگی ہوتی ہے، اہل اللہ کو کثرت ذکر اور اللہ سے والہانہ محبت کے نتیجہ میں یہ سعادت عظمیٰ حاصل ہوتی ہے، ان کا دل دنیا کے لئے مچلنے کے بجائے اللہ کے لئے تڑپتا رہتا ہے، انہیں ایک ہی فکر لاحق ہوتی ہے کہ اللہ محبوب کی رضا حاصل ہو، ان کے سارے افکار اسی ایک فکر میں دب جاتے ہیں، اعمال صالحہ میں بجائے خود سکینت، مسرت اور حلاوت کی خصوصیات شامل ہیں، لیکن دیکھا گیا ہے کہ بظاہر اعمال صالحہ ہونے کے باوجود سکون سے محرومی اور حلاوت سے ناآشنائی ہوتی ہے، پریشانیاں گھیرے رہتی ہے، چھوٹے سے چھوٹا واقعہ فرد کو متزلزل کردیتا ہے، مزاج میں ٹھہراؤ پیدا نہیں ہوتا، اس کا بنیادی سبب یہ ہوتا ہے کہ اعمالِ صالحہ میں اصل روح اور جان موجود نہیں ہوتی، وہ بے دلی سے سرانجام ہوتے ہیں، نیز زندگی کا بنیادی ہدف اللہ کی محبت، عبدیت کے آداب کی پوری طرح بجا آوری اور سب سے یکسو ہوکر، اللہ کا ہوجانے کا ہدف متعین نہیں ہوتا، اہل اللہ چونکہ ذکر وفکر کے مجاہدوں کے ذریعہ اللہ سے یکسو ہوجاتے ہیں، وہ دل کے اندر سے اللہ کے سوا دوسرے نقوش مٹا چکے ہوتے ہیں اور وہ ہر طرح کے حالات میں صبر وشکر کی

نفسیات کے حامل ہوتے ہیں، اس لئے انہیں اللہ کی طرف سے حیٰوۃ طیبہ کے اجزاء نصیب ہوتے ہیں۔

موجودہ دور میں جب کہ عام طور پر فرد کی زندگی بے چینی کے انگاروں پر لیٹنے کے مترادف ہوگئی ہے، ایسے حالات میں خوشی، لذت اور حلاوت کی زندی گویا نایاب ہوگئی ہے، اس کا ایک بڑا سبب مادیت پرستی کا عالمگیر ماحول بھی ہے، جس نے پیٹ اور جنس کو معبود کی صورت دی ہے اور جدید ترین تیز آلات کے ذریعہ پیٹ اور جنس کے جذبات کو اتنا مشتعل کردیا ہے کہ سوچ میں فساد پیدا ہوگیا ہے اور لگ بھگ ہر فرد فکری انتشار کا شکار ہوگیا ہے، مادیت کے ان عالمگیر اثرات سے مذہبی انسان بھی بُری طرح متاثر ہے، فضا میں موجود ان ہمہ گیر زہریلے اثرات سے بچاؤ کی واحد صورت ایک ہی ہے کہ اہل اللہ جن کو حلاوت اور پاکیزہ زندگی حاصل ہے، ان کی صحبت کے ذریعہ ان سے یہ اجزاء حاصل کئے جائیں۔

جب سچی طلب کے ساتھ اہل اللہ کی صحبت اختیار کی جائے گی اور ان کے دیے ہوئے ذکر پر محنت ہوگی تو اس کی برکت سے فرد وافراد کے لئے ہر طرح کی بے قراری، بے سکونی، انگاروں پر لیٹنے والی اشتعال وانتقام کی حالت اور پیٹ اور جنس کو معبود بنانے جیسی بیماریوں سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوگی، یہ اہم نکتہ ہے، جسے سکون کے متلاشی افراد کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

آیت کے حاشیہ میں بیان شدہ یہ نکتہ کہ حیاۃ طیبہ وہ زندگی ہے، جو محبوب کے ساتھ ہو، یہ بہت اہم نکتہ ہے۔

اس دور میں اللہ محبوب کے ساتھ ہوجانے کا کام سب سے زیادہ دشوار تر ہوگیا ہے، اس لئے کہ ماحول اس کے لئے سازگار نہیں، لیکن فرد اگر اللہ محبوب کے ساتھ یکسو ہوجانے والوں کی صحبت ومعیت اختیار کرے تو ان کی پاکیزہ صحبت کا ماحول انہیں ازخود مادیت پرستی کے ماحول سے اوپر اٹھانے اور اللہ کے ساتھ تعلق مستحکم کرنے کا ذریعہ بنے گا، ان کی مسلسل صحبت کے نتیجہ میں ایک وقت آئے گا کہ انہیں خود اللہ محبوب کے ساتھ حالت وصال کی نعمت عظمیٰ حاصل ہوگی، جو دنیا کے ہر طرح کے تفکرات سے بچاؤ اور آخرت کی زندگی میں محبوب کے مشاہدے کا ذریعہ ثابت ہوگی، اس دنیا میں بھی ان کا دل رفتہ رفتہ

اللہ کے انوار حسن کے مشاہدے سے فیضیاب ہوتا جائے گا۔

جدید انسان عقلیت کی تحریکوں کے زیر اثر اہل اللہ کو کوئی حیثیت دینے کے لئے تیار نہیں، اس کی سزا وہ بے قراری کے انگاروں پر لیٹنے کی صورت میں بھگت رہا ہے، اگر جدید انسان میں فساد سے بھری ہوئی اس زندگی سے نجات اور بچاؤ کا احساس پیدا ہوجائے اور وہ تجربے کے طور پر ہی سہی اہل اللہ کی صحبت اختیار کرے تو ان شاء اللہ اسے حیاۃ طیبہ کے اجزاء حاصل ہونا شروع ہوں گے، جدید انسان نئے نئے تجربات کرنے کا عادی ہے، لیکن اسے روحانی سکون وسکینت کے حصول کے لئے ایک بار یہ بھی تجربہ کرکے دیکھنا چاہئے، حقیقی سکون کے متلاشی افراد کے لئے اہل اللہ کی صحبت نعمت عظمیٰ کی حیثیت رکھتی ہے، اس کے بعد دولت، دنیا اور عزت وشہرت کی زندگی پر وہ لات مارنے، یعنی اس سے دستبردار ہونے کے لئے ازخود تیار ہوجائے گا، اس لئے کہ حیاۃ طیبہ کے بعد کثرتِ دولت، شہرت اور منصب کی کاوشیں اسے بے معنیٰ محسوس ہوں گی۔

حدیث شریف میں ہے کہ فرد آخرت میں اس کے ساتھ ہوگا، جس کے ساتھ اس نے زندگی گزاری ہوگی، دوسری حدیث ہے کہ اگر کسی کو دیکھنا چاہو کہ وہ کس راستہ پر گامزن ہے تو اس کے دوست کو دیکھ لو، تجربات ومشاہدات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ فرد کی زندگی پر دوست کی صحبت ہی اثر انداز ہوتی ہے۔

وَلٰـكِن مَّن شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْراً فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ. (سورۃ النحل، آیت نمبر ۱۰۶)

(تو ہاں جو جی کھول کر کفر کرے تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہوگا)۔

وسوسے گناہوں کا موجب نہیں

وسوسوں سے پریشان نہ ہونا چاہئے، کیونکہ ان پر گناہ بھی نہیں ملتا، جب تک اس وسوسے کو پورا کرنے کا مصمم ارادہ نہ کرے۔

تشریح:

راہ سلوک کے طالب وسوسوں سے بہت زیادہ پریشان ہوتے ہیں، اس لئے کہ ذکر کے نور سے نفس کے اندر کی گندگی کی صفائی ہونے لگتی ہے، اس کے اندر سے گند نکلنے لگتا

ہے اور وہ وسوسوں کی صورت میں سامنے آنے لگتا ہے، وقتی طور پر وسوسوں کے ہجوم پیدا ہونے کے بعد طالب جوں ہی دوبارہ سہ بارہ ذکر کا سہارا لینے لگتا ہے تو یہ وسوسے رفتہ رفتہ تھمنے لگتے ہیں، وسوسوں سے مقابلہ کرنا، راہ سلوک کے طالبوں کا لگ بھگ معمول ہوتا ہے، یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ طالب کام میں مصروف ہے، یہ وسوسے اسی کی علامت ہیں، لیکن طالب پر یہ اللہ کا فضل خاص ہوتا ہے کہ اکثر معاملہ وسوسوں تک محدود رہتا ہے، یہ وسوسے اعمال بد تک اکسانے کا ذریعہ کم ہی بنتے ہیں، طالب کا جب تک سلوک کا سفر قابل ذکر حد تک طے نہیں ہوتا اور وہ حالت فنا سے حالت بقا میں نہیں آتا، اس وقت تک وسوسے اس کا پیچھا چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، سبب یہ ہے کہ نفسی قوتوں سے آسانی سے جان نہیں چھوٹتی، طالب، دوران سفر وسوسوں کا عادی ہوجاتا ہے، اس لئے وہ انہیں زیادہ اہمیت نہیں دیتا، وہ ان وسوسوں کو سلوک کا لازمی حصہ سمجھنے لگتا ہے۔ (مرتب)

وَآتَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَإِنَّهُ فِي الآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِيْن. (سورۃ النحل، آیت نمبر۱۲۲)

(اور ہم نے ان کو دنیا میں بھی خوبیاں دی تھیں اور وہ آخرت میں بھی اچھے لوگوں میں ہوں گے)۔

دنیا کی نعمتیں

اس میں دلالت ہے کہ دنیا میں نعمتوں کا مل جانا، مقام عقبی کے لئے نقصان دہ نہیں، اور بعض نے جو یہ کہا ہے کہ مشہور ولی کا مقام غیر مشہور سے کم ہے، اس سے مراد وہ ہے، جس میں شہرت کی آفات پیدا ہوگئی ہوں۔

تشریح:

دنیا میں حاصل ہونے والی نعمتیں ہر صورت میں آخرت کے منافی نہیں، ہاں جب یہ نعمتیں اللہ سے دوری کا ذریعہ بنیں یا بخل کا سبب ہوں یا بڑے پن کا موجب بنیں تو اس وقت یہ نعمتیں آزمائش کی حیثیت اختیار کرجاتی ہیں، مشہور ولی جس سے لوگوں کی بہتر اصلاح کا کام ہو، اس کو حاصل ہونے والی یہ شہرت اس پر اللہ کا فضل خاص ہے۔ البتہ

شہرت دوسرے اعتبار سے آفت ہے کہ اس کی وجہ سے بڑا بننے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے، اس لئے حقیقی صوفی کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ گمنام رہے اور شہرت سے دور ہو، اس کے باوجود اگر اسے شہرت حاصل ہوتی ہے تو ایک تو یہ شہرت من جانب اللہ ہے دوسرے یہ کہ اس سے یہی سمجھا جائے گا کہ اللہ اس سے بڑے پیانہ پر اصلاح کا کام لینا چاہتا ہے۔ (مرتب)

ولئن صبرتم لهو خير للصٰبرين وصبر وما صبرک الیٰ باالله ولا تحزن عليهم (النحل آیت ۱۲۶- ۱۲۷)

(اور اگر صبر کرو تو وہ صبر کرنے والوں کے حق میں بہت اچھی بات ہے اور آپ صبر کیجئے اور آپ کا صبر کرنا خاص اللہ ہی کی توفیق سے ہے اور ان پر غم نہ کیجئے۔

صبر کے مراتب

صبر کے بہت سے مراتب (درجے) ہیں صبر للہ، صبر فی اللہ، صبر مع اللہ، صبر عن اللہ اور صبر باللہ، ان سب کی حقیقت اصل رسالہ عربی میں دیکھو اور صبر باللہ سب سے اکمل صورت ہے، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ثابت کیا گیا ہے۔

تشریح:

اللہ کی خاطر صبر کرنا اور صبر سے کام لینا، قرآن میں متعدد مقامات پر اس کی تاکید ہے، صبر ایسی چیز ہے کہ راہ حق پر گامزن ہونے کے لئے بے شمار معاملات میں اس کی ضرورت درپیش ہوتی ہے، نفس کے خلاف مجاہدوں کے دوراں اس کی طرف سے ہونے والی مزاحمت پر صبر کرنا، اسلامی احکامات کی بجا آوری کے وقت پیش آنے والی تکالیف پر صبر کرنا، دعوتی کام کے دوراں رکاوٹوں اور مخالفتوں پر صبر سے کام لینا، مزاج کے خلاف ہونے والی باتوں پر صبر کرنا، جہاد وقتال کے دوراں آنے والی تکالیف پر صبر کرنا، اللہ کی خاطر مخالف کو برداشت کرنا اور ان کو معاف کردینا، معاشی طور پر پیش آنے والی تنگی کے وقت صبر سے کام لینا، لوگوں کی طرف سے اذیت پہنچانے کے مواقع پر صبر کرنا، بیماری پر صبر وشکر سے کام لینا، غرض کہ فرد کو قدم قدم پر صبر سے کام لینے کی ضرورت درپیش ہوتی ہے، یہ صبر ہی ہے، جو فرد کی شخصیت میں نکھار پیدا کرتا ہے، صبر ہی ہے جو فرد کے درجات

کی بلندی کا ذریعہ بنتا ہے۔

صبر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس سے حق پر قائم رہنے کی استقامت پیدا ہوتی ہے، صبر کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مخالفوں تک کے دل میں داعی کے لئے نرم گوشہ پیدا ہوتا ہے، اسی لئے قرآن میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے: اور نیکی وبدی برابر نہیں ہوتی، آپ نیک برتاؤ سے ٹال دیا کیجئے۔ پھر یکا یک آپ میں اور جس شخص میں عداوت تھی، وہ ایسا ہوجائے گا جیسا کوئی دلی دوست ہوتا ہے اور یہ بات انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو صبر کرتے ہیں۔ (حمٓ سجدہ۳۴-۳۵)

بالخصوص نفس کے خلاف مجاہدوں کے سلسلہ میں تو غیر معمولی صبر کی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے کہ نفس کی قوتیں روزمرہ زندگی میں پوری شدت سے حملہ آور ہوکر، فرد کو متزلزل کردیتی ہے اور قبض (بے چینی) کی نہ ختم ہونے والی حالت بھی فرد کو سخت امتحان میں ڈال دیتی ہے، اس طرح راہ سلوک میں آنے والے بے شمار افراد نفس کے حملوں کا مقابلہ نہ کرنے اور صبر سے کام نہ لینے کے نتیجہ میں اللہ کی محبت سے محروم ہوکر خسران سے دوچار ہوتے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں۔

طالبوں اور سالکوں کو صبر کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے، اس لئے کہ نفس کی قوتوں کو پامال کرکے، ان قوتوں کو اللہ کے تابع کرنا ایک مستقل عمل ہے اور نفس کے خلاف روزانہ کی جنگ ہے، اس میں غیر معمولی صبر کے مظاہرے کے بغیر چارہ کار ہی نہیں۔

اللہ کی معیت کا حصول غیر معمولی مجاہدوں کا طالب ہے، اس کے لئے مستقل مزاجی اور غیر معمولی صبر کی ضرورت ہے۔

صبر کی توضیح اس طرح بھی کی جاسکتی ہے کہ ہر طرح کے باطل کے خلاف ڈٹ جانا، جم جانا، اللہ کی اطاعت پر ہر طرح کے حالات میں قائم رہنا صبر ہے، یہ باطل، باطنی نوعیت کا ہو یا خارجی نوعیت کا، دونوں نوعیت کے باطل کے خلاف مستحکم ہونا، یہی صبر ہے، اس اعتبار سے صبر نفس کی قوتوں، شیطانی قوتوں اور مادیت پرست قوتوں کے خلاف معرکہ آرائی کرکے، اپنے آپ کو مکمل طور پر اللہ کی اطاعت میں دیدینے کا نام ہے، یہی صبر ہے، جس کے نتیجہ میں دنیا وآخرت میں بہت سارے انعامات کی خوش خبری سنائی گئی ہے، لیکن

اس صبر کی شروعات نفس کے خلاف مجاہدوں سے ہوتی ہے، جب فرد نفس کے خلاف معرکہ آرائی میں بڑی حد تک کامیاب ہوتا ہے تو خارجی نوعیت کے باطل سے مقابلہ کرنا اس کے لئے آسان ہوجاتا ہے۔

فرد کو زندگی اور جسمانی توانائیوں کی یہ نعمت اس لئے ملی ہے، تاکہ اسے آزمایا جائے کہ وہ ان توانائیوں کو اللہ کی رضامندی کے مقصد کے لئے استعمال کرتا ہے یا خواہشات نفس کے لئے، اس آزمائش سے عہدہ برآ ہونے کے سلسلہ میں صبر سب سے بنیادی اور فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے، نفس، شیطان اور مادی قوتوں کے مقابلے سے فرد کی شخصیت میں استحکام، ٹھہراؤ اور توازن آتا ہے، یہ استحکام وتوازن صبر ہی کا مرہون منت ہوتا ہے، صبر ایک اعتبار سے فرد کی جدوجہد سے تعلق رکھتا ہے تو دوسرے اعتبار سے یہ اللہ کے فضل خاص کا نتیجہ ہوتا ہے، اللہ، جب فرد کے نفس اور باطل کے خلاف جہاد اور مستقل مزاجی کو دیکھتا ہے تو وہ اپنے فضل خاص سے اس کے صبر کے مزاج کو مستحکم کردیتا ہے اور اپنی تائید ونصرت سے فرد کو حق پر گامزن رہنے کی استعداد عطا فرما دیتا ہے، تزکیہ نفس کا کام ہو یا **امر بالمعروف** اور **نهی عن المنکر** کا کام، اس کے لئے صبر، ہمت، حوصلہ اور استقامت کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے، فرد جب ان کاموں میں اپنی امکانی حد تک استقامت کا ثبوت دیتا ہے تو اس کے ساتھ اللہ کا فضل شامل ہوتا ہے اور اللہ کی طرف سے اسے مستحکم سے مستحکم تر کردیا جاتا ہے اور اس کے لئے راہیں کھول دی جاتی ہیں۔

قرآن میں ایک جگہ ہے: ’’سو انہوں نے ہمت نہ ہاری، ان مصائب کی وجہ سے جو ان پر اللہ کی راہ میں واقع ہوئیں اور نہ ان کا زور گھٹا اور نہ وہ دبے اور اللہ تعالیٰ کو ایسے صابروں سے محبت ہے۔‘‘ (آل عمران آیت ۱۴۶)

ایک اور جگہ ہے: ’’کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ جنت میں داخل ہوگے، حالانکہ ابھی اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو دیکھا ہی نہیں، جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا ہو، نہ ان کو دیکھا جو (ثابت قدم رہنے والے) صبر کرنے والے ہیں۔‘‘ (آل عمران آیت ۱۴۲)

قرآن کی اس طرح کی آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زندگی صبر کی آزمائش کے لئے ملی ہے، اللہ دیکھنا چاہتا ہے کہ وہ کون افراد ہیں، جو نفس، مادیت پرست قوتوں اور شیطان کے خلاف جہاد کرنے کی راہ پر گامزن رہتے ہیں، اس طرح کے صابروں اور جہاد

سے اعراض کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ ایک دوسرے سے جدا کرنا چاہتے ہیں اور صبر کرنے والوں کو اپنے انعام واکرام اور اعزاز سے نوازنا چاہتے ہیں۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ صبر جہاد میں استقامت کا نام ہے اور سعادت دارین کا ذریعہ بھی، اس لئے صبر کا ملکہ راسخ کرنے کے لئے فرد جتنے بھی مجاہدوں سے کام لے، کم ہیں۔

الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ أَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ يَجْعَل لَّهُ عِوَجًا. (سورۃ بنی اسرائیل، آیت نمبر۱)

(تمام خوبیاں اس اللہ کے لئے ثابت ہیں، جس نے اپنے بندے پر یہ کتاب نازل فرمائی اور اس میں ذرا بھی کجی نہیں رکھی)۔

مقام عبدیت کے برابر کوئی مقام نہیں

اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ مقام عبدیت کے برابر کوئی مقام نہیں اور حضورﷺ اس کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہیں۔

تشریح:

مقام عبدیت پر فائز ہونا، سب سے بڑا مقام ہے، حضورﷺ اس مقام کی بلندیوں پر فائز تھے۔

مقام عبدیت بندے سے اس بات کا متقاضی ہے کہ وہ اللہ کا خالص اور حقیقی بندہ بن کر رہے اور اس بندگی میں کسی دوسرے کی بندگی کا ذرہ برابر بھی شائبہ نہ ہو، نہ نفس کا نہ کسی اور کا، بندے کی ساری خصوصیات وصفات اور ساری صلاحیتیں اس بات سے وابستہ ہیں کہ وہ عبدیت (یعنی بندے ہونے) کے مقام میں ترقی پر ترقی حاصل کرے، اہل اللہ کی ساری جدوجہد اس مقصد کے حصول کے لئے ہوتی ہے کہ وہ اللہ کی عبدیت کے پورے طرح آداب بجالائے اور اللہ کی زمین پر اللہ کا بندہ بن کر رہنے کا سلیقہ سیکھے اور اس کا کوئی عمل ایسا نہ ہو، جو عبدیت کے منافی ہو، عبدیت کا یہ مقام کسی حد تک نفس کی فنائیت سے وابستہ ہے، جب تک نفس فنا نہیں ہوتا، عبدیت کی راہ میں سخت رکاوٹیں درپیش ہوتی ہیں اور بندہ، بندگی کے آداب اور اس کے حقوق کی بجا آوری میں ناقص ثابت ہوتا ہے۔

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا. (سورۃ بنی اسرائیل، آیت نمبر۷)

(ہم نے زمین کی چیزوں کو اس کے لئے باعث رونق بنایا، تاکہ ہم لوگوں کی آزمائش کریں کہ ان میں زیادہ اچھا عمل کون کرتا ہے)۔

حسن عمل اللہ کے جلال وجمال کے مشاہدہ کا آئینہ ہونا

اس حسن عمل میں یہ بھی داخل ہے کہ زمین کی اشیاء، نہر اور درختوں اور پہاڑوں وغیرہ کو اللہ تعالیٰ کے جلال وجمال کے مشاہدہ کا آئینہ بنائے، ابن عطار نے فرمایا ہے کہ حسن عمل یہ ہے کہ سارے (حوادث) سے بے التفاتی اختیار کی جائے، بعض نے کہا ہے کہ اہل معرفت ومحبت زمین کی زینت (ورونق) ہیں اور حسن عمل ان کی طرف احترام کے ساتھ نظر کرتا ہے۔

تشریح:

حسن عمل کے لئے دل کی آنکھوں کی بیداری کے بغیر چارہ کار نہیں، دل جب بیدار ہوتا ہے اور وہ اللہ کی محبت سے سرشار ہونے لگتا ہے تو سالک کے لئے دنیا کی ہر چیز ایسا آئینہ ہوتا ہے، جو محبوب کے مشاہدے کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے، حسن عمل کی وجہ سے سالک دنیا بھر سے بے نیاز ہوجاتا ہے، حسن عمل دراصل محبوب کے انوار وتجلیات کے غلبے کا نتیجہ ہوتا ہے، اس کے بغیر حسن عمل کی استعداد پیدا نہیں ہوسکتی، یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ اہل محبت ومعرفت چونکہ زمین کی رونق ہیں، اس لئے حسن عمل ان کی طرف احترام کے ساتھ نظر آتا ہے، یعنی اہل محبت ومعرفت حسن عمل کا مجسمہ ہوتے ہیں، حسن عمل ان سے ازخود صادر ہوتا ہے، انہیں حسن عمل کے لئے تکلف کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی، محبوب کے انوار حسن کے مشاہدے کی وجہ سے حسن عمل ان کے مزاج کا حصہ بن جاتا ہے۔

جو سالک حسن عمل کے اس مقام پر فائز ہیں، ان کی خوش نصیبی کا کیا ٹھکانہ ہے، ایسے افراد ہی زمین کی رونق ہیں اور دنیا انہی کے دم قدم سے قائم ہے۔

مادیت کے غلبے کے اس دور میں حسن عمل کے اس طرح کے حامل اور عامل اہل اللہ موجود ہے، بس ان تک پہنچنے کی تڑپ موجود ہو تو اللہ ان تک پہنچا ہی دیتے ہیں، ہم جیسے

سیاہ کار ایسے اہل اللہ کی صحبت کو ہی بڑی سعادت سمجھتے ہیں۔

وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُوا مَا عَلَوْا تَتْبِيرًا. (سورۃ بنی اسرائیل، آیت نمبر ۷)

(اور جس طرح وہ لوگ مسجد میں گھسے تھے یہ لوگ بھی اس میں گھس پڑیں اور جس جس پر ان کا زور چلے سب کو برباد کر ڈالیں)۔

مصیبتوں کا بندوں کے لئے ڈانٹ ڈپٹ کا ذریعہ ہونا

آفات اور مصیبتوں کی پیدائش بے کار نہیں ہے، بلکہ یہ بندوں کے لئے استاد یا والد کی ڈانٹ ڈپٹ کی طرح ہیں کہ اگر تم نے فلاں حکم نہ مانا تو تمہیں یہ سزا ملے گی، اسی طرح اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی حکم عدولی کی وجہ سے ان پر کفار کو مسلط کرتے رہتے ہیں۔

تشریح:

آفات و مصیبتیں مسلمانوں کو بیدار کر کے، اللہ کی طرف رجوع ہونے کا ذریعہ ثابت ہوتی ہیں، یہ آفات استاد یا ماں باپ کی ڈانٹ ڈپٹ کی حیثیت رکھتی ہیں، ان کا مقصد بندوں کو جھنجھوڑ کر، عبادت واطاعت کی راہ پر لانا ہوتا ہے، لیکن اگر آفات کے باوجود افراد نافرمانی سے باز نہیں آتے تو سزا کے طور پر ان پر دشمن کو مسلط کر دیا جاتا ہے، جو انہیں ذلیل کرتا ہے، ان سے بیگار لیتا ہے اور انہیں پامال کرتا رہتا ہے، اگر گناہوں سے اجتماعی طور پر توبہ پر آمادگی پیدا ہوتی ہے تو دشمن سے نجات کی صورت پیدا ہو جاتی ہے، دوسری صورت میں سزا کا یہ عمل عرصے تک جاری رہتا ہے، مسلمان لگ بھگ پچھلے دوڈھائی سو سالوں سے دشمن کے براہ راست یا بالواسطہ طور پر دشمن کے غلبہ کی صورت میں سزا بھگت رہے ہیں، لیکن وہ بیدار ہو کر، اللہ کی طرف رجوع ہونے کے لئے تیار نہیں، بلکہ بڑے المیہ کی بات یہ ہے کہ اپنے گناہوں کا ادراک ہی سلب ہو گیا ہے۔ (مرتب)

وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا. (سورۃ بنی اسرائیل، آیت نمبر ۱۶)

(اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے خوش عیش لوگوں کو حکم دیتے ہیں پھر وہ وہاں شرارت مچاتے ہیں)۔

خواہشات وشہوات سے طالب کے قلب کا خراب ہونا

اس میں اشارہ ہے کہ اسی طرح جب مرید کے قلب کو خراب کرنا منظور ہوتا ہے تو اس پر نفس وشیطان کے لشکروں کو مسلط کر دیا جاتا ہے، پس شہوات وطبیعات کے اتباع سے قلب خراب ہو جاتا ہے۔

تشریح:

آیت کا ظاہری مفہوم تو یہی ہے کہ جب کسی بستی کو ہلاک کرنا منظور ہوتا ہے تو وہاں کے خوشحال لوگوں کو نفسی خواہشات کی تکمیل اور عیش وعشرت کی راہ پر لگا دیتے ہیں، اس طرح اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے وہ ہلاکت کے مستحق بن جاتے ہیں۔

حکیم الامت نے یہاں جو نکتہ اخذ کیا ہے، وہ نکتہ اس اعتبار سے بھی صحیح ہے کہ عیش وعشرت کے حاملوں کی تباہی کا سبب بھی ان کی دل کی خرابی ہوتی ہے، دل مادی لذتوں پر فریفتہ ہوتا ہے۔ اسی طرح راہ سلوک میں بھی سب سے پہلے طالب کے دل میں خرابی پیدا ہوتی ہے، دل کی یہ خرابی ہی اس پر نفس اور شیطان کے تسلط اور شہوات کے غالب ہونے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، اس طرح طالب کی بربادی کا سامان تیار ہوتا ہے۔

مبتدی طالب ویسے بھی عام طور پر نفس کے زیر اثر ہوتا ہے، اس کا ذکر کا دورانیہ کم ہوتا ہے، مادی افراد سے اس کا تعلق گہرا ہوتا ہے، اس صورت میں اس پر نفس وشیطان کے لشکروں کو مسلط کر کے، اسے حب جاہ وحب مال اور حرص وہوس کے گناہوں میں مبتلا کیا جاتا ہے، جس سے اس کے قلب کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، اگر طالب کا ذکر وصحبت کے دورانیہ میں اضافہ ہوتا ہے تو نفس اور شیطان کے لشکروں کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے، دوسری صورت میں ایسا طالب نفس پرستی کی قوتوں کی نذر ہو جاتا ہے اور بظاہر وہ راہ سلوک وراہ محبت میں چل رہا ہوتا ہے، لیکن عملاً اس پر نفسی قوتوں کا غلبہ ہوتا ہے، اگر وہ اپنے شیخ سے یکسو ہو کر، ذکر وفکر کے معمول میں اضافہ کرتا ہے تو اسے اس بحران سے نکال دیا جاتا ہے، ایسا نہ کرنے کی صورت میں اسے نفس کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ (مرتب)

وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَئِكَ كَانَ سَعْيُهُم مَّشْكُورًا. (بنی اسرائیل آیت ۱۹)

(جو شخص آخرت کی نیت رکھے گا اور اس کے لئے جیسی سعی کرنی چاہئے، ویسی سعی کرے گا، بشرطیکہ وہ مؤمن بھی ہو تو ایسے لوگوں کی یہ سعی مقبول ہوگی)۔

آخرت کے لائق سعی کی وضاحت

روح میں ہے کہ جو سعی آخرت کے لائق ہو، وہ وہ ہے، جو شریعت کے موافق ہو اور جس میں استقامت ہو۔

تشریح

آخرت جو دین کے مقاصد میں شامل ہے کہ وہاں نجات کی صورت پیدا ہو اور اللہ کے مشاہدہ کی نعمت عظمٰی حاصل ہو، یہ سعادت جزوی اور معمولی عبادت واطاعت سے حاصل نہ ہوگی، اس کے لئے اسلامی شریعت پر استقامت سے گامزن ہونا ناگزیر ہے، جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ آخرت میں نجات وسعادت کے حصول کے لئے ہر وقت کی فکرمندی وسعی درکار ہے، جس طرح دنیادار اور مالدار افراد دنیا کی چند دنوں کی زندگی کی بہتری کے لئے کلی وقت صرف کرتے ہیں، ہر وقت اس کے لئے فکرمند رہتے ہیں اور اس کے لئے بہتر سے بہتر منصوبہ بندی سے کام لیتے ہیں، اسی طرح جب تک آخرت کو مقصود بنا کر، ساری کوششوں کا ہدف آخرت کی نجات اور وہاں اللہ کے مشاہدہ کی نعمت پیش نظر نہ ہو اور دین پر استقامت حاصل نہ ہو، تب تک آخرت کی زندگی خطرے سے دوچار ہوگی۔

آخرت کے لائق سعی وہی ہے، جو اسلامی شریعت کے موافق ہو، جس میں زندگی بھر کے معاملات میں اسلامی شریعت کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی سعادت حاصل ہو، پھر اس سعی میں استقامت بھی حاصل ہو، یعنی اسلامی احکامات کی بجا آوری میں مستقل مزاجی حاصل ہو، زندگی بھر فرد اس جدوجہد میں لگا رہے، زمانہ وحالات سے متاثر ہوکر شریعت کا دامن کسی بھی صورت میں چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہو۔

إِن تَكُونُواْ صَالِحِينَ فَإِنَّهُ كَانَ لِلأَوَّابِينَ غَفُوراً. (سورۃ بنی اسرائیل، آیت نمبر ۲۵)

(اگر تم سعاتمند ہو تو وہ توبہ کرنے والوں کی خطا معاف کر دیتا ہے)۔

شیخ کا طالب سے پیار ومحبت سے معذرت کرنا

اگر (شیخ) کسی وجہ سے طالبین کو افادہ نہ دے سکتا ہو تو انتہائی محبت وپیار سے ان کو

جواب دیدے، جھڑ کے نہیں۔

تشریح:

بعض طالب ایسے ہوتے ہیں، جو شیخ کی کوششوں کے باوجود نہ تو ذکر وفکر کے لئے تیار ہوتے ہیں اور نہ ہی وہ صحبت کے لئے وقت نکال پاتے ہیں، تو ایسے طالبوں کو زبان حال سے سمجھانے کی ساری کوششوں کے باوجود وہ سنبھلنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، اس طرح کے طالبوں سے معذرت کے بغیر چارہ کار نہیں ہوتا، یہ معذرت پیار ومحبت سے ہونی چاہیے، شاید آگے چل کر ان میں حقیقی طلب پیدا ہو اور وہ اصلاح کے لئے بے تاب ہوکر رجوع ہوں۔

راہ سلوک کے سفر کی حیثیت وسیع جنگل کی سی ہے، جہاں ہزاروں رہزن رہتے ہیں، اس سفر میں قدم قدم پر ایسے رہبر کی ضرورت ہوتی ہے، جو اس سفر کو مکمل طور پر طے کر چکا ہو، اس طرح کے رہبر کے بغیر سفر کرنا یا اس کی ہدایت کے بغیر اپنے طور پر نفس کے رہزنوں کا مقابلہ کرنا، طالب کو شدید مشکلات میں مبتلا کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے، راہ سلوک میں طالب کو ہر موڑ پر اپنے شیخ ومربی سے رابطہ وصحبت کی ضرورت درپیش ہوتی ہے اور اسے اپنے حالات سے آگاہ کرنا ہوتا ہے، شیخ کے مشورے کے بغیر ذکر کے دورانیہ یا وظائف میں اضافہ کرنا نقصان دہ ہوسکتا ہے، شیخ، طالب کے حالات اور اس کی صلاحیت واستعداد کے مطابق اس کے لئے نسخے تجویز کرتا رہے گا، جس سے اس کے اس سفر میں ارتقا ہوتی رہے گی۔ (مرتب)

'' **تُسَبِّحُ لَهُ السَّمَاوَاتُ السَّبْعُ وَالأَرْضُ وَمَن فِيهِنَّ وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلاَّ يُسَبِّحُ بِحَمْدَهِ وَلَـكِن لاَّ تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ.** '' (سورۃ بنی اسرائیل، آیت نمبر ۴۴)

(ساتوں آسمان اور زمین میں موجود ساری چیزیں اللہ کی تسبیح وتعریف بیان کرتی ہیں، لیکن تم اس کی تسبیح کو نہیں سمجھتے)۔

اشیاء کائنات کی اللہ کی حمد وثنا میں مصروف رہنا

اس کائنات میں ساری اشیاء وہ جس قسم کی بھی ہوں، وہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا میں مصروف ہیں، مگر اس تسبیح کو ہم ذاتی طور پر محسوس نہیں کر سکتے، کشف کے ذریعے معلوم

ہوجائے تو اور بات ہے۔

تشریح:

ساری اشیائے کائنات جو ذکر کرتی ہیں، وہ پورے شعور کے ساتھ ذکر ہوتا ہے، بعض مفکروں کی یہ بات صحیح نہیں ہے کہ اشیائے کائنات کا قدرتی قوانین کے مطابق اپنی زندگی کے سفر کو جاری رکھنا، یہی ان کا ذکر ہے، قرآن نے متعدد مقامات پر یہ بات واضح فرمائی ہے کہ اشیائے کائنات باقاعدہ اللہ کا ذکر کرتی ہیں۔

وَقُل لِّعِبَادِیْ یَقُولُواْ الَّتِیْ هِیَ أَحْسَنُ إِنَّ الشَّیْطَانَ یَنزَغُ بَیْنَهُمْ إِنَّ الشَّیْطَانَ کَانَ لِلإِنْسَانِ عَدُوّاً مُّبِیْناً. (سورۃ بنی اسرائیل، آیت نمبر ۵۳)

(اور آپ میرے بندوں سے کہہ دیجئے کہ ایسی بات کہا کریں، جو بہتر ہو، شیطان لوگوں میں فساد ڈلوا دیتا ہے اور واقعی شیطان انسان کا صریح دشمن ہے)۔

مخالفین کے ساتھ نرمی کی تعلیم

اس میں مخالفین کے ساتھ نرمی کی تعلیم ہے۔

تشریح:

شیطان کی کاوش ہوتی ہے کہ سخت مزاجی اور سخت گفتگو کے ذریعہ دوستوں اور عزیز واقارب اور اپنوں اور غیروں سب کے درمیان دشمنی کی فضا پیدا کی جائے، اس طرح اللہ کی زمین کو فساد سے بھر دیا جائے، لیکن اللہ کے حقیقی طالب کا دل، اللہ کی محبت سے سرشار ہونے کی وجہ سے وہ اس کے بندوں سے بھی محبت وشفقت کا مظاہرہ کرتا ہے، نرم گفتگو اور نرمی والا مزاج اس کی خصوصیت ہوتا ہے، وہ اپنوں اور غیروں سب کے لئے شفیق ہوتا ہے، اس کی کوشش ہوتی ہے کہ معاشرے میں بُردباری، نرمی اور محبت کے جذبات کو فروغ حاصل ہو، تاکہ انسانیت خلفشار سے بچ سکے۔ ایک حدیث شریف ہے کہ نرمی کی اگر کوئی شکل ہوتی تو وہ سب سے بہتر شکل ہوتی اور سختی کی اگر کوئی شکل ہوتی تو وہ سب سے بُری شکل ہوتی، ایک دوسری حدیث شریف ہے کہ جو نرمی (کی صفت) سے محروم ہوا وہ سارے خیر سے محروم ہوا۔

وَکَفَی بِرَبِّکَ وَکِیْلاً. (سورۃ بنی اسرائیل، آیت نمبر ۶۵)

(اور آپ کا رب کافی کارساز ہے)۔

اللہ تعالیٰ کی حفاظت کے بغیر
گناہوں سے بچنے کی صورت کا پیدا نہ ہونا

روح میں ہے کہ اس میں دلالت ہے کہ انسان گمراہی کے مواقع پر اللہ تعالیٰ کی حفاظت کے بغیر خود نہیں بچ سکتا۔

تشریح:

بندے کے ساری کاوشوں کے باوجود ہوتا یہ ہے کہ فرد، نفس، شیطان اور مادیت کے اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، منتہی صوفی اگر گناہوں سے بڑی حد تک محفوظ بھی ہو تو بعض حالات میں گناہوں کے وسوسوں کا دباؤ تو بہرحال اس پر بھی ہوتا ہے، بڑے گناہ نہ سہی، چھوٹے گناہ تو اس سے ہوتے ہی ہیں، مثلاً کبھی غصہ کا ہونا، کبھی معاشی مجبوریوں کی وجہ سے شکر کی ادائیگی کے بجائے دکھ واذیت کا ہونا، مخالفوں سے بدلہ لینے کے خیالات کا آنا وغیرہ وغیرہ۔

اس طرح کے سارے حالات میں بندے کے لئے گناہوں سے بچاؤ کا واحد سہارا اللہ کی ذات ہی ہے، بندہ اپنی کاوشوں سے گناہوں اور اس کے شدید وسوسوں سے بچ نہیں سکتا، اللہ کے فضل خاص سے ہی اس کے لئے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے، اللہ ہی بہتر کارساز ہے، وہی بندے کی حفاظت فرماتا ہے، اس لئے طالب کو اپنے مجاہدوں پر ناز کرنے سے ہر صورت میں بچنا چاہئے۔

أَمْ أَمِنتُمْ أَن یُعِیْدَکُمْ فِیْهِ تَارَةً أُخْرَى فَیُرْسِلَ عَلَیْکُمْ قَاصِفاً مِّنَ الرِّیْحِ فَیُغْرِقَکُم بِمَا کَفَرْتُمْ. (سورۃ بنی اسرائیل، آیت نمبر ۶۹)

(یا تم اس سے بے فکر ہوگئے کہ اللہ تعالیٰ تم کو دریا میں دوبارہ لے جائے اور تم پر ہوا کا سخت طوفان بھیج دے اور تم کو تمہارے کفر کے سبب غرق کردے)۔

ماضی کو یاد کرنا اور ماضی کو حجاب سمجھنا مغالطہ کا جواب

یہاں شبہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ماضی کی یاد دلائی، جب کہ اہل طریق (اہل تصوف) ماضی کو حجاب سمجھتے ہیں، جواب یہ ہے کہ اہل طریقت کا خطاب ان لوگوں

کے لئے ہے، جن کی غفلت زائل ہوکر، اللہ تعالیٰ میں مشغول ہوگئے ہوں، اور یہاں خطاب اہل غفلت سے ہے، تاکہ ان کی سرکشی وغفلت دور ہو تو دونوں خطابوں میں ایک ہی مشترک بات ہے کہ اللہ میں مشغول کرنے کی فکر پیدا کرنی ہے۔

تشریح:

یہاں اللہ نے سرکشی کی روش پر ماضی کی یاد دلائی ہے کہ اللہ اس پر قادر ہے کہ تمہیں دوبارہ دریا میں لے جائے اور سزا کے طور پر تمہیں طوفان کے نذر کردے، اللہ کی ہستی سے کفر کی وجہ سے یہ اللہ کا انتباہ ہے۔

ماضی کی یہ یاد، عبرت اور رجوع کے لئے ہے کہ اب بھی وقت ہے، اپنی روش سے باز آجاؤ، جب کہ اہل اللہ کا کہنا یہ ہے کہ جو ایک بار اپنے سارے گناہوں سے مخلصانہ طور پر توبہ کرکے، اللہ کی راہ محبت میں چل رہے ہیں، شیطان ان کو ماضی کی یاد دلا کر مایوس کرنا چاہتا ہے کہ تم نے تو اتنے بڑے گناہ کئے ہیں، اتنے بڑے گناہ کیسے معاف ہو سکتے ہیں، ماضی کے گناہوں کی اس طرح کی یاد سے فرد، راہ محبت سے فرار اختیار کرسکتا ہے، اگر فرار اختیار نہ بھی کرے تو ذکر وفکر میں اس کی یکسوئی تو ضرور متاثر ہوسکتی ہے۔

کفار وفساق کو ماضی کی یاد دلانا ضروری ہے، تاکہ انہیں انتباہ ہو اور ان کے لئے سنبھلنے کی صورت پیدا ہو، بندہ مؤمن جو راہ محبت میں چل رہا ہے، اس کے لئے ماضی کی زیادہ یاد اس لئے نقصاندہ ہے کہ وہ اپنے گناہوں کو بڑا سمجھکر، مایوسی کی راہ پر گامزن ہوسکتا ہے، اس طرح شیطان اسے گناہوں کی دلدل میں مبتلا کرسکتا ہے البتہ منتہی کو اپنے ماضی کے چھوٹے چھوٹے گناہوں پر بھی فکر وتشویش پیدا ہوتی ہے، اور وہ استغفار کرتا رہتا ہے اس سے اس میں مزید عاجزی پیدا ہوتی ہے۔ (مرتب)

وَقُل رَّبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَل لِّي مِن لَّدُنكَ سُلْطَاناً نَّصِيراً. (سورۃ بنی اسرائیل، آیت نمبر ۸۰)

(اور آپ یوں دعا کیجئے کہ اے رب مجھے خوبی کے ساتھ پہنچائیو اور مجھے خوبی کے ساتھ لے جائیو اور مجھے اپنی طرف سے ایسا غلبہ دیجئے جس کے ساتھ نصرت ہو)۔

سالک کو دعا کی حاجت کا ہونا

اسی طرح سالک کو حالات کی تبدیلی میں ہر وقت اس دعا کی حاجت ہے، کیونکہ

اسے معلوم نہیں کہ اس کے لئے کون سی حالت نافع ہے اور کون سی حالت نقصاندہ۔

تشریح:

اللہ سے مانگتے رہنا یہ بندہ مؤمن کا وظیفہ ہونا چاہئے۔ اللہ کے محبّ کو دوران سلوک ومحبت مختلف قسم کے حالات، کیفیات اور مراحل سے گذرنا پڑتا ہے، ان حالات میں اسے پوری طرح معلوم نہیں ہوسکتا کہ اس کے لئے کون سی حالت وکیفیت اور کیا چیز نافع ہے، کیا اس کے لئے قبض کی حالت بہتر ہے یا بسط کی، کیا اس کے لئے معاشی کشادگی کی حالت بہتر ہے یا معاشی طور پر تنگی کی، کیا اس کے لئے حالت صحت بہتر ہے یا حالت بیماری، یہ ساری چیزیں ایسی ہیں، جس کی اصل حکمت سے سالک آشنا نہیں ہوتا، اس لئے اسے ہر وقت سراپا دعاگو ہونا چاہئے کہ یا اللہ جو چیز میرے لئے نافع ہو وہ عطا فرما اور مجھے راہ حق پر استقامت نصیب فرما۔

وَقُلْ جَاء الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقاً. (سورۃ بنی اسرائیل، آیت نمبر ۸۱)

(اور کہہ دیجئے کہ حق آیا اور باطل گیا گذرا ہوا، واقعی باطل تو یوں ہی آتی جاتی رہتی ہے۔)

اخیر جمعہ کا موقعہ تعلیل میں آنا اس پر دلیل ہے کہ یہ آیت ہر قسم کے حق وباطل کے لئے عام ہے، اس میں باطنی نور اور ظلمت بھی شامل ہوگئی تو اللہ کی محبت اور بندوں کی محبت بھی۔

تشریح:

باطل میں خارجی نوعیت کا باطل اور داخلی باطل سب شامل ہے، خارجی باطل بھی دراصل داخلی باطل ہی کا شاخصانہ اور اس کا حصہ اور نتیجہ ہوتا ہے، جب حق پوری قوت سے آتا ہے تو باطل راہ فرار اختیار کرتا ہے، جب نور آتا ہے تو تاریکی چھٹ جاتی ہے، حق وباطل کی یہ کشمکش داخلی وخارجی زندگی میں عام طور پر مسلسل جاری رہتی ہے۔

حق میں نور اور حسن کے اجزا موجود ہوتے ہیں، جب حق پوری قوت سے دل کی گہرائیوں میں موجزن ہوتا ہے تو باطل اور ظلمات کی قوتیں اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتی،

ہماری اجتماعی زندگی میں باطل قوتیں اس لئے مضبوط ہیں کہ حق کی حامل قوتیں بہت ضعیف ہیں، حق کی قوتیں نور، نورانیت اور نورانی کردار سے ہی مستحکم ہوتی ہیں، ہماری اجتماعی اور قومی زندگی سے نورانیت اور نورانی کردار کی حامل قوتوں کی غیر معمولی کمزوری کی وجہ سے باطل قوتوں کو دندناتے پھرنے کا موقعہ مل رہا ہے، ورنہ حق میں وہ قوت موجود ہے کہ اس کے آنے سے باطل بھاگ جاتا ہے، حق کا تعلق نور سے ہے، یہ نور دل کی گہرائیوں میں ابھرتا ہے، جو عبادت ومخلصانہ اطاعت سے دل میں پھوٹتا ہے، جب معاشرے میں نورانیت کے حامل کردار کے افراد کی قابل ذکر ٹیم پیدا ہوگی تو اس کے لازمی نتیجہ میں باطل قوتوں کو راہ فرار اختیار کرنا پڑے گا، اس لئے حق کو غالب کرنے کے لئے سب سے پہلے نورانی کردار کے حامل افراد کی تیاری کی فکر کا ہونا ضروری ہے، لیکن معاشرے کے علاوہ فرد کی اپنی انفرادی زندگی بھی حق وباطل کی شدید کشمکش سے دوچار ہوتی ہے، فرد کی زندگی میں روزانہ یہ کشمکش موجود رہتی ہے۔

اس کشمکش میں حق کے پلڑے کو غالب کرنے کی صورت یہ ہے کہ فرد اپنی شخصیت میں صبغۃ اللہ (اللہ کے رنگ) کو مستحکم کرنے کے لئے امکانی حد تک کوشاں ہو۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ. (سورۃ بنی اسرائیل، آیت نمبر۸۲)

(اور ہم ایسی چیز یعنی قرآن نازل کرتے ہیں کہ وہ ایمان والوں کے حق میں شفا ورحمت ہے)۔

شفا ورحمت کی تشریح

روح میں ہے کہ شفا اشارہ ہے، خلوت کی طرف اور رحمت اشارہ ہے تحلیہ (یعنی عبادات سے مزین ہونے اور اچھے خصائل سے آراستہ ہونے) کی طرف۔

تشریح:

طالب کو روحانی واخلاقی طور پر شفایابی حاصل ہو، اس کے لئے کچھ عرصہ کے لئے توجہ الی اللہ کے ملکہ کو راسخ کرنے کی نیت سے خلوت اختیار کرنی پڑتی ہے، خلوت کے بے شمار فوائد ہیں، اس سے ذہنی اور قلبی یکسوئی حاصل ہوتی ہے، ذکر کا مزاج پیدا ہوتا

ہے، مادہ پرست قوتوں کے حملوں سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے، نفس پرست افرادِ معاشرہ کی طاقتور منفی شعاؤں سے بچاؤ کی سبیل پیدا ہوتی ہے، محبوب حقیقی سے محبت کے ارتقائی مراحل طے ہوتے ہیں، اللہ ورسول کی اطاعت کے عمل میں آسانی پیدا ہوتی ہے، یک رنگی پیدا ہوتی ہے، دوئی ودورنگی دور ہوتی ہے۔

اس لئے اللہ کا حقیقی طالب عرصے تک خلوت میں رہتا ہے، خلوت سے اس کی طبعی مناسبت پیدا ہوجاتی ہے، یہ خلوت اس کے قرب ووصال کی منازل طے کرنے میں غیر معمولی معاون ثابت ہوتے ہیں۔

خلوت کے بعد ہی رحمت کا نزول ہوتا ہے اور اس رحمت کا نتیجہ ذکر وفکر اور عبادت کے ملکہ کے راسخ ہونے اور محبوب کے حسن وجمال سے بہرہ وری کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

طالب جب خلوت کے ذریعہ ذکر وفکر کے غیر معمولی مجاہدوں سے گزرتا ہے اور مسلسل محبوب کے جلالی صفات کے عکسوں سے گذرتا ہے تو بالآخر اسے محبوب کے حسن وجمال کے بھرپور اجزا حاصل ہوتے ہیں، جس سے اس کی زندگی سراپا رونق، خوشی وحلاوت سے سرشار ہوجاتی ہے اور اس کی مسرت بے پناہ ہوتی ہے۔

روحانی طور پر شفایابی کا حاصل ہونا رزائل سے محفوظ ہونا اور محبوب کے حسن وجمال کا مشاہدہ ہونا، دنیا میں اس سے بڑھکر کوئی خوش بختی اور انعام نہیں ہوسکتا، اُدھر لوگ سکون کے لئے مارے مارے پھرتے ہیں، اس کے لئے دولت کے انبار جمع کر لیتے ہیں، نیند کی گولیاں استعمال کرتے ہیں، لیکن سکون ہے کہ جو انہیں نصیب نہیں ہوتا، جب کہ اللہ کا طالب عرصے تک حالت خلوت میں رہنے کے بعد محبوب کے حسن وجمال سے بہرہ ور ہوکر سکون وسکینت اور خوشی کے بے پناہ خزانوں کا مالک بن جاتا ہے اور حقیقی طالبوں میں سکینت کے اجزاء منتقل کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

طالب باطنی نوعیت کے بحران اور دل شکستگی کے حالات سے کیسے نکلے؟

باطنی حالات میں تغیر وتبدل کا مسئلہ طالب کے لئے روز مرہ زندگی کا مسئلہ ہوتا ہے، ان حالات سے عہدہ برآ ہونے اور استقامت کے لئے اس کے لئے واحد سہارا اللہ کی ذات سے مانگتے رہنا ہے کہ وہ اس کے لئے نفس کی ان گھاٹیوں سے بہتر طور پر گذارنے

کی صورت پیدا فرمائے۔

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّیْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ۔ (سورۃ بنی اسرائیل، آیت نمبر ۱۰۰)

(آپ فرمادیجئے کہ اگر تم لوگ میرے رب کی رحمت (یعنی نبوت) کے خزانوں (یعنی کمالات) کے مختار ہوتے تو اس صورت میں تم اس کے خرچ کرنے کے اندیشہ سے ضرور ہاتھ روک لیتے اور آدمی ہے بڑا تنگ دل)۔

راہ سلوک کو چند ملفوظات تک محدود سمجھنے کی روش کا ہونا

اس میں اشارہ ہے، اس شخص کی مذمت کی طرف، جو طریق کو طالبین سے چھپاتے ہیں اور وہ طریقت کی حقیقت ان چند ملفوظات کو سمجھتے ہیں، جو اپنے مشائخ سے سن لئے ہیں، ان کو اللہ جانے کیا سمجھتے ہیں، البتہ کشفی علوم طریقت کا جزو نہیں، ان کو ظاہر نہ کرنا چاہئے۔

تشریح:

راہ طریقت، اللہ کی محبت کے ارتقائی مراحل طے کرنے کی راہ ہے، اس میں نفس کا تزکیہ کرکے، اسے اللہ ورسول کے پوری طرح تابع کرنا ہوتا ہے، اور باطن کی صفائی وپاکیزگی بھی مقصود ہوتی ہے، بزرگوں کے چند ملفوظات یا کشف کو راہ سلوک سمجھنا، تصوف کی حقیقت سے ناآشنائی کا نتیجہ ہے، راہ طریقت یا تصوف دراصل احسان کی وہ حالت ہے، جو حدیث جبریل میں بیان کی گئی ہے کہ اللہ کی اس طرح عبادت کرگویا اللہ کو دیکھ رہے ہو، اگر ایسا نہیں ہوتا تو کم ازکم یہ دھیان تو غالب ہو کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے، تصوف کی اس حقیقت کو لوگوں سے چھپانا صحیح روش نہیں، کشفی علوم تصوف کا حصہ نہیں ہیں، وہ اضافی چیز ہے، جس کی حیثیت حوصلہ افزائی یا انعام سے زیادہ نہیں، تصوف کی اصل حقیقت نفس کا تزکیہ کرنا اور اسے مہذب بنانا ہے، تاکہ اللہ ورسول کی اطاعت میں آسانی ہو۔ (مرتب)

وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ ۔ (سورۃ الکہف، آیت نمبر۲)

(اور ان اہل ایمان کو جو نیک کام کرتے ہیں خوش خبری دے۔)

اللہ کی ہستی کی وجہ سے اپنی ہستی سے بیزاری کا ہونا

یہ وہ اعمال ہیں، جن سے خاص حق تعالیٰ کی رضا مقصود ہو اور بعض نے کہا ہے کہ یہ بیزاری ہے، اپنی ہستی سے اللہ کی ہستی کی وجہ سے۔

تشریح:

راہ سلوک میں چلنے والے طالب کی عرصہ تک یہ حالت ہوتی ہے کہ نفس کو مطیع کرنے کے لئے وہ جوں ہی مجاہدوں سے کام لیتا ہے تو اللہ کی شان جلال کے اثرات کی وجہ سے اس میں اپنی ہستی سے بیزاری پیدا ہونے لگتی ہے، اس لئے کہ اس سے اپنی ساری کوششوں کے باوجود نفس کے اندر موجود گندگی کے ڈھیروں کی صفائی کی صورت پیدا ہونے نہیں پاتی، اگرچہ ذکر کا نور اور صحبت کے اثرات سے اس کے نفس کی صفائی اور تطہیر وتزکیہ کا عمل شروع ہوجاتا ہے، لیکن نفس میں گندگی کے اتنے ڈھیر موجود ہوتے ہیں کہ وہ آہستہ آہستہ ہی نکلتے ہیں، اس سارے عرصہ کے دوران اس پر حب جاہ، حب مال، حرص وہوس، حسد وجلن، اپنی بزرگی کے احساس اور دوسروں کی تحقیر جیسی بُرائیاں پوری شدت سے حملہ آور ہوتی ہیں، ذکر کا نور ان نفسی رزائل (خرابیوں) کو اندر سے نکالتا رہتا ہے، نفس کی اس المناک صورتحال کو دیکھ کر سالک حیرت زدہ بلکہ خوف زدہ ہوجاتا ہے کہ معلوم نہیں، اس کی اصلاح ہوگی بھی یا نہیں، معلوم نہیں، وہ محبوب حقیقی کے ساتھ نفس کے ان رزائل کے ہونے کی حالت میں ملے گا یا تزکیہ کے ساتھ؟ سالک کے یہ احساسات انتہائی قابل رحم ہوتے ہیں، ذکر ومراقبہ کا اس کا دورانیہ جوں جوں بڑھتا رہتا ہے، اگرچہ اس کی اصلاح نفس میں پیش رفت ہی ہوتی ہے، لیکن اللہ کے شان جلال کے عکس کی وجہ سے اس پر اپنی ہستی کے کالعدم ہونے کا احساس غالب ہونے لگتا ہے، بلکہ اپنی ہستی سے احساس بیزاری بڑھنے لگتا ہے، یہ اللہ کی شان عظمت کے غلبہ کے لوازمات میں سے ہے، جب یہ احساس زیادہ غالب ہوتا ہے، یعنی اللہ کی ہستی میں اپنی ہستی کے مٹ جانے کا احساس شدید تر ہوجاتا ہے تو نفس کی فنائیت کا عمل تکمیل پذیر ہونے لگتا ہے، اس طرح طالب کا کام بن جاتا ہے، اس لئے کہ راہ سلوک کے مجاہدوں کا مقصد ہی اپنی ہستی کو اللہ کی ہستی میں مٹانا ہوتا ہے، تاکہ نفس، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے مقابلے میں اپنی اطاعت کے فریب

اور اس کے چنگل سے مکمل طور پر آزاد ہو اور وہ ماسوئ سے مکمل طور پر کٹ کر صرف اسی کا ہوجائے۔

راہ سلوک میں اپنی ہستی کی فنا کا یہ عمل ایسا ہے، جو علم، عقل اور استدلال سے بیاں نہیں ہوسکتا اور راہ سلوک سے باہر کے افراد کے لئے اس کا ادراک بھی محال تر بات ہے، اللہ کی سنت یہ ہے کہ اپنی ہستی کو مٹا کر، اللہ کی ہستی میں فنا کرنے کی یہ سعادت عظمیٰ انہی خوش نصیب افراد ہی کو حاصل ہوتی ہے، جو اللہ کے دوستوں سے صحبت ومحبت کا تعلق قائم کرتے ہیں اور اس تعلق کو مستحکم کرتے ہیں، اور تعلق کے ساتھ ساتھ ان کے دیئے ہوئے ذکر پر محنت کرتے ہیں، اللہ کی اس سنت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے فرد، پوری زندگی علم پر علم حاصل کرنے اور ذہن کو تیز سے تیز تر کرنے میں صرف کردیتا ہے، چونکہ ذہن کی پرواز بہت محدود ہوتی ہے اور عقل، علم معرفت کے نور سے خالی ہوتا ہے، اس لئے اکثر یہ ہوتا ہے کہ اس طرح کے افراد کی اپنی ہستی، اللہ کی ہستی کے بالمقابل ہوتی ہے، اس کی سب سے بڑی علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ قیل قال کے غازی ہوتے ہیں، انہیں اپنے علاوہ سب میں خامیاں ہی خامیاں نظر آتی ہیں، ان کی باتیں ہوا میں تحلیل ہوجاتی ہیں، وہ عمل میں پیچھے ہوتے ہیں، اپنی ہستی کو اللہ کی ہستی کے لئے مٹانے سے انکار کی روش کا انجام یہی ہوتا ہے، (اللہ ہماری حالت زار پر رحم فرمائے) (آمین)

حاشیہ میں صالح اعمال کی بھی نشاندہی کی گئی ہے کہ یہ وہ اعمال ہوتے ہیں، جو خالص اللہ کے لئے ہوں اور جن سے اللہ کی رضا مقصود ہو۔

اس طرح کے صالح اعمال جو اخلاص اور اللہ کی رضامندی کے جذبہ سے سرشار ہوں، ایسے اعمال نفس کو فنائیت کے مراحل سے گذارے بغیر نہیں ہوسکتے، اس لئے کہ نفس کی قوت انسان کے ساتھ اس طرح چپکی ہوئی ہے کہ وہ کسی بھی طرح فرد کا پیچھا چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتی، اللہ کی محبت ومعرفت کی راہ ہی وہ راہ ہے، جس سے اللہ کے جلال سے نفسی قوتیں پگھلنے اور پامال ہونے لگتی ہیں، بڑی مشکلوں کے بعد کہیں جاکر اعمال میں اخلاص پیدا ہوتا ہے اور ہر عمل میں اللہ کی رضامندی کا جذبہ پیش نظر ہوتا ہے۔

اللہ سے مانگتے رہنا، یہ بندہ مؤمن کا وظیفہ ہونا چاہیے، اللہ سے محبت کی راہ میں محبّ کو دوران سلوک مختلف قسم کے حالات، کیفیات اور مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، ان

حالات میں اسے پوری طرح معلوم نہیں ہوسکتا کہ اس کے لئے کون سی حالت وکیفیت اور کیا چیز نافع ہے، کیا اس کے لئے قبض کی حالت بہتر ہے یا بسط کی، کیا اس کے لئے معاشی کشادگی کی حالت بہتر ہے یا معاشی طور پر تنگی کی، کیا اس کے لئے حالت صحت بہتر ہے یا حالت بیماری، یہ ساری چیزیں ایسی ہیں، جس کی اصل حکمت سے سالک آشنا نہیں ہوتا، اس لئے اسے ہر وقت سراپا دعا گو ہونا چاہئے کہ یا اللہ جو چیز میرے لئے نافع ہو، وہ عطا فرما اور مجھے راہ حق پر استقامت نصیب فرما۔

ثُمَّ بَعَثْنَاهُمْ لِنَعْلَمَ أَيُّ الْحِزْبَيْنِ أَحْصَى لِمَا لَبِثُوا أَمَداً. (سورۃ الکھف، آیت نمبر۱۲)

(پھر ہم نے ان کو اٹھایا تاکہ ہم معلوم کریں کہ ان دونوں گروہ میں کونسا گروہ ان کے رہنے کی مدت سے زیادہ واقف تھا۔)

حالت سکر سے حالت صحو کا حاصل ہونا

یہ اشارہ ہے سکر (نیم مدہوشی) کے بعد حالت صحو (حالت صحت) کا اور خلوت (گوشہ نشینی) کے بعد جلوت کا (یعنی لوگوں کے درمیان ہونے کا)۔

تشریح:

اللہ کی محبت کی راہ میں چلتے رہنے کے نتیجے میں ایک وقت آتا ہے، جب سالک پر محبوب کے انوار کے زیر اثر بے خودی کی کیفیت طاری ہوتی ہے، وہ بظاہر دنیا میں رہتا ہے اور ضروری کام بھی سرانجام دیتا ہے، لیکن اس کا دل محبوب میں اٹکا رہتا ہے، وہ محبوب کے بغیر رہ نہیں سکتا، اس کو حالت سکر کہتے ہیں، یہ حالت سکر ہی طالب کو محبوب کی راہ پر تیز رفتاری سے چلنے پر آمادہ کرتی ہے اور اکساتی رہتی ہے اور محبوب کے لئے اس کے سفر کو آسان بنادیتی ہے، حالت سکر میں دنیا کے بارے میں سالک کی حسیں ضعیف ہوجاتی ہیں اور دل دنیا سے سرد ہوجاتا ہے، ایک عرصہ تک حالت سکر میں رہنے کے بعد اسے حالت صحو عطا ہوتی ہے، حالت صحو کا مطلب یہ ہے کہ سالک میں اب محبوب کے ساتھ بقا کی حالت اور اس کی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے، محبوب کے لئے اس کا بے پناہ اضطراب ختم ہوگیا ہے، لوگوں سے میل جول سے بیزاری کی حالت کالعدم ہوگئی ہے۔

خلوت کا لازمی نتیجہ جلوت ہے، یعنی لوگوں کے ساتھ میل جول ورابطہ میں اذیت کا

نہ ہونا اور دل کا محبوب سے غافل نہ ہونا۔

یہ بہت بڑی سعادت ہے، جس سے بڑھ کر دنیا میں دوسری کوئی سعادت ہو نہیں سکتی، یہ سعادت اللہ کے کثرت ذکر کے نتیجہ میں ہی حاصل ہوتی ہے۔ (مرتب)

فَأْوُوا إِلَى الْكَهْفِ يَنشُرْ لَكُمْ رَبُّكُم مِّن رَّحمته وَيُهَيِّئْ لَكُم مِّنْ أَمْرِكُم مِّرْفَقاً. (سورۃ الکہف، آیت نمبر ۱۶)

(تو تم غار میں چل کر پناہ لو، تم پر تمہارا رب اپنی رحمت پھیلا دے گا، اور تمہارے لئے اس کام میں کامیابی کا سامان درست کردے گا)۔

خلوت کے بغیر وصل کا حاصل نہ ہونا

یعنی اپنے محبوب (حقیقی) کے ساتھ خلوت اختیار کرو، اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنی رحمت ومنفعت یعنی معرفت وتجلیات کو ظاہر اور مہیا فرمادے گا، بعض عارفین نے کہا ہے کہ غیر اللہ سے انقطاع اور خلوت اللہ سے وصل کا موجب ہے، بلکہ خلوت کے بغیر وصل نہیں ہوتا۔

تشریح:

تنہائی ہر طالب کے لئے ناگزیر ہوتی ہے، اس کے بغیر نہ تو نفس کی فنائیت کا عمل جاری رہتا ہے اور نہ ہی طالب کو قرار وسکون ملتا ہے، جو طالب، محبوب کے حسن وجمال کے کچھ بھی اجزاء سے آشنا ہو، وہ تنہائی اور گوشہ نشینی کے بغیر رہ نہیں سکتا، گوشہ نشینی اور تنہائی سے مراد یہ ہرگز نہیں ہے کہ فرد معاشرے اور اہل وعیال سے کٹ جائے، بلکہ تنہائی سے مراد یہ ہے کہ عملی زندگی میں رہتے ہوئے شب وروز کا قابل ذکر وقت خلوت کے لئے نکالے اور اس میں اللہ کے ذکر کے ملکہ کو راسخ کرنے کی کوشش کرے، محبوب کے لئے خلوت کا وقت نکالے بغیر وصال کی سعادت عظمیٰ حاصل نہیں ہوسکتی، یہ اٹل حقیقت ہے اور اللہ کی یہ سنت ہے، اہل اللہ اور مقربین کو جو بھی مقام حاصل ہوا ہے، وہ خلوت کے ذریعے ذکر وفکر کی عادت کو مستحکم کرنے کی وجہ سے ہی ملا ہے۔

خلوت سے روح اور دل اللہ کے لئے یکسو ہوجاتے ہیں، ذہن خیالات کے ہجوم سے بڑی حد تک محفوظ ہوجاتا ہے اور انسانی شخصیت طمانیت سے سرشار ہونے لگتی ہے،

خلوت سے طالب، معرفت میں آگے بڑھتا رہتا ہے اور معرفت، اللہ کی تجلیات اور اس کی رحمت کو اپنے ساتھ لاتی ہے، راہ محبت غیر معمولی مجاہدوں کے ذریعہ نفسی قوتوں کو پامال کرکے، اللہ کی معیت میں رہنے کا ذریعہ ہے، جو سالک، اللہ کے ذکر کے لئے اچھا خاصا وقت نہیں نکال سکتا، وہ حقیقی حلاوت سے لذتیاب نہیں ہوسکتا، اس میں اللہ کی تجلیات کو اخذ کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی، خلوت اور محبوب کا وصال ایک دوسرے کا لازم ملزوم ہیں، یعنی خلوت وصال ہی کا موجب بنتی ہے، جو سالک، خلوت کی لذتوں سے بہرہ ور ہیں، ان کے لئے مادی دنیا کی بہتری کے لئے وقت کا زیادہ استعمال کوئی حیثیت نہیں رکھتا، ان کی آرزو صرف اور صرف محبوب ہوتا ہے، وہ محبوب کے لئے تڑپتے رہتے ہیں، اس نکتہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے افراد سکون، خوشی اور حلاوت کو مادی خوشحالی میں تلاش کرتے ہیں، جو سراسر خود فریبی ہے۔ (مرتب)

إِلَى الْكَهْفِ يَنشُرْ لَكُمْ رَبُّكُم مِّن رَّحمته وَيُهَيِّئْ لَكُم مِّنْ أَمْرِكُم مِّرْفَقاً.
(سورۃ الکہف، آیت نمبر ۱۶)

(چل کر پناہ لو، تم پر تمہارا رب اپنی رحمت پھیلائے گا اور تمہارے لئے اس کام میں کامیابی کا سامان درست کرے گا)۔

خلوت کے ثمرات

فرد جب تک اللہ تعالیٰ کے سامنے خلوت وتنہائی اختیار نہ کرے گا، اس وقت تک اسے تعلق مع اللہ حاصل نہیں ہوگا، اس لئے بعض اولیاء کا قول ہے جتنی جلوت بڑھے، اتنی خلوت میں اضافہ ہو۔

تشریح:

خلوت کے نتیجے میں اللہ سے تعلق مستحکم ہوتا ہے، اس کے بغیر کام نہیں بنتا، یعنی خلوت کے بغیر غیر اللہ سے نجات نہیں ملتی، جب تک خلوت کے ذریعہ ذکر کا ملکہ مستحکم نہیں ہوتا، تب تک فرد کا اپنے محبوب حقیقی سے محبت کا رشتہ مستحکم نہیں ہوتا اور زندگی بھر کے معاملات میں اس کی اطاعت مشکل ہے، تنہائی میں اللہ کے ذکر کے استحکام سے ہی فرد کی زندگی میں حقیقی انقلاب برپا ہوتا ہے اور اللہ کی طرف سے اسے ایک نئی زندگی عطا ہوتی ہے۔

لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَاراً وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْباً. (سورۃ الکہف، آیت نمبر ۱۸)

(اور اگر تو ان کو جھانک کر دیکھتا تو ان سے پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑا ہوتا اور تیرے اندر ان کی دہشت سما جاتی۔)

اللہ کی ہیبت کے کچھ اثرات

اس فرار اور رعب کا سبب یہ ہے کہ میں نے ان کو اپنی ربوبیت کے قہر اور سطوت وعظمت کا لباس پہنا رکھا ہے، پس اس ہیبت وعظمت کی وجہ سے یہ فرار اور رعب ہے، جیسا میں نے جب عصا (لاٹھی) پر اپنا لباسِ ہیبت پہنا دیا تو موسیٰ علیہ السلام کو فرار ہوا، یہ درحقیقت ہماری عظمت کا رعب ہے، جو اس آئینہ میں ظاہر ہوئی، یہ مثال ہے اس ہیبت کی جو اہل اللہ کو عطا ہوتی ہے۔

تشریح:

اللہ کی ربوبیت اور عظمت جہاں بھی جلوہ گر ہوتی ہے، وہاں رعب پیدا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، اہل اللہ جو بہت سادہ، درویش اور فقیر منش ہوتے ہیں، چونکہ ان کے دلوں میں اللہ کی شانِ عظمت غالب ہوتی ہے، اس لئے اپنی سادگی اور فقیری کے باوجود دلوں میں ان کا اتنا رعب قائم ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑا آدمی بھی ان کے رعب کے زیر اثر رہتا ہے، یہ رعب دراصل اللہ کی عظمت کا ہوتا ہے، جو اللہ والوں کے دلوں میں موجود ہوتی ہے۔

یہاں جس غار کی ہیبت کا ذکر کیا گیا ہے، یہ ہیبت دراصل غار میں موجود اصحاب کہف (جو اہل اللہ تھے) ان کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ (مرتب)

وَلَا تَقُولَنَّ لِشَيْءٍ إِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَداً. (سورۃ الکہف، آیت نمبر ۲۳)

(آپ کسی کام کی نسبت یوں نہ کہا کیجئے کہ میں اس کو کل کروں گا۔)

تجرید وتفرید کا اشارہ

اس میں ارشاد ہے خالص تجرید وتفرید (توحید خالص) کا۔

تشریح:

تجرید وتفرید کا مطلب اللہ کا ہوجانا، اللہ کے سامنے فنا ہوجانا، خود سپردگی اختیار کرنا، اللہ کے علاوہ سب سے بے نیاز ہوجانا ہے۔

یہ مقام ایسا ہے، جو بڑی مشکل سے حاصل ہوتا ہے، لیکن اس کے بغیر بندہ مؤمن کا کام بھی نہیں بنتا، اللہ کے ہوجانے کے لئے کچھ عرصہ کے لئے دنیا واہل دنیا سے بے نیاز ہوجانا ضروری ہے، اللہ کی مدد ونصرت، اللہ پر کامل یقین اسی سے ہی وابستہ ہے۔ (مرتب)

وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا. (سورۃ الکہف، آیت نمبر ۲۸)

(اور دنیوی زندگی کی رونق کے خیال سے آپ کی آنکھیں ان سے ہٹنے نہ پائیں)

مالداروں سے میل جول کی مذمت

اس میں مذمت ہے مالداروں سے میل جول رکھنے کی اور ان سے تواضع کی، جس کا سبب ان کی مالداری ہو۔

تشریح:

مالداروں کی بڑی اکثریت مال کی کثرت کی وجہ سے اللہ اور اس کے ذکر سے حالت پردہ میں رہتی ہے، وہ طاقتور منفی شعاؤں کی حامل ہوتی ہے، ان کے دل کو ظلمات نے گھیراؤ کیا ہوا ہوتا ہے، اس طرح کے مالداروں سے تعلقات کے اثرات سالک پر اس طرح پڑنے لگتے ہیں کہ اس کا دل بھی مال کی کروٹیں لینا شروع کردیتا ہے، وہ مال کی کشش محسوس کرنے لگتا ہے اور رفتہ رفتہ اس سے ذکر کا نور مدھم ہونے لگتا ہے، مالدار سے مال کی وجہ سے تعلقات رکھنا اور مال کی وجہ سے اس کی تواضع کرنا، یہ سالک کے لئے بڑے خطرے کی بات ہے، اس سے سالک حجابات کا شکار ہونے لگتا ہے، اگر منتہی سالک بھی اس معاملہ میں احتیاط کا دامن چھوڑ دے گا تو وہ خود مالدار کے ظلمات کے زیر اثر بزرگی کے پردے میں دنیاداری کی راہ پر گامزن ہوجائے گا اور ایک ایسا وقت آئے گا کہ اس سے اس کا ادراک بھی سلب ہوجائے گا اور وہ مالداری کی اس راہ کو بزرگی کے منافی تصور کرنے کی بجائے اسے بزرگی کا حصہ تصور کرنے لگے گا۔

قرآن کی آیت کے الفاظ اور حکیم الامت کی یہ تشریح ہمارے لئے آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے، سخت محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔

بعض مالداروں کو شیطان یہ نکتہ القا کرتا ہے کہ وہ اگر رشوت، بددیانتی، سود اور لوٹ مار سے مال کماتے ہیں تو کوئی ہرج نہیں، اس کی تلافی کی صورت یہ ہے کہ کسی بزرگ سے تعلق قائم رکھ کر، اس کی دعاؤں کا سہارا لیا جائے اور اس مال میں سے کچھ حصہ تبرک یا ہدیہ کے طور پر بزرگ کو دیدیا جائے، مالدار کو تو شیطان یہ پٹی پڑھاتا ہے اور بزرگ کو وہ یہ نکتہ سجھاتا ہے کہ مال کی وجہ سے اس کی بزرگی ہرگز متاثر نہ ہوگی، اس لئے کہ اب وہ معرفت کے سارے مراحل طے کرچکا ہے، اس سے اس کی بزرگی کو مزید فروغ ملے گا، چنانچہ اس طرح کے متعدد بزرگ جو شروع میں بہت بہتر حالت میں تھے، انہیں دنیاداروں کی راہ پر گامزن ہوتے ہوئے دیکھا ہے، جس کے اثرات یہ ظاہر ہوئے کہ ان کا پورا حلقۂ اثر روحانیت کے حقیقی ثمرات سے دورتر ہوتا گیا، بظاہر تو دینی رنگ موجود ہے، لیکن کردار میں نورانیت نہ ندارد (اللہ تعالیٰ اس سلسلہ میں ہماری حفاظت فرمائے)۔ (آمین)

وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَن ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا. (سورۃ الکہف، آیت نمبر ۲۸)

(اور ایسے شخص کا کہنا نہ مانئے جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے اور وہ اپنی خواہشات پر چلتا ہے اور اس کا حال حد سے گزر گیا ہے۔

حجاب میں رہنے والے غافلوں کی مذمت

اس میں حالت حجاب میں رہنے والے غافلین کی اطاعت سے منع کیا گیا ہے، اس اطاعت میں ان سے تواضع کرنا بھی شامل ہے، کیونکہ وہ عملاً اس کا طالب ہوتا ہے، اگرچہ بظاہر اس کا اظہار نہ کرتا ہو۔

تشریح:

یہ آیت قلبی ذکر کے سلسلہ میں تو بالکل واضح ہے، ساتھ ساتھ ایسے افراد، جن کا دل اللہ کے ذکر سے غافل ہے، ان کی اطاعت اور ان سے دوستی کا تعلق قائم رکھنے سے بھی منع کیا گیا ہے، ایسے لوگوں سے تواضع سے پیش آنا بھی نقصان دہ ہے، اس لئے کہ وہ عملاً

اس کے طالب ہوتے ہیں، آیت بتارہی ہے کہ اللہ کے ذکر سے قلب کی ناآشنائی اپنے ساتھ خواہشات نفس کو لاتی ہے اور ایسے افراد خواہشات ہی کے پیروکار ہوتے ہیں، ایسے افراد کی باتوں کو اہمیت دینا، ان کی تجاویز ومشوروں کو غور وفکر کے قابل سمجھنا خطرے سے خالی نہیں، اس لئے کہ اللہ کے ذکر سے محرومی کے نتیجہ میں وہ باطنی طور پر شدید ظلمات کے زیراثر ہوتے ہیں، ان کی گفتگو علمی وعقلی اعتبار سے کتنی ہی اہم کیوں نہ ہو، لیکن وہ ظلمات کے اثرات سے خالی نہیں ہوتی، اس لئے ذکر کے غافلوں سے تعلقات قائم رکھنا ہی نقصان دہ ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ فرد جب اس طرح کے افراد کی باتوں کو اہمیت دینے لگتا ہے تو وہ ان سے مزید قریب ہونے لگتا ہے، چنانچہ اس نے ذکر پر محنت کرکے، جو نور حاصل کیا ہوتا ہے، وہ نور مدھم ہونے لگتا ہے، اس لئے کہ نفسی قوتوں کے حامل افراد میں طاقتور منفی شعائیں موجود ہوتی ہیں، یہ منفی شعائیں اس کے ذکر کے نور کو مدھم کرنے کا باعث بنتی ہیں، اس لئے اللہ کی محبت میں چلنے والوں کو اس راہ میں مزاحم ہونے والے محرکات واسباب کو سمجھ کر ان سے بچنے کے لئے کوشاں ہونا ضروری ہے، ورنہ ذکر کی راہ سلب ہونے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔

اس آیت میں سب سے اہم نکتہ جو بیان ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ دل کی اللہ کے ذکر سے غفلت اور ناآشنائی کی وجہ سے نفسی قوتیں دل کا گھیراؤ کرلیتی ہیں اور دل کو خواہشات نفس کا مرکز بنالیتی ہیں، ایسا فرد جس کا دل اللہ کے ذکر سے محرومی کی وجہ سے حالت حجاب میں ہو، اس کا علم، اس کی ذہنی صلاحیتیں اس کے مادی مشاہدے کی استعداد وغیرہ سب لاحاصل ثابت ہوتی ہیں، اس لئے کہ یہ ساری معلومات دوسروں کو سنانے اور متاثر کرنے کے لئے ہوتی ہیں، چونکہ ذکر سے محرومی کی وجہ سے اس کا دل شدید حجابات سے دوچار ہے، اس لئے یہ علم وذہانت اس کے تزکیہ اور باطنی اصلاح کے سلسلہ میں معاون ومددگار ثابت نہیں ہوتی، بلکہ علم واستدلال اور ذہانت عام طور پر اس میں حجاب کو مستحکم کرنے کا ذریعہ ثابت ہوتے ہیں، نفس اس کو یہ نکتہ سجھاتا ہے کہ قلبی ذکر یا معرفت کی باتیں یہ سب صوفیاء کی گھڑی ہوئی چیزیں ہیں، اسلام میں تو اصل اہمیت علم اور استدلال کی ہے، اس اغوائے نفسانی کی وجہ سے اس طرح کے افراد کے لئے اکثر ذکر اور معرفت کی راہ مسدود

کردی جاتی ہے، حالانکہ علم کو تو اللہ کی شان عظمت کے غلبے، اس کی خشیت اور اللہ کے ذکر پر محنت کا ذریعہ ہونا چاہئے، لیکن قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ محجوب (حالت حجاب میں رہنے والے) اور غافلینِ ذکر پر نفس کا شیطان مسلط ہوجاتا ہے، اس سے بچاؤ کی صورت ذکر ہی ہے اور کوئی صورت نہیں، ایسے لوگوں کے ساتھ ایک المیہ یہ ہوتا ہے کہ وہ عام طور پر اللہ کے ذکر کو حقیر سمجھنے لگتے ہیں اور اسے صوفیاء کا اختراع قرار دیتے ہیں، ان کی نظر میں خدمت دین اور وعظ ونصیحت کرنا یا غلبہ دین کا کام کرنا یہی اصل ذکر ہے، اس مغالطے کی وجہ سے وہ اپنی علمی صلاحیتوں سے کام لے کر اخلاص و بےنفسی سے دین کی حقیقی خدمت سے بھی محروم رہتے ہیں، ذکر سے محرومی تو ان میں پہلے سے موجود ہوتی ہے، اہل علم واہل دانش کی اس صورتحال پر کرب کا اظہار اور دعا ہی کی جاسکتی ہے۔

اذ نادیٰ ربه ندآء خفیا (سورۃ مریم، آیت نمبر۳)

(جبکہ انہوں نے اپنے پروردگار کو پوشیدہ طور پر پکارا)

ذکر خفی کا افضل ہونا

اسمیں ذکر خفی کا فی نفسہ حقیقۃ افضل ہونا معلوم ہوتا ہے، اگرچہ کسی سبب سے جہری ذکر کو ترجیح ہوجائے۔

تشریح:

ذکر خفی جسے قلبی ذکر، اس آیت کی تشریح کی رو سے ذکر جہر سے افضل معلوم ہوتا ہے، اگرچہ جہری ذکر کی اہمیت وافادیت موجود ہے کہ اس کے اثرات دیر یا سویر دل کی گہرائیوں تک پہنچنے لگتے ہیں، لیکن ذکر خفی کی اہمیت کئی اعتبار سے زیادہ ہے، ایک تو قلبی ذکر سے ذہن اور دل میں ذکر کا استحضار جلد ہونے لگتا ہے، اور رفتہ رفتہ ذہن اور دل کی ساری قوتیں ذکر میں مصروف ہونے لگتی ہیں، جس سے شخصیت میں فیصلہ کن تبدیلی واقع ہونے لگتی ہے اور دل کے اخذ ذکر کی صلاحیت میں غیر معمولی اضافہ ہونے لگتا ہے۔

دوسرے یہ کہ دل کی غذا ہی اللہ کا ذکر ہے، جب دل کو اس کی اصل غذا ملنے لگتی ہے تو رفتہ رفتہ دل کا آئینہ صاف ہونے لگتا ہے، اس کے زنگ مٹنے لگتے ہیں، جس سے دل محبوب کے حسن وجمال کے مشاہدہ کا آئینہ بن جاتا ہے، اس آئینہ میں فرد جب چاہے

اندر میں غوطہ زن ہوکر، محبوب کے انوارحسن سے فیضیاب ہوتا رہتا ہے، جس سے اس کے دل پر دولت، دنیا اور مادی حسن کے ہونے والے تھوڑے بہت اثرات کالعدم ہونے لگتے ہیں اور محبوب حقیقی کا مشاہدہ ہی اس کا مقصود بن جاتا ہے۔

تیسرے یہ کہ دل، نفسی قوتوں کی گرفت سے آزاد ہوجاتا ہے اور اعمال صالحہ سے اس کی طبعی مناسب پیدا ہونے لگتی ہے، جس کی وجہ سے وہ قرب کے مقامات میں ترقی کرتا رہتا ہے، نیز وہ نفساتی احساسات اور فکری مغالطے جس میں عام طور پر افرادِ معاشرہ مبتلا ہوتے ہیں، اللہ کا طالب ان سارے احساسات سے بڑی حد تک بلند ہونے لگتا ہے۔

قلبی ذکر کے فوائد وثمرات کے موضوع پر ہم نے ان حواشی میں متعدد مقامات پر گفتگو کی ہے، مزید تفصیل وہاں دیکھ لی جائے۔

قَالَ سَلَامٌ عَلَيْکَ سَأَسْتَغْفِرُ لَکَ رَبِّیْ إِنَّهُ کَانَ بِیْ حَفِیّاً. (سورۃ مریم، آیت نمبر۴۷)

(اور ابراہیم نے کہا میرا سلام لو اب میں تمہارے لئے اپنے رب سے مغفرت کی درخواست کروں گا بیشک وہ مجھ پر بہت مہربان ہے)۔

بُرے سلوک کے جواب میں اچھا سلوک کرنا

جب کوئی آپ سے بُرا سلوک کرے تو آپ اس سے اچھا برتاؤ کریں، تاکہ اس کو اپنی غلطی کا احساس ہو اور وہ آئندہ برے سلوک سے باز رہے، کیونکہ اگر آپ نے اندھیرا ختم کرنا ہے تو روشنی درکار ہوگی۔

تشریح:

اندھیرا ختم کرنے کے لئے روشنی کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، حسن اخلاق، معافی، نرمی، بردباری اور برے سلوک کے جواب میں بہتر سلوک، بلکہ مزید احسان کرنا، یہ روشنی کے مترادف ہے، اس روشنی کے نتیجے میں تاریکی دور ہوگی، بدسلوکی کے جواب میں بہتر سلوک سے اخلاقی طور پر جو اثر پڑتا ہے، وہ یہ ہے کہ مخالف کا دل نرم ہوجاتا ہے، وہ اس حسنِ اخلاق سے متاثر ہوکر، صاحب اخلاق کے سامنے ڈھیر ہوجاتا ہے، اس لئے وعظ ونصیحت کی ہزار باتوں سے زیادہ مؤثر چیز حسن اخلاق اور پاکیزہ کردار ہے، اس پاکیزہ کردار کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ نفس اور نفسی قوتیں ہیں، نفس اپنی بڑائی چاہتا ہے،

وہ اپنی شان میں گستاخی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں، اس کا علاج یہی ہے کہ نفس کو ذکر وفکر کے مجاہدوں کی بھٹی سے گذارا جائے۔ (مرتب)

وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهِ. (سورۃ مریم، آیت نمبر ۶۵)

(اور اس کی عبادت پر قائم رہ)۔

مجاہدوں کے بغیر سلوک کا طے نہ ہونا

منازل سلوک میں سالک کو مجاہدات کرتے ہوئے جو تکلیف آتی ہے، ان پر صبر سے کام لینا چاہئے، کیونکہ مجاہدات کے بغیر سلوک طے نہیں ہوتا، اگر کسی مصلحت کی بنا پر فوائد رک جائیں تو دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیے، بلکہ استقامت کے ساتھ شیخ کے مشورے پر چلتے رہنا چاہئے۔

تشریح:

سلوک کی منازل طے کرنا، یعنی نفس کو امارہ سے لوامہ اور لوامہ سے مطمئنہ تک پہنچانے کے لئے مجاہدے ناگزیر ہیں، مجاہدوں کے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہیں، ان مجاہدوں سے طالب پر اللہ کی جلالی صفات کے جو عکس گرتے ہیں، وہ نفس پر بہت زیادہ شاق گزرتے ہیں، ویسے بھی نفس کی ساخت ہی ایسی ہے کہ وہ مجاہدوں کے لئے آسانی سے تیار نہیں ہوتا، اس کے لئے جبر کر کے بھی نفس کو اس راہ پر چلانا پڑتا ہے، اس کے لئے ہمت وحوصلہ اور صبر کی ضرورت ہوتی ہے، اس راہ میں طالب کے لئے سب سے زیادہ جو چیز کارآمد ہوتی ہے، وہ روحانی استاد کی صحبت ہوتی ہے، صحبت سے اس راہ میں پیش آنے والے مدوجزر سے گزرنے کا حوصلہ حاصل ہوتا ہے اور استقامت بھی نصیب ہوتی ہے، دوران سلوک اگر کیفیات وحالات کا ورود رک جائے تو شیخ کی حوصلہ افزائی سے طالب کی دل برداشتگی کی حالت ختم ہوجاتی ہے۔ (مرتب)

وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي. (سورۃ طٰہٰ، آیت نمبر ۱۴)

(اور میری یاد (ذکر) کے لئے نماز پڑھا کرو)۔

ظاہری اعمال کا باطنی حالات کا عکاس ہونا

فرد کے ظاہری اعمال اس کی باطنی کیفیات کی عکاسی کرتے ہیں، مثال کے طور پر جس یقین واستحضار اور حضور قلبی سے کوئی نماز ادا کرے گا، اتنا ہی اس کی نماز میں خشوع

وخضوع اور ظاہر میں سکون ہوگا۔

تشریح:

ایمان کی طاقتور باطنی حالت اور اللہ کے ساتھ اخلاص کی باطنی کیفیت ایسی چیز ہے، جس سے اعمال میں وزن پیدا ہوتا ہے، باطن میں جس طرح کے جذبات واحساسات غالب ہوں گے، اسی طرح کے اعمال ظاہر ہوں گے، اگر باطن اللہ کے کثرت ذکر اور اس کی محبت سے خالی ہے یا اس میں اللہ کی محبت برائے نام ہے تو اس طرح کی باطنی حالت سے اعمال میں جان، قوت اور نماز میں خشوع وخضوع پیدا نہیں ہوسکے گا، اس آیت سے معلوم ہوا کہ ذکر دین کے مقاصد میں شامل ہے، نماز بھی ذکر ہی ہے، لیکن نماز ذکر کی قلیل خوراک ہے، یہ نماز حقیقی نماز اس وقت بنے گی، جب ذکر پر محنت ہوگی، یہ وہ اہم نکتہ ہے، جسے سمجھنا ضروری ہے، ظاہری اعمال دراصل باطنی حالات کے عکاس ہوتے ہیں، اس دور میں علم پر تو زور ہے، بڑی بڑی درسگاہیں قائم ہیں، لیکن باطن کی درستگی اسے اللہ کی محبت سے سرشار کرنے اور اللہ کے ذکر کے ملکہ کو راسخ کرنے کی طرف توجہ نہ ہونے کے برابر ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ قوم میں دینی، اخلاقی وایمانی اعتبار سے بے حسی کی فضا غالب ہے۔ (مرتب)

اذْهَبْ أَنتَ وَأَخُوكَ بِآيَاتِي وَلَا تَنِيَا فِي ذِكْرِي. (سورۃ طٰہٰ، آیت نمبر ۴۲)

(حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا جارہا ہے کہ، تم اور تمہارے بھائی میری آیتیں لے کر فرعون کے پاس جاؤ لیکن میرے ذکر میں سستی نہ کرنا)۔

تعلیم وتربیت میں برکت کے لئے ذکر کے اہتمام کا ضروری ہونا

اگر کوئی تعلیم دینے والا یہ چاہتا ہے کہ اس کی تعلیم وتعلم میں برکت اور عمل کا شوق پیدا ہو تو اسے چاہئے کہ اپنے آپ کو ذکر الٰہی کا عادی بنائے۔

تشریح:

حقیقی معلم ومربی کو ذکر کا وافر ذخیرہ چاہئے، ذکر پر جتنی زیادہ محنت ہوگی، معلم کی تعلیم میں اتنا زیادہ اثر ہوگا، اور اسی قدر طالب کے باطن میں ہلچل برپا ہوگی، مربی جو کامل طور پر سلوک طے کر چکا ہے، اسے بھی روزانہ کے ذکر کے معمول کو جاری رکھنا ناگزیر

ہے، ورنہ ذکر کی عدم تازگی کی وجہ سے تربیت کے حوالے سے اس کی باتیں بھی پوری طرح کارگر اور مفید ثابت نہ ہوں گی، دوسروں کی اصلاح کی فکرمندی ومصروفیات میں روزانہ کے ذکر میں ناغہ ہوگا تو مربی کی کیفیات اور اس کے حالات میں تغیر پیدا ہونا شروع ہوگا، اس لئے تعلیم وتربیت کے لئے اللہ کے ذکر کا معمول ہونا ناگزیر ہے، اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر نبی ورسول کو فرعون کے پاس بھیجتے ہوئے یہی تلقین فرماتے ہیں، جس سے ذکر کی فیصلہ کن اور غیر معمولی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ ذکر الٰہی کا بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ سے تعلق میں تازگی قائم رہتی ہے، جو اپنے ساتھ اللہ کی مدد ونصرت کو لاتی ہے، دعوت اور اللہ کی طرف بلانے کا کام کتنا ہی اہم سہی، لیکن اگر اس کام میں اللہ کا کثرت ذکر شامل نہ ہوگا تو یہ کام خیر وبرکت سے خالی ہوگا اور فرد کی اپنی زندگی میں نورانیت اور رونق پیدا نہ ہوسکے گی۔ (مرتب)

قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهِ. (سورۃ طٰہٰ، آیت نمبر ۹۶)

(اس نے کہا کہ مجھ کو ایسی چیز نظر آتی تھی جو دوسروں کو نظر نہ آتی تھی)۔

پوشیدہ صلاحیتوں کا ظاہر ہونا، بزرگی کی علامت نہیں

پوشیدہ اشیاء کا ظاہر ہوجانا اور عجیب وغریب مشاہدات کا اولیاء اللہ ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ بعض اوقات فاسق وفاجر حتیٰ کہ کفار کو بھی یہ صورت پیش آسکتی ہے، اس لئے اس سے متاثر نہ ہونا چاہئے۔

تشریح:

جس طرح مادی دنیا میں تلاش وتحقیق اور جدوجہد سے نئی نئی مادی چیزیں تخلیق ہوتی ہیں، اور کائنات کے اسرار ورموز کھلتے رہتے ہیں، اسی طرح نفسیاتی اور روحانی دنیا میں مختلف قسم کے مجاہدوں سے فرد پر مختلف اقسام کی پوشیدہ باتیں آشکار ہوتی ہیں، یہ باتیں کفار اور فساق کو بھی حاصل ہیں، فرعون نے جن جادوگروں کی خدمات حاصل کیں، انہوں نے نظروں کو ہپناٹائیز کرکے رسیوں کو سانپ کی صورت میں ظاہر کیا، جس سے سارے دیکھنے والے حیرت زدہ ہوگئے، اس طرح کی چیزوں کی حیثیت طلسمات سے زیادہ نہیں ہوتی، البتہ اللہ کی محبت اور حقیقی روحانی دنیا میں داخل ہونے کے بعد اہل اللہ کو جو مشاہدے

ہوتے ہیں، ان کی حیثیت انعام کی سی ہوتی ہے۔ (مرتب)

قَالَ يَا آدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَى. (سورۃ طٰہٰ، آیت نمبر ۱۲۰)

(کہنے لگا کہ اے آدم کیا میں تمہیں ہیشگی کا درخت نہ بتادوں اور ایسی بادشاہی جس میں کبھی ضعف نہ آئے)۔

طالب کے لئے غیر ضروری باتوں وکاموں سے بچنے کے لئے کوشاں ہونا

مرید کو جو سبق دیا جائے، وہ اسی میں لگے، غیر ضروری چیزوں کی طرف دھیان نہ دے، کیونکہ اس سے اس کو نقصان ہوگا اور اسے مقام وغیرہ شیخ کی رہنمائی کے بغیر حاصل نہ ہوگا۔

تشریح:

طالب کا کام یہ ہے کہ شیخ کی طرف سے اسے اللہ کا جو ذکر دیا جائے، اس پر وہ خوب محنت کرے، ذکر پر محنت کے نتیجہ میں اسے جو انعامات حاصل ہوں گے، وہ ایسے انعامات ہیں، جس کے مقابلہ میں ساری دنیا کی نعمتیں ہیچ ہیں، طالب کے لئے غیر ضروری کاموں میں لگنا سخت نقصان دہ ہے، غیر ضروری گفتگو، دوسروں کے معاملات میں الجھنا، معاشی خوشحالی کی جدوجہد اور اس کی فکرمندی، یہ ساری چیزیں ایسی ہیں، جو طالب کے لئے حجاب کی حیثیت رکھتی ہیں، شیخ کی صحبت اور مجاہدوں سے ہی اسے بالآخر وہ مقام حاصل ہوگا، جہاں وہ انسانی جوہروں سے بہرہ ور ہوگا۔ شیخ، طالب کے لئے وہی چیزیں تجویز کرتا ہے، جو اس کے لئے دنیا وآخرت میں جملہ بھلائیوں کی حامل ہوتی ہیں، طالب ان چیزوں میں پوشیدہ حکمت ومصلحت نہ سمجھنے کی وجہ سے عام طور پر ان کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا، جس کی وجہ سے وہ راہ سلوک میں یا تو سست رفتاری سے چلتا ہے یا فرار اختیار کرتا ہے۔ (مرتب)

وَنَبْلُوكُم بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ. (سورۃ الانبیاء، آیت نمبر ۳۵)

(اور ہم تم کو بُری حالتوں سے بھی اچھی طرح آزماتے ہیں)۔

قبض سے خیر کا برآمد ہونا

اس میں ہر ناگوار اور مرغوب چیز آگئی تو اس میں قبض بھی داخل ہوگیا، پس آیت

اس بات کی دلیل ہے کہ قبض میں حکمتیں اور اسرار موجود ہوتے ہیں اور اس سے اہل سلوک تسلی لیتے ہیں اور (دوسروں کو) تسلی دیتے ہیں۔

تشریح:

قبض (بے چینی) اس لئے ہوتا ہے، تاکہ طالب، راہ سلوک کے مراحل میں ارتقا حاصل کرتا رہے، اس لئے کہ قبض (اضطراب) اپنے ساتھ بسط (خوشی) بھی لاتا ہے، قبض کی ہر حالت کے بعد بسط کا ورود ہوتا ہے، سالک کا سارا سفر قبض وبسط کے انہی حالات سے وابستہ ہے، اگر طالب قبض کے انگاروں سے گزرنے کے لئے تیار نہیں تو اس کے لئے سلوک میں چلنا ممکن نہیں، یہ قبض وبسط (یعنی بے چینی وخوشی) کے حالات ہی ہیں، جو طالب کے نفس کی سرکشی کے زور کو توڑ کر، اس کے لئے محبوب سے وصال کا ذریعہ بنتے ہیں، اس لئے قبض سے پریشان ہرگز ہرگز نہ ہونا چاہئے، طالب کو یہ نکتہ ذہن نشین کرنا چاہئے کہ سلوک کے یہ دشوار گزار لمحات جلد ہی گزر جائیں گے، اس کے بعد اسے ایسی نئی زندگی ملے گی، جس پر سو جانیں بھی قربان کی جاسکتی ہیں قبض میں جو حکمتیں پوشیدہ ہیں، انہیں منتہی صوفی ہی سمجھتا ہے، اس لئے وہ طالبوں کو ہر طرح کی تسلی دیتا ہے کہ قبض سے گھبرانے کی ضرورت نہیں، محبوب نے اپنے قرب کے مقامات یا وصال کی دولت عظمیٰ طویل عرصہ تک قبض کے حالات سے گزرنے سے ہی وابستہ کی ہے، متوسط صوفی چونکہ بہت تیز رفتاری سے چلتا ہے، روزانہ کے وقت کا بیشتر حصہ وہ ذکر وفکر میں گذارتا ہے، اس لئے اسے قبض کے زیادہ حالات سے گزارنا پڑتا ہے، جس طرح ہمالیہ پہاڑ طے کرنے والے کو آگے کے مراحل زیادہ دشوار لگتے ہیں اور اسے ساری طاقت صرف کر کے چلنا پڑتا ہے، یہی حالت طالب کو یہاں بھی درپیش ہوتی ہے۔ (مرتب)

وَمِنَ الشَّيَاطِيْنِ مَن يَغُوصُونَ لَهُ. (سورۃ الانبیاء، آیت نمبر ۸۲)

(اور بعضے بعضے شیطان (جن) ایسے تھے جو سلیمان کے لئے دریاؤں میں غوطے لگاتے تھے)۔

تقویٰ کے نتیجہ میں جن وانس میں رعب کا پیدا ہوجانا

جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرا اور اس نے تقویٰ اختیار کیا، اس سے جن وانس سب

ڈرتے ہیں۔

تشریح:

اللہ سے تقویٰ اختیار کرنے کے نتیجہ میں بندہ مؤمن کو اللہ کی معیت حاصل ہوتی ہے، اللہ کی یہ معیت جن وانس کے دلوں میں صاحب تقویٰ فرد کے بارے میں ایک قسم کا رعب پیدا کردیتی ہے، اگرچہ بظاہر یہ محسوس نہ ہوتا ہو، لیکن عملاً ایسا ہی ہوتا ہے، اس رعب کی وجہ سے وہ اسے نقصان پہنچانے سے پہلے سو بار سوچتے ہیں، یہ رعب اللہ کی طرف سے ان کی دلوں میں ڈال دیا جاتا ہے، اس لئے جس تقویٰ کے نتیجے میں اہل دنیا سے بے خوفی پیدا ہوتی ہو، اور آخرت میں نجات کی امید تو ایسی تقویٰ کے حصول کے لئے اگر ساری جسمانی توانائیاں بھی خرچ ہوں تو سستا سودا ہے۔ (مرتب)

الَّذِيْنَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ . (سورۃ الحج، آیت نمبر ۴۱)

(یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دیدیں تو یہ نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور نیک کام کرنے کا کہیں اور بُرے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام تو اللہ کے اختیار میں ہے)۔

ذکر واعمال صالحہ میں مداومت سے دوسروں کی تربیت کے مقام پر فائز ہونا

جو اعمال صالحہ پر مداومت اختیار کرتے ہیں اور ذکر الٰہی میں مصروف رہتے ہیں، جس بنا پر ان میں ٹھہراؤ پیدا ہوجاتا ہے، اور پھر یہ لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بنتے ہیں اور گمراہی سے بچاتے ہیں۔

تشریح:

ذکر الٰہی پر مداومت کے نتیجہ میں اعمال صالحہ کی استعداد پیدا ہوتی ہے اور اعمال صالحہ مزاج کا حصہ بننے لگتے ہیں، ایک عرصہ تک ایسا کرتے رہنے کے نتیجے میں ایک وقت ایسا آتا ہے کہ طالب کے مزاج میں نشیب وفراز اور زیر وزبر ہونے کی حالت ختم ہوجاتی ہے اور اس کے مزاج میں ٹھہراؤ پیدا ہوجاتا ہے، وہ ہر طرح کے حالات میں حق پر گامزن رہتا ہے، اسے اللہ کے ساتھ بقا کی حالت نصیب ہوتی ہے، اس مقام پر رسائی کے بعد وہ

دوسروں کی اصلاح اور ان کے تزکیہ وتربیت کا ذریعہ بنتا ہے، لیکن اس مقام تک رسائی آسان کام نہیں، اس کے لئے روحانی وجسمانی دونوں طرح کے مجاہدوں سے کام لینا پڑتا ہے، جسم کی ساری توانائیوں کا آخری حدتک استعمال کرنا پڑتا ہے، جب محبوب دیکھتا ہے کہ میرے محبّ نے میرے لئے اپنے ساری توانائیاں خرچ کر ڈالی ہیں اور وہ ذہنی واعصابی طور پر نڈھال ہوگیا ہے۔ میرے وصال کے لئے زندگی کی آخری سانس تک مجاہدوں کے حوصلہ سے سرشار ہے تو اس وقت محبوب اپنے فضل خاص سے طالب کو مجاہدوں کی بھٹی سے نکال کر دوسروں کی تربیت کے مقام پر فائز کرتا ہے۔ (مرتب)

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُورِ. (سورۃ الحج، آیت نمبر۴۶)

(بات یہ ہے کہ (نہ سمجھنے والوں کی) آنکھیں اندھی نہیں ہوتی، بلکہ دل جو سینے میں ہوتے ہیں وہ اندھے ہوتے ہیں)۔

دل کی آنکھوں کی بینائی کے بغیر فرد کا ہلاکت سے دوچار ہونا

کفر اور برے کاموں میں ہلاکت اسی کو نظر آئے گی، جس کی دل کی آنکھیں زندہ (بیدار) ہوں۔

تشریح:

دل کی آنکھوں کی بینائی کے بغیر فرد اندھیرے میں رہنے لگتا ہے، اسے نفس کی خرابیاں مثلاً حب جاہ وحب مال اور حرص وہوس کے بت نظر نہیں آتے، اس کی پوری زندگی نفس کے بت کدے کے سامنے سجدہ ریزی میں صرف ہونے لگتی ہے، اس کی ظاہری دینداری عام طور پر اسے حرص وہوس اور حسد وجلن وغیرہ سے بچانے میں کامیاب نہیں ہوتی، دل کی تاریکی کی صورت میں برائی بھی اچھائی کی صورت میں نظر آنے لگتی ہیں، اہل علم واہل عقل، سلف وخلف کی تردید وتکذیب کے کام کو دینی خدمت کا کام سمجھنے لگتے ہیں، مسلم معاشروں میں ہر دور میں پیدا ہونے والے لگ بھگ سارے فتنے دل کی آنکھوں کی عدم بیداری کی وجہ سے ہی پیدا ہوتے رہے ہیں، دل کی یہ آنکھیں محض علم، ذہانت اور معلومات واستدلال سے بیدار نہیں ہوتی، بلکہ اس کے لئے صاحبانِ دل کی صحبت کی

ضرورت لاحق ہوتی ہے، تاکہ ان کی صحبت کی برکت اور ذکر کے ماحول کی وجہ سے دل کی آنکھوں کی بیداری کی راہ میں حائل رکاوٹیں دور ہوں اور حالات وواقعات صحیح صورت میں نظر آنے لگیں۔ (مرتب)

فَيَنسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِی الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ آيَاتِهِ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ. (سورۃ الحج، آیت نمبر۵۲)

(اللہ تعالیٰ شیطان کے ڈالے ہوئے شبہات کو نیست نابود کردیتا ہے پھر اللہ تعالیٰ اپنی آیات کو زیادہ مضبوط کرتا ہے، اللہ تعالیٰ خوب علم والا اور خوب حکمت والا ہے)۔

وسوسوں کا خود بخود مضمحل ہوجانا

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کی عادت جاری ہے کہ وساوس شیطانی خود بخود مضمحل ہوجاتے ہیں، اس کے لئے مستقل تدبیر کرنے کی ضرورت نہیں اور بعینہٖ یہی قول ہے محققین اہل تربیت کا۔

تشریح:

راہ سلوک وراہ محبت میں چلتے رہنے کے نتیجے میں ایک تو شیطان کی طرف سے وسوسے آنے لگتے ہیں، دوسرے باطن کی گہرائیوں میں موجود سارا گند نکلنے لگتا ہے، جس سے شروع میں وسوسوں کا زور ہونے لگتا ہے اور لاشعور سے نکلنے والی زندگی بھر کی واردات وواقعات اور اعمال کی ادلی بدلی صورتیں سامنے آنے لگتی ہیں، جس سے طالب عرصے تک وسوسوں کا شکار رہتا ہے، ذکر وفکر کے ذریعہ ہونے والے وسوسے شیطانی ہوں یا نفس کی طرف سے، ان کا مستقل علاج اس راہ پر گامزن ہونا ہے، اس سے یہ وسوسے بتدریج کم سے کم تر ہوتے چلے جاتے ہیں اور ذہنی وقلبی سکون کی ایسی نعمت عظمیٰ عطا ہونے لگتی ہے، جس کے مقابلہ میں دنیا کی ساری نعمتیں ہیچ ہیں۔ (مرتب)

وَاِن جَادَلُوکَ فَقُلِ اللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ. (سورۃ الحج، آیت نمبر۶۸)

(اور اگر یہ لوگ آپ سے جھگڑا نکالتے رہیں تو آپ (اخیر بات یہ) یہ فرمادیجئے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب جانتا ہے)۔

صوفیاء کا مخالفین سے تکرار نہ کرنے کا عمل

صوفیاء کا جوطرز ہے کہ کسی مخالف سے لڑانہیں کرتے، اس آیت میں اس کی اصل ہے۔

تشریح:

صوفیائے کرام اللہ کی محبت کی جس حلاوت سے آشنا ہیں، اس کی وجہ سے وہ اپنے مخالفین سے تکرار کرنے کی بجائے ان کی اصلاح کے لئے دعا گو رہتے ہیں، تکرار وجدال ان کے مزاج کے منافی ہیں، ان کی خواہش وآرزو ہوتی ہے کہ اللہ کی محبت سے ناآشنا افراد راہ محبت میں داخل ہوں، تاکہ وہ دنیاداری اور جھگڑے والی حالت اورفضا سے بلند ہوکر حقیقی مقصدی زندگی گزارنے کے اہل ہوسکیں اور وہ اللہ کی دوسری مخلوق کے لئے کارآمد ہوسکیں اور ان کے لئے اللہ کے سامنے جواب دہی کی سرمشاری سے بچنے کی صورت پیدا ہوسکے۔

رواداری، محبت، نرمی، تحمل وبردباری کے حامل اور مخالفت کے جواب میں احسان جیسی صفات کے حامل اہل اللہ ہی ہوتے ہیں اور یہ صفات انہی کی صحبت کی برکت سے ہی حاصل ہوسکتی ہیں۔ (مرتب)

وَقُلْ رَّبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ وَأَعُوذُ بِكَ رَبِّ أَن يَحْضُرُونِ. (سورۃ المومنون، آیت نمبر۹۷۔۹۸)

(اور آپ یوں دعا کیا کیجئے کہ اے میرے رب میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں، شیطانوں کے وسوسوں سے اور میرے رب آپ کی پناہ اس بات سے کہ شیطان میرے پاس آئیں)۔

راہ سلوک میں وسوسوں سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں

جو طریقت کا تمام سلوک طے کرتے ہوئے انتہا کو پہنچ چکا ہے، وہ بھی وساوس کا شکار ہوجاتا ہے، تو جس نے ابھی چلنا شروع کیا ہے، وہ کیسے گمان کرسکتا ہے کہ وہ وسوسوں سے محفوظ ہو، لہٰذا وسوسوں سے پریشان ہونے کی بجائے شیخ کے مشورے سے اسے دور کرنے کی کوشش کرتا رہے۔

تشریح:

وسوسہ ایسی چیز ہے، جو بشریت کا تقاضا ہیں، اہل اللہ جو سلوک کی تکمیل کرچکے ہوتے ہیں، وسوسے تو انہیں بھی لاحق ہوتے ہیں، لیکن ان کے وسوسے معمولی نوعیت کے ہوتے ہیں اور وہ جلد ہی قابو میں آجاتے ہیں، جب اہل اللہ بھی وسوسوں کا شکار ہوتے ہیں تو متبدی ومتوسط طالبوں کا وسوسوں سے بچنا کیسے ممکن ہے، اس لئے وسوسے کتنے ہی آجائیں، ان سے بہت زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ یہ وسوسے علامت ہیں، اس بات کی کہ ذکر نے اپنا کام شروع کردیا ہے اور طالب کے اندر میں موجود گندگی کی صفائی کا عمل جاری ہے، جب تک دل کی پاکیزگی وصفائی نہ ہوگی، اس وقت تک دل کی گہرائیوں میں اللہ کے انوار داخل نہ ہوسکیں گے، طالب اگر اس نکتہ کا استحضار کرے تو وسوسوں سے شدید تشویش میں مبتلا نہ ہوگا، بلکہ ان وسوسوں کو وہ ایک اعتبار سے راہ سلوک میں آگے بڑھنے کا ذریعہ سمجھے گا، لیکن یہ بڑے المیہ کی بات ہے کہ اکثر طالب وسوسوں کے ہجوم سے پریشان ہوکر، جلد ہی اللہ کی محبت سے راہ فرار اختیار کرنے لگتے ہیں۔ (مرتب)

فَلَا أَنسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَاءَلُونَ . (سورۃ المومنون، آیت نمبر۱۰۱)

(پھر جب قیامت میں صور پھونکا جائے گا تو ان میں جو باہمی رشتے ناتے تھے اس روز وہ نہ رہیں گے)۔

اہل اللہ سے تعلق استوار کرنا ناگزیر ہے

ہر مسلمان کو کسی نہ کسی متبع سنت بزرگ کے ساتھ تعلق رکھنا چاہئے، کیونکہ اس سے دنیا وآخرت میں برکات حاصل ہوں گی اور بہت نفع ہے۔

تشریح:

کسی اہل اللہ سے وابستگی ضروری ہے، اس سے اعمال صالحہ میں آسانی پیدا ہوگی، قول وعمل میں تضاد سے حفاظت حاصل ہوگی، تزکیہ کا عمل جاری ہوگا، اخلاص وللھیت پیدا ہوگی، مزاج میں ٹھہراؤ پیدا ہوگا، خود اعتمادی حاصل ہوگی، قلبی وذہنی سکون کی نعمت حاصل ہوگی، اللہ پر توکل ویقین میں پختگی پیدا ہوگی، ذکر کا ملکہ راسخ ہونے میں مدد ملے گی، مادیت پرستی کے ماحول کے اثرات سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوگی، عقلیت پرستی کے نتیجے

میں وجود میں آنے والے نظریات یا اسلام کی عقلیتِ محض پر مشتمل نئے ایڈیشن کے علمبرداروں سے متاثر ومرعوب ہونے کی فضا ختم ہوگی، اہل اللہ کی صحبت سے ذکر کی جو نعمت ملتی ہے، وہ دنیا وآخرت میں جملہ سعادتوں کا ذریعہ ہے۔ (مرتب)

قُل لِّلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ ذَٰلِكَ أَزْكَىٰ لَهُمْ. (سورۃ النور، آیت نمبر ۳۰)

(آپ مسلمان مردوں سے کہدیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے لئے زیادہ صفائی کی بات ہے)۔

سلوک کی تعلیم کا عظیم باب

چونکہ ذالک میں غض بصر (نگاہوں کو نیچے رکھنا) بھی داخل ہے، کیونکہ بدنگاہی زنا کی ابتدائی علامتوں میں سے ہے، پس اس میں ناپسندیدہ افعال کی طرف جانے والی چیزوں کی روک تھام ہے، یہ تعلیم سلوک کا عظیم باب ہے۔

تشریح:

ہر ایسی چیز جو فرد کو گناہوں سے قریب کردے، وہ ممنوع ہے، نگاہوں کی حفاظت کا اہتمام نہ کرنا اور عورتوں سے خلط ملط ہونا، ان کے ساتھ مل کر دفتر وکاروبار میں کام کرنا اور ان سے زیادہ گفتگو کے شوق کا ہونا، یہ ساری چیزیں ایسی ہیں، جو زنا کی طرف لے جانے والی ہیں، اس لئے زنا کا راستہ بند کرنے کے لئے اس طرح کی ساری چیزوں کی ممانعت ہے۔

گناہوں کا راستہ بند کرنا، یہ تعلیم سلوک کے لئے بنیاد فراہم کرتی ہے، اس لئے راہ سلوک میں زیادہ گفتگو کرنا، زیادہ میل جول رکھنا، دولت اور دنیا میں زیادہ وقت صرف کرنا، راہ محبت وراہ سلوک کے مخالف افراد سے تعلقات رکھنا، یہ ساری چیزیں ایسی ہیں، جو فرد کو راہ سلوک سے دور لے جاسکتی ہیں، اس لئے سلوک میں اس طرح کی ساری چیزیں ممنوع ہیں، البتہ منتہی کے لئے زیادہ بولنا اور زیادہ ملنا نقصاندہ نہیں ہے۔ (مرتب)

وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ. (سورۃ النور، آیت نمبر ۳۱)

(اور اپنی زینت کو ظاہر نہ ہونے دیں مگر اپنے شوہروں سے)

اسرار کو نا اہلوں سے پوشیدہ رکھنا

اس کی نظیر ہے کہ زینت اسرار کو اس کے نامحرم (یعنی نااہل) سے پوشیدہ رکھنا چاہے۔

تشریح:

راہ سلوک وراہ محبت میں طالب کو محبوب حقیقی کی طرف سے انعامات سے نوازا جاتا ہے، بہترین کیفیات، خواب اور کشف کے ذریعہ وسیع دنیا کا سیر وسفر، ارواح سے ملاقاتیں، واقعات کا قبل از وقت انکشاف، وغیرہ اس طرح کی بہت ساری چیزیں بعض طالبوں کو حاصل ہوتی رہتی ہیں، انہیں راہ سلوک کے اسرار زینت کہا جاسکتا ہے، طالب کے لئے ضروری ہے کہ وہ محبوب کے ان اسرار کو نااہلوں کے سامنے ظاہر نہ ہونے دے، اس لئے کہ ایک تو محبوب کے اسرار کو فاش کرنے سے محبوب ناراض ہوسکتا ہے، دوسرے یہ کہ نااہل اس طرح کے حالات کو مذاق کا ذریعہ بنا سکتے ہیں، سوم یہ کہ اس سے دعویٰ اور ناز پیدا ہوسکتا ہے، اس طرح معاشرے میں اہل تصوف کی حیثیت متاثر ہوگی۔

طالب اس طرح کے حالات وواقعات اپنے شیخ کے سامنے بیان کرسکتا ہے، تاکہ شیخ کی طرف سے اس کی صحیح توجیہ ہوسکے اور وہ طالب کو ان حالات کی نوعیت سے آگاہ کرسکے۔ (مرتب)

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ يَخَافُونَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ. (سورۃ النور، آیت نمبر ۳۷)

(جن کو اللہ کے ذکر سے اور نماز پڑھنے سے اور زکوۃ دینے سے خرید وفروخت غفلت میں مبتلا نہیں کرتی، وہ اس دن سے ڈرتے رہتے ہیں، جن میں بہت سے دل اور بہت سی آنکھیں الٹ جائیں گی)۔

خرید وفروخت سے ذکر سے غافل نہ ہونا

یہ آیت اصل ہے یادداشت اور خلوت در انجمن کی، یعنی ہر وقت اللہ کی طرف متوجہ ہونے اور محفل میں بھی خلوت جیسی حالت کی ہے۔

تشریح:

ذکر کا ملکہ جب راسخ ہونے لگتا ہے تو دل وذہن پر توجہ الی اللہ کے اثرات غالب ہونا شروع ہوجاتے ہیں، کاروبار اور خرید وفروخت کے باوجود غفلت نہیں ہوتی، اور محفل میں بھی خلوت کی حالت موجود رہتی ہے۔ ذکر وفکر کے مجاہدوں کا یہ ایسا ثمرہ ہے، جو سالک پر اللہ کا بہت بڑا انعام ہے، ایسا انعام، جس کی قدر وقیمت سالک ہی جانتا ہے، اس طرح دین کے ہر کام میں آسانی پیدا ہوتی ہے، ہر بُرائی سے بچنے کی توفیق اور سعادت عطا ہوتی ہے۔ (مرتب)

فَإِن تَوَلَّوا فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُم مَّا حُمِّلْتُمْ وَإِن تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا. (سورۃ النور، آیت نمبر۵۴)

(پھر اگر تم روگردانی کروگے تو سمجھ رکھو کہ رسول کے ذمہ وہی ہے، جس کا ان پر بار رکھا گیا ہے، اور تمہارے ذمہ وہی ہے، جس کا تم پر بار رکھا گیا ہے اور اگر تم نے ان کی اطاعت کرلی تو راہ پر جالگو گے اور رسول کے ذمہ صرف صاف طور پر پہنچا دینا ہے)۔

دوری اختیار کرنے والے طالب کے درپے پڑنا مناسب نہیں

اس میں دلالت ہے کہ جو شخص خود اعراض کرے (یعنی شیخ سے دوری اختیار کرے) اس کے درپے ہونا مناسب نہیں، اس کا کام صرف تبلیغ کردینا ہے۔

تشریح:

اللہ کی راہ محبت کی دنیا میں جبر نہیں ہوتا، یہ راہ حقیقی طلب کی بنا پر فضل خاص کے طور پر عطا ہوتی ہے، جو فرد وقتی جذبہ کے زیر اثر راہ سلوک میں آئے اور پھر دوری اختیارے تو ایسے فرد کو اس کی حالت پر رہنے دیا جائے، اس کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں ہے، اہل اللہ بے نیاز ہوتے ہیں، ان کو کسی کے آنے جانے سے نہ زیادہ خوشی ہوتی ہے نہ زیادہ رنج، اس لئے وہ اعراض کرنے والوں کے پیچھے نہیں پڑتے، البتہ ان کی یہ دلی آرزو ہوتی ہے کہ اللہ کے بندے راہ معرفت اختیار کریں، تاکہ انہیں زندگی کا حقیقی لطف وحلاوت حاصل ہوسکے اور زندگی کے مسائل ومصائب کے سلسلہ میں ان کے احساسات میں پاکیزگی وبہتری پیدا ہوسکے، اور آخرت میں بھی ان کے لئے آسانی ہو، جب ان کی

اس آرزو کے باوجود افراد ان سے دوری کی روش اختیار کرتے ہیں تو وہ رنجیدہ ہوجاتے ہیں، لیکن ان کی رنجیدگی کا احساس حمیت دین کا نتیجہ ہوتا ہے۔ (مرتب)

وَإِن تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا. (سورۃ النور آیت نمبر۵۴)

(اور اگر تم نے اس کی اطاعت کرلیے تو راہ پر جالگو گے)۔

متبع سنت شخصیت پر دنیا وآخرت کے حقائق کا کھل جانا

جو کوئی متبع سنت ہوگا اس پر دنیا وآخرت کی تمام حقیقتیں ظاہر ہوجائیں گی، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ دنیا کو بے وقت سمجھ کر، آخرت کی تیاری کرے گا۔

یہ حاشیہ کا مفہوم ہے جو حضرت حافظ عبدالرحیم مدظلہ نے پیش فرمایا ہے حکیم الامت لکھتے ہیں کہ روح میں ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ رسول ﷺ کی اطاعت سے حقائق کا انکشاف ہوتا ہے، جو ہدایت کا حاصل ہے۔

تشریح:

اللہ ورسول کی مخلصانہ اطاعت کے نتیجہ میں دل کے دروازے واہوتے ہیں اور دل میں طاقتور شعائیں پیدا ہوتی ہیں، جس سے بندہ مومن پر دنیا وآخرت کی حقیقتیں واضح ہوتی ہیں، دنیا سے مرعوبیت ختم ہوجاتی ہے، مادی دنیا کی قابل ذکر حیثیت باقی نہیں رہتی، فرد پر آخرت کی زندگی کا نظارہ غالب رہنے لگتا ہے، اس لئے وہ اس مختصر زندگی میں آخرت کی تیاری میں مصروف ہوجاتا ہے، نیز اسلامی شریعت پر عمل پیرا ہونا، اس کا وظیفہ حیات بن جاتا ہے، بے نفسی وللھیت اس کے مزاج کا حصہ بن جاتی ہے۔ جب دل پر دنیا کی کل حیثیت اور آخرت کی حقیقت واضح ہوجاتی ہے تو فرد اللہ کی ذات سے کامل طور پر یکسو ہوجاتا ہے اور وہ غیر سے پوری طرح منقطع ہوجاتا ہے، ہر وہ کام جس سے اس کا اللہ سے تعلق متاثر ہوتا ہو، وہ اس کام سے دوری اختیار کرلیتا ہے۔ (مرتب)

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ. (سورۃ النور، آیت نمبر۵۵)

(تم میں سے جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو دی تھی)۔

خلافت دنیوی اور خلافت باطنی

یہی حال ہے خلافت باطنی کا، یعنی منصب ارشاد ملک القلوب کا(یعنی دلوں کی بادشاہی کے منصب پر فائز افراد کا) وہ ایمان کامل اور عمل کامل سے عطا ہوتی ہے۔

تشریح:

نیک اعمال کے نتیجے میں دنیا میں حکومت عطا فرمانے کا وعدہ ہے، لیکن یہ وعدہ ان مسلمانوں سے ہے، جن کا قابل ذکر حصہ (یعنی افراد ریاست کا قابل ذکر حصہ) ایمان وعمل صالحہ کا حامل ہو، اسلامی زندگی کا نمونہ ہو، جن پر توحید اور آخرت کا رنگ غالب ہو، اللہ ورسول کی اطاعت جن کا مقصد زندگی ہو۔

اس آیت سے دوسرا نکتہ جو حکیم الامت نے بیان فرمایا ہے،وہ یہ ہے دلوں کی بادشاہی کے منصب یعنی خلافت باطنی پر فائز افراد کے ساتھ بھی اللہ کا معاملہ یہی ہوتا ہے کہ انہیں ایمان کامل اور عمل کامل کی سعادت عطا ہوتی ہے۔

باطنی خلافت کے نتیجہ میں بھی ایک حکومت عطا ہوتی ہے، یہ حکومت نفسی قوتوں پر غلبہ اور ایمان واعمال صالحہ کے ملکہ کے راسخ ہونے کی صورت میں حاصل ہوتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ باطنی خلافت کا حاصل ہونا نعمت، بلکہ ساری نعمتوں پر بھاری نعمت ہے، ایسا فرد قلبی اعتبار سے گویا (روحانی) بادشاہت کے منصب پر فائز ہوتا ہے، خلافت جو اتنی بڑی نعمت ہے، وہ آسانی سے حاصل نہیں ہوتی، اس کے لئے برسوں کے مجاہدوں کے ذریعہ نفسی قوتوں پر ملکوتی قوتوں کو غالب کرنا پڑتا ہے۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ موجودہ دور میں عام طور پر ملنے والی خلافتیں قلبی بادشاہیت ہرگز عطا نہیں کرتی، اس لئے کہ اس کے لئے ذکر وفکر کے غیر معمولی مجاہدوں کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ (مرتب)

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلَى أَمْرٍ جَامِعٍ لَمْ يَذْهَبُوا حَتَّى يَسْتَأْذِنُوهُ. (سورۃ النور، آیت نمبر ٦٢)

(بس مسلمان تو وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں اور جب رسول کے پاس ایسے کام کے لئے جمع ہوتے ہیں، جس کے لئے مجمع جمع کیا گیا ہے تو

جب تک آپ سے اجازت نہ لیں، نہیں جاتے)۔

سالک کو مستقل کام کی ضرورت نہیں

روح میں ہے کہ اس میں (یہ بھی) اشارہ ہے کہ مرید کو مستقل کام نہ کرنا چاہئے۔

تشریح:

صحابہ کرام، رسول اللہ ﷺ کی صحبت کو فیصلہ کن اہمیت دیتے تھے، اور ان کے دل کی دھڑکیں آپ کے لئے ساتھ دھڑکتی تھیں کہ ضروری کام سے فارغ ہوں تو آپ کی صحبت میں جائیں، یا کہیں آپ ﷺ کا بلاوانہ آجائے، یہی معاملہ اللہ کے محبت کے حقیقی طالب کا اپنے شیخ کے ساتھ ہوتا ہے کہ شیخ کی صحبت کے لئے اس کا دل بے چین ہوتا ہے اور شیخ کے دیئے ہوئے سبق پر وہ خوب محنت کرتا ہے، اس طرح وہ تزکیہ اور نفس مطمئنہ کے مراحل سے گزرتا ہے، اور اللہ کی محبت کی راہ پر گامزن ہوتا ہے۔

مرید کو مستقل کام نہ کرنا چاہئے کا مطلب یہ ہے کہ سچا طالب ذکر وفکر، تزکیہ وتربیت کے کام کو اولین ترجیح دیتا ہے، اس کام کے مقابلے میں اس کے دوسرے کام ثانوی حیثیت رکھتے ہیں، جب سالک کی نظروں میں اللہ کی محبت، تزکیہ نفس اور آخرت کی تیاری کے لئے اتنی قدر اور فکرمندی پیدا ہوجاتی ہے تو اس کی جملہ ضروریات کے لئے اللہ کافی ثابت ہوتا ہے۔

حدیث شریف ہے کہ جو شخص ایک ہی فکر (یعنی اللہ کی محبت وعبادت واطاعت کی) فکر کو غالب کرتا ہے، تو اللہ تعالی اس کی جملہ ضروریات کے لئے کافی ثابت ہوتا ہے، جو ایسا نہیں کرتا یعنی جو دنیا کی زندگی کو اہداف میں شامل کرتا ہے، اللہ کو پرواہ نہیں ہے کہ وہ کس وادی میں بھٹکتا پھرتا ہے۔

صحابہ کرام نے اسی ایک فکر کو اپنے اوپر غالب کیا تھا اور اللہ کے رسول اور ان کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا، جہادی سرگرمیوں میں فنائیت کی وجہ سے اللہ نے انہیں ایسا نوازا کہ وہ دنیا بھر میں اسلام کے فروغ کا ذریعہ بھی بنے تو اللہ نے انہیں رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ کی بشارت بھی سنائی۔

سچا طالب جب تک اصلاح نفس، تزکیہ نفس اور اخلاص وللھیت پیدا کرنے کے کام

کو اولین ترجیح دے کر، اپنے آپ کو شیخ کے سپرد نہیں کرتا، تب تک اس کے لئے نفس اور مادی دنیا کی گرفت سے بچنا محال ہے۔

یہ وہ نکتہ ہے، جو بدقسمتی سے اس دور میں راہ سلوک سے وابستہ طلبہ سے نظر انداز ہوا ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ سالکوں کی اصلاح نہیں ہو پاتی، جب اصلاح نہیں ہو پاتی تو معاشرہ فساد سے دوچار ہونے لگتا ہے۔

شیخ اپنی حکمت ومشاہدے سے اس نکتے کو سمجھتا ہے اور سالکوں کو بھی یہ نکتہ سمجھانے کے لئے کوشاں رہتا ہے کہ وہ مادی دنیا کے سحر وفریب سے بلند ہوکر، راہ محبت میں داخل ہوں، جب وہ ایسا کریں گے تو اللہ کی مدد ونصرت کی حیرت انگیز صورتیں اس کے ساتھ پیش آتی رہیں گی، حدیث شریف کے مطابق جو اللہ کا ہوجاتا ہے، اللہ اس کا ہوجاتا ہے۔

بدقسمتی سے موجودہ دور میں مادی زنجیروں نے افراد کو اس طرح قابو کر لیا ہے کہ ان کا سب سے زیادہ اور قیمتی وقت اور بیشتر توانائیاں مادی نوعیت کی سرگرمیوں میں خرچ ہوتی ہیں۔ (مرتب)

فَأْذَن لِّمَن شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللَّهَ. (سورۃ النور، آیت نمبر ۶۲)

(تو جب یہ لوگ کسی کام کے سلسلہ میں آپ سے اجازت طلب کریں تو ان میں سے آپ جس کے لئے چاہیں، اجازت دے دیا کریں اور آپ ان کے لئے مغفرت کی دعا کیا کیجئے)۔

شیخ کی صحبت سے دوری کا نقصان سے خالی نہ ہونا

اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ شیخ کی صحبت سے دور ہونا، اگرچہ اجازت سے ہو، نقصان سے کسی قدر خالی نہیں۔

تشریح:

اصلاح نفس کے سلسلہ میں شیخ کی صحبت ناگزیر ہے، اس کے بغیر اخلاق وکردار اور سیرت میں پاکیزگی پیدا ہونا مشکل ہوتی ہے، شیخ کی صحبت سے دوری کے نتیجے میں حاصل ہونے والی پاکیزہ کیفیات کی منتقلی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے، شیخ کی چاہت تو یہی ہوتی ہے کہ طالب، دنیا کے خرخشوں سے یکسو ہوکر، اس کے ساتھ وابستہ ہو، اور اس کی صحبت

میں رہے، تاکہ اس کی فنائیت کا سفر جلد سے جلد طے ہو اور وہ کام کا فرد بن سکے، لیکن شیخ، افراد کی مجبوریوں کو دیکھکر، انہیں اجازت دے دیتا ہے، اگرچہ اس طرح کی اجازت سے طالب کی فنائیت کا سفر متاثر ہوتا ہے اور یہ اجازت طالب کے لئے کسی قدر نقصاندہ ہوتی ہے، لیکن طالب میں اگر اللہ کے لئے قربانیوں کا مادہ موجود ہے تو وہ دور رہ کر بھی شیخ سے ایک حد تک استفادہ کرسکتا ہے، تاہم شیخ کی صحبت سے اسے جو استفادہ ہوسکتا ہے، وہ کسی دوسری صورت میں ممکن نہیں، اس لئے شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ ایک شعر میں طالب کو تاکید کرتے ہیں کہ وہ اپنی جھوپڑی شیخ کی جھوپڑی کے ساتھ بنا کر زندگی گزارے۔ (مرتب)

لَوْلَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونَ مَعَهُ نَذِيراً. (سورۃ الفرقان، آیت نمبر ۷)

(اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں بھیجا گیا کہ وہ اس کے ساتھ رہ کر ڈراتا)۔

راہ سلوک میں کشف وکرامات کی توقع رکھنا خطرات سے خالی نہیں

جو شخص طریقت میں اس لئے قدم رکھتا ہے، تاکہ اسے کچھ کیفیات حاصل ہوں، جوکہ اپنے اختیار میں قطعاً نہیں ہوتی، تو گویا وہ یہ خبر دے رہا ہے کہ میں نے جو وظائف واعمال کئے ہیں، مجھے ان کا صلہ ملنا چاہیے اور اس سب کی بڑی وجہ تکبر ہوتا ہے۔ حکیم الامت کے اپنے الفاظ اس طرح ہیں، اس میں اس شخص کا رد ہے جو کمال کا معیار کرامات کو قرار دیتا ہے۔

تشریح:

راہ سلوک، اخلاص اور اللہ کی محبت میں ارتقاء کے حصول اور اعمال میں استقامت کی راہ ہے، راہ سلوک کو کشف وکرامات، تصرفات اور لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے کا ذریعہ بنانا، نہ صرف غلط ہے، بلکہ عتاب کا ذریعہ ہے، اس طرح کی آرزو دراصل بڑے پن اور تکبر کا نتیجہ ہوتی ہے، صحیح فہم اور سخت احتیاط کی ضرورت ہے، آج کل بدقسمتی سے تصوف وسلوک کو کشف وکرامات اور کیفیات ہی کا ذریعہ سمجھا گیا ہے۔ (مرتب)

كَذَٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلاً. (سورۃ الفرقان، آیت نمبر ۳۲)

(قرآن کو بیک وقت نہ اتارنے کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرمایا جارہا ہے)

(اس طرح اس لئے ہے تاکہ ہم اس کے ذریعہ سے آپ کے دل کو قوی رکھیں اور ہم نے

اس کو ٹھہرا ٹھہرا کر اتارا ہے)۔

راہ سلوک میں آہستہ آہستہ استقامت کا حاصل ہونا

جس طرح دنیا کے تمام کاموں کو اگر درجہ بدرجہ ترتیب کے ساتھ سلیقہ سے کیا جائے تو اس کے ثمرات ومنافع حاصل ہوں گے، بعینہ سلوک میں بھی سالک کو جو مقامات حاصل ہوتے ہیں، آہستہ آہستہ ان میں ثبات واستقلال ہوتا ہے، اس لئے تاخیر ہونے سے پریشان نہ ہونا چاہیے۔

تشریح:

راہ سلوک حوصلہ اور استقامت سے چلتے رہنے کی راہ ہے۔ طالب اگر یہ چاہے کہ اس کی ایمانی کیفیات جلد ہی مستحکم ہوجائیں، اس کے لئے نفس پر قابو پانا آسان ہوجائے، اسے وسوسوں پر جلد ہی قابو حاصل ہوجائے، یہ آرزو صحیح نہیں، ہرفن میں مہارت کے حصول کے لئے اللہ کی یہ سنت ہے کہ وہ بتدریج حاصل ہوتا ہے، اس کے لئے عرصے تک محنت ومجاہدوں سے کام لینا پڑتا ہے، راہ محبت میں بھی اللہ کا یہی قانون جاری وساری ہے۔ جو چیز مشقتوں سے ملتی ہے، وہ مستقلاً قائم رہتی ہے، آسانی سے حاصل ہونے والی چیز کی قدر نہیں ہوتی، پھر وہ جلد ہی رخصت بھی ہوجاتی ہے۔ (مرتب)

أَلَمْ تَرَ إِلَىٰ رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ. (سورۃ الفرقان، آیت نمبر ۴۶)

(کیا آپ نے پروردگار کی اس قدرت پر کہ سایہ کو کیونکر (دور تک پھیلایا ہے)۔

سالک کو وصل کے آثار کا دکھائی دینا

جب سالک، طریقت میں چلتے چلتے واصل بننے لگتا ہے تو اس کو وصل کے آثار دکھائی دینے لگتے ہیں، جس پر وہ خود کو مجاہدہ وذکر میں اور زیادہ مشغول کرتا ہے۔

تشریح:

متوسط صوفی جب تیز رفتاری سے راہ سلوک میں چلتا ہے، شب وروز اس پر اللہ سے وصال کی فکر غالب رہتی ہے، اس کا دل، دنیا اور اہل دنیا سے بیزار ہوجاتا ہے، ذکر، اہل ذکر اور صحبت اہل اللہ اس کی غذا بن جاتی ہے، محبوب سے فراق کا غم اسے

حددرجہ بے چین کردیتا ہے، برسوں تک محبوب کے ذکر میں چلتے رہنا، اس کا معمول بن جاتا ہے، اس معاملہ میں وہ گرتا ہے، پھر اٹھتا ہے، اس طرح وہ تھکنے کا نام ہی نہیں لیتا تو ایک وقت وہ آتا ہے، جب اسے محبوب سے وصل اور قربت کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔ (مرتب)

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ أَرَادَ أَن يَذَّكَّرَ أَوْ أَرَادَ شُكُورًا. (سورۃ الفرقان، آیت نمبر ۶۲)

(اور وہ ایسا ہے جس نے رات دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے والے بنائے، اس شخص کے لئے جو سمجھنا چاہے یا شکر کرنا چاہے)۔

قبض وبسط کے حالات میں حکمت کا ہونا

راہ سلوک میں سالک پر قبض وبسط (یعنی بے چینی وخوشی) کے جو مختلف حالات پیش آتے رہتے ہیں، ان میں بھی حکمت ہے کہ جب حالت قبض ہوتی تو اسے آہ وزاری کا موقعہ ملے گا، اور جب قبض کی صورت ختم ہوجائے گی تو شکر کا جذبہ موجزن ہوگا۔

تشریح:

جس طرح دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن کا سلسلہ جاری ہے، یا سردی اور سردی کے بعد گرمی یا بیماری اور بیماری کے بعد صحت کا سلسلہ ہے، اسی طرح راہ سلوک وراہ محبت میں خوشی اور اس کے بعد غم جسے اصطلاح میں قبض وبسط کہتے ہیں، طالب کو قبض وبسط کے ان حالات سے گزرے بغیر چارہ کار نہیں۔ اللہ نے راہ محبت کے ارتقا کے سفر کو خوشی وغم کے عجیب وغریب حالات وکیفیات سے وابستہ کیا ہے، جو فرد راہ سلوک کے اس ارتقائی سفر سے ایک حد تک نہیں گذرا، اس کے لئے زندگی کے حقیقی حسن اور محبوب کے فراق کے غم کی ناآشنائی سوہان روح ہے، اللہ کی طرف سے ایک ہی بار ملی ہوئی قیمتی زندگی کو اللہ کی محبت اور قبض وبسط کے عظیم الشان احساسات کے بغیر گذارنا، اس پر وائے افسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔

راہ سلوک کے سفر میں قبض (بے چینی) اور بسط (خوشی ولذت) کے احساسات کو فیصلہ کن اہمیت حاصل ہے، ہر طالب کو قبض وبسط کے نہ ختم ہونے والے سلسلہ سے دوچار

ہونا پڑتا ہے، قبض کی حالت جب شدید ہوجاتی ہے تو طالب بے بس ہوکر محبوب کے سامنے آہ وزاری کرنے لگتا ہے اور اپنی دل کی حالت زار اس کے سامنے بیان کرنے لگتا ہے، اس سے رحم کی بھیک مانگنے لگتا ہے، اس طرح قبض کی حالت اس کی شخصیت میں موجود انانیت کے بت کو توڑ دیتی ہے، جب بسط کی حالت اس پر طاری ہوتی ہے، تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا، وہ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے زیادہ خوش نصیب فرد سمجھنے لگتا ہے، قبض وبسط کے انہی حالات میں وہ عرصے تک رہتا ہے اور اسی سے اس کی تربیت ہوتی ہے۔

محبوب حقیقی سے محبت کی یہ داستان ایسی ہے، جس کے مقابلہ میں مادی محبت کی ہزاروں لاکھوں داستانیں ہیچ ہیں، سالک آتش عشق سے گذرتے ہوئے زندگی کا قابل ذکر حصہ خوشی وغمی کے اتھاہ احساسات میں اس طرح گزارتا ہے کہ اس کے لئے ایک ایک دن ایک ایک برس پر بھاری ہوتا ہے، وہ محبوب کا وصال چاہتا ہے، جب کہ محبوب نے اپنے وصال کی قیمت روزانہ آتش عشق کے بھڑکتے ہوئے انگاروں سے گزر کر راستہ قطع کرنے کے اصولوں سے اسے وابستہ کیا ہے، محبوب حقیقی سے عشق ومحبت کے بغیر زندگی بے معنیٰ ہے، اس لئے کہ محبوب کے بغیر انسان، انسانیت کے رازداں سے آشنا ہوسکے، اور اس کے دل میں محبوب حقیقی کی قدر وقیمت اور احساس عظمت پیدا ہوسکے، ناممکنات میں سے ہے، پاکیزہ الفاظات کا علم اور بات ہے، لیکن یہ پاکیزہ الفاظ مجسمہ بن کر پروانے کی طرح فرد کو فدا ہونے کے سلیقہ سے آشنا کرسکیں، دشوار تر بات ہے۔

محبوب کی چاہت یہ ہے کہ فرد نفس سے دور ہوتو اسے میری معیت حاصل ہو، لیکن نفس سے مقابلہ کرنا آگ کے دریا سے گزرنے اور اس میں جل کر کندن ہونے کے لئے بڑا جگر چاہئے، اللہ نے یہ نعمت ودولت عظمیٰ اپنے دوستوں کی مستقل صحبت ومعیت سے وابستہ کی ہے، اللہ کے دوستوں کو یہ سعادت عظمیٰ روزانہ طویل عرصہ تک موت کے سے حالات گذارنے کے نتیجہ میں ہی حاصل ہوئی ہے، اس لئے اللہ کے یہ دوست طالبوں کو یہ نعمت آسانی سے نہیں دیتے۔ (مرتب)

قَالَ لَهُم مُّوسَىٰ أَلْقُوا مَا أَنتُم مُّلْقُونَ . (سورۃ الشعراء، آیت نمبر ۴۳)

(موسیٰ نے ان سے (جادوگروں سے) فرمایا کہ تم کو جو کچھ ڈالنا ہو، ڈالو)۔

بعض بزرگوں کی بعض اوقات
منکرات پر چشم پوشی کا ہونا

بظاہر یہ عمل جادو کا عمل ہے، لیکن آپ کا مقصود ان کے سحر کا رد کرنا تھا اور اس کا تعلق سحر کے ظاہر ہونے سے تھا، اس لئے آپ نے ان کو اس کے اظہار کا اذن دیا، جیسے زندیق (ملحد) سے کہا جائے کہ اپنے باطل دعویٰ پر دلیل قائم کرو، غرض یہ ہوتی ہے کہ اس کے سامنے آنے کے بعد ان کا رد کیا جائے، پس بعض بزرگوں سے بعض منکرات پر جو چشم پوشی منقول ہے، اسی طرح کا عذر ان کے اس فعل میں ہے کہ ان کا مقصود کوئی دینی مصلحت ہوتی ہے، جو اس وقت مخفی ہوتی ہے، جو بعد میں ظاہر ہوجاتی ہے۔

تشریح:

اہل اللہ کے پیش نظر افرادِ معاشرے کی اصلاح ہوتی ہے، فاسد معاشرے کے اثرات کی وجہ سے لوگ عام طور پر مختلف قسم کی گمراہیوں کے زیر اثر ہوتے ہیں، اس طرح کے افراد کی اصلاح کے لئے بڑی حکمت کی ضرورت ہوتی ہے، چنانچہ اہل اللہ کے یہاں دیکھا گیا ہے کہ ان کے ہاں مختلف جرائم کے حامل افراد بھی آتے ہیں، راشی اور ظالم افراد بھی۔ وہ ان کے ان اعمال کے خلاف فوری طور پر روک ٹوک سے کام نہیں لیتے، انہیں امید ہوتی ہے کہ ان کے آتے رہنے سے ان پر پاکیزہ اثرات پڑنا شروع ہوجائیں گے، اگر فوری طور پر ان کے منکرات کا رد کیا جائے گا تو وہ بھاگ جائیں گے۔ نتیجۃً زندگی بھر ان کی اصلاح ہونا دشوار ہوجائے گی، چنانچہ اہل اللہ کی اس حکمت عملی کی وجہ سے ہر دور میں بُری خصلتوں کے حامل افراد کی اصلاح ہوئی ہے، اس دور میں بھی ان کی یہ حکمت عملی مؤثر رہی ہے، لیکن ان کی اس حکمت عملی کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ظاہری سطح سے حالات کو دیکھنے والے افراد اعتراض کرنا شروع کردیتے ہیں، جو اکثر غلط فہمی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

اس دور کے ایک اہل اللہ کا واقعہ ہے کہ ان کی خانقاہ پر ڈپریشن کے بعض مریض سکون کی تلاش میں آئے اور وہ خانقاہ میں کافی وقت رہنا چاہتے تھے، بزرگ نے ایک ہفتہ تک ان کا جائزہ لیا، ایک ہفتہ کے دوران ان افراد کو کافی سکون محسوس ہوا، بزرگ نے حمیت دین کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں نماز پڑھنے کی تاکید کی، جب بزرگ نے دوچار

بار انہیں نماز کے لئے کہا تو وہ خانقاہ سے بھاگ کر چلے گئے، جب بزرگ کو ان کے بھاگ جانے کا علم ہوا تو انہیں دکھ ہوا اور کہنے لگے کہ تنور گرم ہونے سے پہلے اس پر روٹی لگانے کی کوشش کی گئی، اگر وہ چند ہفتے مزید رہتے تو یہاں کے ماحول کے اثرات ان پر از خود غالب آجاتے اور وہ از خود نماز پڑھنا شروع کردیتے۔ (مرتب)

فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سَاجِدِيْنَ قَالُوا آمَنَّا بِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ رَبِّ مُوسَى وَهَارُونَ.

(سورۃ الشعراء، آیت نمبر ۴۶ ـ ۴۷)

(سو یہ دیکھکر) جادوگر ایسے متاثر ہوئے کہ سب سجدے میں گر پڑے (اور پکار پکار کر) کہنے لگے کہ ہم ایمان لائے رب العالمین پر، جو موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کا بھی رب ہے)۔

جذبۂ الٰہیہ کا اثبات

اس میں اثبات ہے جذبہ الٰہیہ کا، جس کا بزرگوں کے کلام میں کثرت سے ذکر ہے۔

تشریح:

معلوم ہوتا ہے کہ جادوگروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ کیا دیکھا کہ اچانک ان کی فطرت سلیمہ بیدار ہوئی اور اللہ کی محبت نے انہیں بیک وقت اس قدر گھیر لیا کہ فرعون جیسی ظالم اور قاہر شخصیت کا رعب ان کے دلوں سے نکل گیا، اللہ سے محبت اور شان عظمت کے غلبہ کا یہی کرشمہ ہوتا ہے کہ افراد کی زندگیوں کی کایاپلٹ جاتی ہے اور ان کی نظروں میں بڑے سے بڑا مادی نفع ونقصان کسی اہمیت کا حامل نہیں ہوتا، بزرگان دین کے کلام میں اسی محبت پر سب سے زیادہ زور ہے، اس لئے کہ فطرت میں موجود جب حقیقی محبت بیدار ہو کر، ارتقاء پذیر ہوتی ہے تو فرد محبوب حقیقی سے وفاداری کے اس مقام پر آجاتا ہے، جہاں محبوب کی اطاعت وعبادت کے لئے وہ اپنی ہر چیز قربان کرنے کے لئے تیار ہوجاتا ہے، اس کے دل سے غیر اللہ کا خوف نکل جاتا ہے، دنیا اور مادی دنیا کا رعب اور اس کی فکر مندی اس کے اندر سے نکل جاتی ہے۔

اللہ کی جس محبت میں اس طرح کی خصوصیات موجود ہوں، اللہ کی جو محبت اس قدر عظیم تبدیلی کا باعث ہو، اسے اہمیت نہ دینا اور اسے صوفیوں واہمہ قرار دینا، یا

طبیعت سے اس محبت کے میلان کا خاتمہ ہونا، یہ اس دور کا سب سے بڑا المیہ ہے اور معاشرے کے لگ بھگ ہر طبقہ کی نفسیاتی ساخت کچھ ایسی بن گئی ہے کہ اللہ کی محبت کی راہ کی طرف آنا تو درکنار، اس محبت کی باتیں سننے سے ہی بیزاری ونفرت کا مزاج پیدا ہوگیا ہے۔

اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ اللہ سے والہانہ محبت کے بغیر نفسی قوتوں اور خالص مادی نوعیت کے ماحول کے اثرات سے بچنا محال تر ہے۔

اس دور میں سیاستدان ہوں یا سرکاری آفیسر، سرمایہ دار ہو یا تاجر، پروفیسر صاحبان ہوں یا صاحبان علم، لگ بھگ سب پر ایک ہی فکر غالب ہے، وہ فکر دنیا کے چند دنوں کے مستقبل کی فکر ہے، یہ فکر اتنی حاوی ہوگئی ہے کہ اس کے لئے ہر طرح کے ہتھکنڈے اختیار کرنے، پروپیگنڈے سے کام لینے، تعصبات کو ابھارنے، قوم کی پامالی اور اس کی محتاجی کی قیمت پر کروڑپتی بننے کا جنون ہونا، یہ ساری چیزیں ہمارے سارے مؤثر طبقات کے مزاج کا حصہ بن گئی ہیں، یہ دراصل نتیجہ ہیں، اللہ کی محبت سے دوری اور اسے کوئی اہمیت نہ دینے کا۔

ہماری ملت کے لئے اللہ کی محبت کی راہ ہی نجات کی راہ ہے، اس سے باطن میں اتنی قوت پیدا ہوجاتی ہے کہ ایک نیا انسان وجود میں آتا ہے، جو محض اللہ کی رضا کی خاطر مادی دنیا سے دستبردار ہونے پر بخوشی آمادہ ہوجاتا ہے۔

اللہ کی محبت سے دوری وبغاوت کی روش نے قوم کے سارے مؤثر طبقات کو نفسیاتی مریض بھی بنادیا ہے، ان کی کوئی کل درست نہیں رہی، ایک دوسرے کے خلاف بغض اور نفرت آخری حد تک پہنچ چکی ہے۔

ضرورت ہے کہ اس سلسلہ میں بزرگوں کی بات مان کر، اللہ کی محبت کی راہ اختیار کی جائے۔ (مرتب)

قَالُوا لَا ضَيْرَ إِنَّا إِلَى رَبِّنَا مُنقَلِبُونَ. (سورۃ الشعراء، آیت نمبر ۵۰)

(نومسلم جادوگروں نے (فرعون کے جواب میں کہا) کہ کوئی حرج نہیں ہم اپنے مالک کے پاس جا پہنچیں گے)۔

اللہ سے مستحکم تعلق کے فوائد

جب بندے کا تعلق اللہ سے مستحکم ہوجاتا ہے تو اس کو دنیا کا کوئی نقصان، خوف اور ڈر میں مبتلا نہیں کرسکتا اور اس کے ساتھ ساتھ اس پر اللہ سے ملاقات کا شوق غالب رہتا ہے۔

تشریح:

اس آیت میں نومسلموں کی فرعون کی طرف سے قتل کی دھمکی سے بے خوفی اور موت سے شوق ظاہر ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب فطرت سلیمہ جاگ اٹھتی ہے، اندر کی آنکھیں بیدار ہوتی ہیں اور محبت کے پاکیزہ جذبات میں ارتقاء ہوتا ہے تو محبوب کے لئے فدائیانہ رنگ پیدا ہوتا ہے اور اس کی رضا جوئی کے لئے بڑی سی بڑی طاقت سے ٹکرانے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے اور محبوب سے ملاقات کا شوق افراد میں بے چینی پیدا کردیتا ہے، جادوگروں کا اللہ کے رسول کا معجزہ دیکھنا اور محبت کی نظروں سے اللہ کے رسول کی زیارت نے انہیں اس بلند مقام پر فائز کردیا کہ قرآن نے اس کا ذکر کرکے ان کو دائم بنا دیا۔

وَأَوْحَيْنَا إِلَى مُوسَى أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِي . قولہ . **كَلَّا إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ.** (سورۃ الشعراء، آیت نمبر۵۲)

(ہم نے موسیٰ کو حکم بھیجا کہ میرے بندوں کو شباشب نکال لے جاؤ۔ تم لوگوں کا تعاقب کیا جائے گا۔ موسیٰ نے فرمایا ہرگز نہیں، کیونکہ میرا پروردگار میرے ہمراہ ہے وہ مجھے ابھی راستہ بتادے گا)۔

اسباب وتوکل میں اعتدال کا ہونا

اس میں مسئلہ یہ ہے کہ تدابیر اور تدبیر کو چھوڑنے میں اعتدال چاہئے، چنانچہ تدبیر تو یہ بتائی گئی کہ نبی اسرائیل کو لے کر شباشب چلے جاؤ، پھر جب انہوں نے پکڑے جانے کا اندیشہ ظاہر کیا، جس سے مقصود یہ تھا کہ کچھ تدبیر کی جائے تو موسیٰ علیہ السلام نے ان کو **إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ** فرما کر یہ بتادیا کہ اللہ تعالیٰ کی تدبیر کے ہوتے ہوئے ہماری تدبیر کی

ضرورت نہیں اور عارف کی یہی شان ہوتی ہے کہ اسباب سے اعتدال سے کام لیتا ہے، اس میں مبالغہ سے کام نہیں لیتا۔

تشریح:

حقیقی سالک اپنے سارے معاملات اللہ کے حوالے کردیتا ہے، وہ اسی سے مانگتا رہتا ہے، چونکہ اس نے اسباب کو اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، اس لئے وہ ایک حد تک اسباب کو ضرور اختیار کرتا ہے، تاہم اس کی نظر اسباب کے پیچھے کارفرما اصل ہستی کی طرف ہوتی ہے، وہ اسباب کو اصل محرک قوت نہیں سمجھتا۔

پھر اس کی دعوتی وتربیتی مصروفیات کی نوعیت ایسی ہوتی ہے کہ اسباب کے لئے اس کے پاس زیادہ وقت بھی نہیں ہوتا، محبوب حقیقی اس کے اختیار کردہ معمولی اسباب میں وہ برکت ڈالتا ہے کہ اس کے سارے ضروری کام ہوجاتے ہیں، اس کا کوئی ضروری کام رکتا نہیں، اس کے لئے محبوب کی چاہت یہی ہوتی ہے کہ اس کے پاس ضرورت سے زیادہ وسائل نہ آئیں، اگر طالب اسباب کو اپنے اوپر مسلط کرنے کی کوشش کرے گا تو محبوب عتاب میں آکر، اسے اسباب ہی کے حوالے کردے گا، یہ ایسا نکتہ ہے، جو حقیقی صوفی پر ہی منکشف ہوتا ہے، ناقص صوفی اسباب ووسائل کے حصول کے لئے فکرمند ہوتا ہے، اور اس کے لئے منصوبہ بندی بھی کرتا ہے، جو اس کے لئے محبوب سے دوری کا ذریعہ بنتا ہے۔ (مرتب)

وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ. (سورۃ الشعراء، آیت نمبر۸۰)

(اور جب میں بیمار ہوجاتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے)۔

اولیاء کا عیب کی نسبت کا اپنی طرف کرنا

بیماری جو ایک طرح سے نقص ہے، اس کی اپنی طرف نسبت کرنا اور شفا جو فی نفسہ کمال ہے، اسے حق تعالیٰ کی طرف نسبت کرنا، یہ ادب کی رعایت ہے، حضرت مولانا حافظ فضل الرحیم صاحب نے اس حاشیہ کا مفہوم اس طرح پیش فرمایا ہے۔

اولیاء اللہ کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ وہ ہمیشہ عیب اور نقص کی نسبت اپنی طرف کرتے ہیں اور صفاتِ کمال کی نسبت اللہ وحدہ لاشریک کی طرف، کہ وہی کامل واکمل

صفات کا جامع ہے۔

تشریح:

حقیقی اہل اللہ پر نیستی کا رنگ غالب ہوتا ہے، یعنی اپنے آپ کو کچھ بھی نہ سمجھنے کا احساس، بلکہ وہ اپنے آپ کو گناہوں کا مجسمہ سمجھنے اور محبوب حقیقی کی قدردانی کا معمولی حق بھی ادا نہ کرنے والا سمجھتا ہے، وہ اپنے گناہوں اور غفلت میں گزرنے والی زندگی کے بارے میں کانپتا رہتا ہے کہ اگر اس کا حساب ہوا تو وہ مارا جائے گا، محبوب کی شان عظمت کے غلبہ کی وجہ سے اسے اپنی شخصیت میں عیب ہی عیب نظر آنے لگتے ہیں، لوگ جب بھی اس کی تعریف کرنے لگتے ہیں تو اس کے دل میں اپنے سیاہ تر ہونے کا احساس غالب ہونے لگتا ہے اور وہ محبوب کے سامنے شرمسار ہونے لگتا ہے کہ عیبوں کا مجسمہ ہونے کے باجود افراد اس سے حسن ظن رکھتے ہیں، اُس وقت وہ افراد کے اس حسن ظن کے حوالے سے دل ہی دل میں اللہ محبوب سے عرض کرتا ہے کہ وہ اپنی مخلوق کے اس حسن ظن کو دیکھ کر، اسے معاف کردے اور آخرت میں اس سے آسانی کا معاملہ فرمائے۔ (مرتب)

رَبِّ هَبْ لِیْ حُکْماً وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصَّالِحِیْنَ. (سورۃ الشعراء، آیت نمبر۸۳)

(اے میرے پروردگار مجھ کو حکمت عطا فرما اور (مراتب قرب میں) مجھ کو (اعلیٰ درجہ کے) نیک لوگوں کے ساتھ شامل فرما)۔

علم اورعمل کے سلسلے کا آخری وقت تک جاری رہنا

پہلا جملہ علمی قوت (صلاحیت) کی طرف اشارہ کرتا ہے، دوسرا جملہ عملی قوت کی طرف۔ یہ دونوں آپ (یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام) کو حاصل تھے، پھر ان کے طلب کرنے میں اشارہ ہے کہ سالک کو کسی بھی حد پر آ کر ٹھہرنا نہ چاہئے، بلکہ ہمیشہ طلب وترقی میں لگا رہے، الحقنی میں تواضع بھی ہے تو صالح ہونا تو بڑا درجہ ہے کہ صالحین میں ہی شامل ہوجاؤں۔

اس حاشیہ کا خلاصہ حضرت حافظ صاحب نے اس طرح پیش فرمایا ہے کہ علم وعمل کی کوئی حد مقرر نہیں، بلکہ جس درخت کو پھل لگتا ہے، وہ ہمیشہ جھکتا ہے۔

تشریح:

اللہ کا طالب، علم وعمل ومعرفت میں جتنا آگے بڑھتا ہے، اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ

علم وعمل ومعرفت کے معاملے میں تو اب تک زیرو کے مقام پر ہے، طالب جب انبیاء کرام واکابر اولیاء کرام کے حالات پڑھتا ہے تو اس پر یہ احساس غالب ہونے لگتا ہے، اس طرح علم، عمل اور معرفت کے لئے اس کی کوششوں میں مزید تیزی آنے لگتی ہے، یہ تیزی اس کے اس احساس میں مزید اضافہ کردیتی ہے، وہ بالآخر محبوب سے عرض کرنے لگتا ہے کہ وہ عمل ومعرفت کے اس حصہ کو قبول کرکے، اپنے فضل سے اس کی بداعمالیوں وسیاہ کاریوں کو معاف کردے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سالک کسی حد پر آ کر رکتا ہے، بلکہ حقیقی سالک کی تو حالت یہ ہوتی ہے کہ جب تک جسم میں خون کا آخری قطرہ ہوتا ہے، وہ محبوب کے لئے چلتا رہتا ہے، اس لئے کہ محبوب حقیقی کے بغیر اس کی زندگی بے معنیٰ ہے۔ (مرتب)

وَاجْعَلْنِیْ مِن وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِیْمِ . (سورۃ الشعراء، آیت نمبر۸۵)

(اور مجھ کو جنت نعیم کے مستحقوں میں کر)۔

جنت سے بے نیازیانہ روش پر تنقید

یہاں ان لوگوں کی تردید ہے، جو بڑی بے نیازی سے کہتے ہیں کہ ہمیں جنت کی طلب نہیں، حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو اللہ تعالیٰ سے جنت کی دعا کررہے ہیں، لیکن اگر کوئی غلبہ حال کی بنا پر کہے تو ایسا فرد معذور ہے۔

تشریح:

اللہ کی زیارت جنت میں ہی ہوگی، اس لئے بندہ مؤمن جنت سے بے نیازی کی روش اختیار نہیں کرسکتا، ہاں ایسا صوفی جن کا ذہن تجلیات کے شدید زیر اثر ہوتا ہے، وہ اپنی شخصیت کے احساس سے بھی معدوم ہوجاتا ہے، اسے اس معاملہ میں معذور سمجھا جائے گا، جنت کے حوالے سے اس طرح کے صوفیاء کی باتوں کی حیثیت شطحیات سے زیادہ نہیں ہوتی، حقیقی صوفی کو جنت اس لئے مطلوب ہوتی ہے کہ وہاں اللہ کا دیدار ہوگا، نہ کہ جنت بذات خود مقصود ہوتی ہے، مغلوب الحال فرد جو یہ روش اختیار کرتا ہے، وہ حالت معذوری کی وجہ سے قابل معافی ہے، اس لئے کہ حالت سکر نے اس کے شعور کو متاثر کردیا ہے۔ (مرتب)

قَالَ رَبِّیْ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ . (سورۃ العشراء، آیت نمبر۸۸)

(شعیب بولے کہ تمہارے اعمال کو میرا رب خوب جانتا ہے)۔

کرامات کے صدور کا اللہ کے حکم سے ہونا

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کرامات اہل اللہ کے اختیار میں نہیں۔

تشریح:

کرامات، صوفی کا اپنا ذاتی کمال نہیں ہوتا، اور نہ ہی یہ بات اس کے اختیار میں ہوتی ہے، اللہ تعالٰی کی حکمت جب اس کی متقاضی ہوتی ہے کہ لوگوں کو صوفی سے استفادہ کے حالات مہیا کئے جائیں یا کوئی حکمت مقصود ہوتی ہے تو صوفی سے کرامات کا ظہور ہوتا ہے، حقیقی صوفی کا دل کرامات نہیں چاہتا، اس لئے کہ وہ اپنی بزرگی کی شہرت سے ڈرتا رہتا ہے۔ (مرتب)

فَعَقَرُوهَا فَأَصْبَحُوا نَادِمِينَ . (سورۃ الشعراء، آیت نمبر ۱۵۷)

(اور انہوں نے اونٹنی کو مار ڈالا پھر جب آثار عذاب کے نمودار ہوئے تو اپنی حرکت پر پشیمان ہوئے)۔

گناہ سے توبہ کے ساتھ ساتھ اس کی تلافی کا ہونا بھی ضروری ہے

حکیم الامت کے الفاظ اس طرح ہیں: ان کی اس ندامت کے نافع نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اپنے فعل (گناہ کی) تلافی ایمان سے نہیں کی، اس سے معلوم ہوا کہ توبہ میں طبعی ندامت کا ہونا کافی نہیں، بلکہ عقلی ندامت بھی چاہئے۔

حافظ عبدالرحیم صاحب نے حاشیہ کا مفہوم اس طرح پیش فرمایا ہے۔

جب کسی گناہ سے توبہ کی جائے تو اس کی تلافی بھی کی جائے، مثلاً اطاعت الٰہی میں سستی ہوگئی ہو تو پوری تندہی سے اس میں مشغول ہوا جائے، اگر حقوق العباد میں کمی بیشی کی ہے تو انہیں ادا کرے یا معاف کرائے، اور صرف طبعی طور پر کسی کے کہنے پر گناہ نہ چھوڑے، بلکہ ذہنی طور پر بھی اس گناہ سے توبہ کرے۔

تشریح:

گناہ سے توبہ کے بعد اگر اس کی تلافی کی صورت بھی پیدا ہو تو اس سے نیکی کی راہ

پر چلنا آسان ہوجاتا ہے اور بندے کے ساتھ اللہ تعالٰی کا زیادہ فضل اور اس کی توجہات شامل ہوجاتی ہیں، مثلاً ذکر میں سستی واقع ہوگئی، اس میں ناغہ ہوگیا تو اس کے نتیجہ میں قلب پر تاریکی پیدا ہوگئی (ہر گناہ قلب میں تاریکی پیدا کرنے کا ذریعہ بنتا ہے) اب توبہ کے ساتھ ساتھ اس کی تلافی کی صورت یہ ہے کہ ذکر کی مقدار بڑھائی جائے اور چھوٹ جانے والا ذکر بھی کیا جائے، تاکہ نفس کو یہ عمل شاق گزرے، اور آئندہ وہ اس طرح کی حرکتوں اور غفلتوں سے باز آجائے، اسی طرح اگر کسی فرد سے قصور ہوا ہے تو توبہ کے ساتھ ساتھ اس سے معافی بھی طلب کی جائے۔ (مرتب)

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ. (سورۃ الشعراء، آیت نمبر ۱۹۳۔۱۹۴)

(اور ان کی (ایک امانتدار فرشتہ (جبرائیل) لے کر آیا ہے۔ تمہارے دل پر تو جیسے تم آدمیوں کو اللہ کی عذاب سے خبردار کرنے والوں میں سے ہو)۔

اولیاء کو ظاہری بصارت کے ساتھ ساتھ باطنی بصیرت کا حاصل ہونا

اولیاء اللہ کو ظاہری سماعت وبصارت کی طرح اللہ تعالٰی کی طرف سے باطنی سماعت وبصارت سے بھی نوازا جاتا ہے، جس سے ان پر ورود قلبی ہوتا ہے، اور اسرار وحکم کو دل کی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے کے بعد ان کے ایمان میں اور زیادہ ترقی ہوتی ہے۔

تشریح:

اہل اللہ کے علم کا مرکز قرآن وسنت کے ساتھ ساتھ دل کی گہرائیوں میں موجود اللہ کی تجلیات بھی ہوتی ہیں، دل جب پاک وصاف ہوجاتا ہے تو دل پر قرآن وسنت میں موجود انوار کا ورود ہونے لگتا ہے اور اہل اللہ کے دل کو علوم سے آشنا کیا جاتا ہے، جس سے عام طور پر عقل قاصر ہوتی ہے، عالم ربانی چونکہ مجاہدوں کے ذریعہ دل کو نفس کی یرغمالی سے بڑی حد تک آزاد کرچکا ہوتا ہے، اس لئے اس کے دل پر عجیب وغریب معارف وحقائق کا ورود ہوتا رہتا ہے، دینی معاملات اور زندگی کے مسائل میں اس کی رائے کی صحت کے امکانات قوی سے قوی تر ہوجاتے ہیں، اسے حکمت، بصیرت اور فراست عطا کی جاتی ہے، اس کی زکاوت حس بڑھ جاتی ہے، وہ چونکہ نفسی قوتوں اور نفس کی ہزارہا واردات

سے گزر چکا ہوتا ہے، اس لئے انسانی نفسیات، شخصیت اور افراد کے حالات ومزاج کے بارے میں اس کی تشخیص بڑی حد تک صحیح ہوتی ہے، اسے باطنی بصیرت عطا فرمائی جاتی ہے۔ (مرتب)

فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهاً آخَرَ فَتَكُونَ مِنَ الْمُعَذَّبِينَ ۔ (سورۃ الشعراء، آیت نمبر ۲۱۳)

(سوتم اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کی عبادت مت کرنا کہ کبھی تم کو سزا ہونے لگے)۔

ولی سے شرعی تکالیف معاف نہیں ہوسکتی

اس میں تصریح ہے کہ ولی کبھی ایسے درجہ پر نہیں پہنچتا، جس میں اس سے شرعی تکالیف ساقط ہوجائیں، کیونکہ ولی کا درجہ نبی پر فائق نہیں، پھر جب نبی کے لئے یہ جائز نہیں تو ولی کے لئے کیسے جائز ہوگا۔

تشریح:

ولایت کا کوئی درجہ ایسا نہیں، جہاں اسلامی شریعت اور فرائض وواجبات معاف ہوتے ہوں، بلکہ ولی کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اعمال صالحہ کی وجہ سے اللہ اسے اپنے قرب کا مقام عطا کرتا ہے، شریعت کے منافی اعمال کرنے والے فرد کو ولی کہنا ہر اعتبار سے غلط ہے، چاہے اسے کتنا ہی کشف حاصل ہو اور اس میں لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے اور راغب کرنے کی کتنی ہی استعداد حاصل ہو، ولایت، اعمال صالحہ اور اسلامی شریعت لازم وملزوم ہے، ولی کا اصل کام ہی یہی ہوتا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات کو فروغ دیتا ہے، اللہ کی اطاعت پر زور دیتا ہے، لوگوں کی تربیت کے ذریعہ انہیں اسلامی اعمال کا حامل بناتا ہے، نیز ان کا تزکیہ کرتا ہے، جو فرد اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا نہ ہو، وہ ولی نہیں ہوسکتا، حال سے معذور افراد قابل معافی ہیں، نہ کہ قابل تقلید۔

اس طرح کے معذور لوگوں کو دیکھکر حقیقی اہل اللہ سے اعراض (دوری اختیار کرنا) اپنی اصلاح وتزکیہ کے کام کو خطرے میں ڈالنا ہے۔ (مرتب)

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۔ (سورۃ الشعراء، آیت

نمبر ۲۱۵)

(اور ان لوگوں کے ساتھ (مشفقانہ) فروتنی کے ساتھ پیش آیئے جو مسلمانوں میں داخل ہو کر آپ کی راہ چلیں)۔

مربی کے لئے نرمی وتواضع کا ہونا ضروری ہے

اس میں شیوخ کو تعلیم دی گئی ہے کہ وہ اپنے مخلص تابعین سے نرمی وتواضع کے ساتھ پیش آیا کریں، تاکہ وہ مسرور ہوں۔

تشریح:

شیخ اپنے متعلقین کے لئے بڑا شفیق ہوتا ہے، وہ راہ محبت میں چلنے کی وجہ سے انہیں اپنے دل کے ٹکڑے کی حیثیت دیتا ہے، وہ ان سے محبت کرتا ہے اور ان سے آخری حد تک نرمی کا معاملہ کرتا ہے، البتہ جس طالب کی اصلاح کی کوششوں کے باوجود وہ اصلاح کے سلسلہ میں آگے بڑھنے کے لئے تیار نہیں ہوتا، وہ ذکر کے دورانیے میں اضافہ نہیں کرتا، اپنی شکل وصورت اسلام سے ہم آہنگ نہیں کرتا، اس پر شیخ سخت اذیت محسوس کرتا ہے، اگر شیخ کی برسوں کی صحبت کے باوجود طالب کی اصلاح نفس کی حالت میں ارتقا نہیں ہوتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا طالب اصلاح کے سلسلہ میں زیادہ سنجیدہ نہیں، وہ شیخ سے محض برکت کی خاطر وابستہ رہنا چاہتا ہے، یہ بات شیخ کے لئے رنجیدگی کا سبب ہوتی ہے، شیخ کے دل میں اپنے ساتھ وابستہ افراد ہی کے لئے نہیں، بلکہ سب کے لئے محبت وشفقت کے جذبات موجود ہوتے ہیں، وہ سب کی سعادت دارین کا خواہشمند ہوتا ہے، بلکہ وہ اس کا حریص ہوتا ہے۔ (مرتب)

إِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِأَهْلِهِ إِنِّي آنَسْتُ نَاراً سَآتِيكُم مِّنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ آتِيكُم بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ ۔ (سورۃ النمل، آیت نمبر ۷)

(جب کہ موسیٰ نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ میں نے آگ دیکھی ہے، میں ابھی وہاں سے کوئی خبر لاتا ہوں، یا تمہارے پاس آگ کا شعلہ کسی لکڑی وغیرہ میں لگا ہوا لاتا ہوں، تاکہ تم سینک سکو)۔

بسا اوقات صاحب کشف کا اپنی کشف کی حقیقت سے ناآشنا ہونا

بسااوقات صاحب کشف کو اپنے کشف کی حقیقت معلوم نہیں ہوتی اور وہ کچھ کا کچھ

سمجھ لیتا ہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کی تجلی کو ایک عام آگ سمجھ لیا، حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نور کی تجلی تھی۔

تشریح:

کشف کی حقیقت کو سمجھنا بعض اوقات بہت دشوار ہوجاتا ہے، بالخصوص مبتدی یا متوسط صوفی کو بہتر کشف ہوتو اس پر وہ اللہ کے انعام کا شکر ادا کرے، کشف کی حقیقت یا نوعیت معلوم کرنے یا مزید کشف کی آرزو اور اس کے انتظار میں رہنا وقت ضایع کرنے کے مترادف ہے، اصل چیز ذکر میں استقامت ہے، اگر یہ استقامت حاصل ہوجائے اور ایک بھی کشف حاصل نہ ہوتو یہ زیادہ بہتر حالت ہے، اس لئے کہ کشف کی صورت میں مبتدی ومتوسط طالب کی توجہ ذکر سے ہٹنا شروع ہوجاتی ہے۔ (مرتب)

إِنِّىْ لَا يَخَافُ لَدَىَّ الْمُرْسَلُوْنَ . (سورۃ النمل، آیت نمبر۱۰)

(اے موسیٰ ڈرو نہیں ہمارے حضور میں پیغمبر ڈرا نہیں کرتے)۔

تقویٰ کے نتیجے میں غیراللہ کا نکل جانا

انبیاء، اللہ کے غیر سے نہیں ڈرا کرتے، کیونکہ ان پر اللہ تعالیٰ کا خوف غالب ہوتا ہے (اللہ کی شان عظمت کی وجہ سے) ایسے ہی، جو کوئی چاہتا ہے کہ اسے غیراللہ کا قطعاً خوف نہ ہوتو اسے چاہئے کہ اللہ کی پکڑ اور عذاب سے ڈر کر زندگی گزارے۔

تشریح:

اللہ کا خوف اور آخرت کی فکرمندی ایسی چیز ہے، جو بندہ مومن کو دنیا کے خوف وہراس سے بلند کردیتی ہے، آخرت کے خوف کی وجہ سے بندہ مومن پر یہ فکر غالب رہتی ہے کہ آگ میرا انتظار کررہی ہے، زندگی کے یہ لمحات جو مجھے ملے ہیں اس لئے ملے ہیں، تاکہ ایسے اعمال کروں، جس سے اس آگ سے بچاؤ کی صورت پیدا ہو، اللہ کے عتاب کا خوف بندہ مومن (اہل اللہ) کے ہوش وحواس اڑانے کا موجب بن جاتا ہے، جس فرد کی آخرت کے سلسلہ میں حساسیت کی یہ حالت ہو، اسے دنیا کے ڈر اور خوف کیا کرسکتے ہیں، اللہ اور آخرت کا خوف ہی وہ چیز ہے، جو فرد کو دنیا کی ہیبت سے بلند کرنے کا ذریعہ ہے،

اگر فرد پر اس نکتہ کا استحضار ہوتو اس کے لئے دنیا کے سارے مسائل آسان ہوجائیں، اور دنیا کے حوالے سے اس کی ساری فکرمندی اگر ختم نہ بھی ہوتو حد اعتدال میں ضرور رہے گی۔ (مرتب)

وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ . (سورۃ النمل، آیت نمبر۱۵)

(ان دونوں (داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام) نے کہا کہ تمام تعریف اللہ تعالیٰ کے لئے سزاوار ہے جس نے ہم کو اپنے بہت سے ایمان والے بندوں پر فضیلت دی)۔

کاملین کی حالت بھی تغیر وتبدل سے خالی نہیں ہوتی

کاملین بھی ایک حالت پر نہیں رہتے، بلکہ ان میں بھی اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے، کبھی تو اپنے آپ کو بالکل معدوم خیال کرتے ہیں اور کبھی اپنے تمام کمالات گنوا دیتے ہیں، اور ان کمالات کا اظہار فخر وغرور کے طور پر نہیں ہوتا، بلکہ اظہار تشکر کے طور پر ہوتا ہے۔

تشریح:

کاملین کے حالات میں تغیر وتبدل بشریت کا لازمی نتیجہ ہے، بڑے سے بڑا اہل اللہ بھی کیفیات میں ادل بدل اور احساسات کے تغیر اور دلی طور پر اتار چڑھاؤ کے حالات سے محفوظ نہیں رہتا، البتہ ان کے حالات میں تغیر وقتی اور ہنگامی نوعیت کا ہوتا ہے، اکثر ان کے مزاج میں ٹھہراؤ ہوتا ہے، کاملین اگر اپنے مجاہدات یا اپنی طبیعت کی بہتری کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مقصود طالبوں میں ذوق وشوق پیدا کرنا ہوتا ہے، نہ کہ اپنے مجاہدوں وصفات پر ناز کرنا پیش نظر ہوتا ہے، کاملین پر بعض اوقات خوف کی حالت زیادہ غالب ہوتی ہے، حالات میں تغیر اللہ کی سنت ہے، دن کے بعد رات کا آنا، سردی کے بعد گرمی کا آنا، صحت کے بعد بیماری کا آنا، ان ساری چیزوں میں حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ (مرتب)

وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ. (سورۃ النمل، آیت نمبر۲۴)

(میں نے اس کو اور اس کی قوم کو دیکھا کہ وہ اللہ کو چھوڑ کر آفتاب کو سجدہ کرتے ہیں، اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کی نظر میں مرغوب کر رکھا ہے اور ان کو راہ سے روک رکھا ہے سو وہ راہ پر نہیں چلتے)۔

جانوروں اور چرند وپرند میں ایک حد تک عقل ومعرفت کا ہونا

ہدہد کی یہ تقریر اس پر دلیل ہے کہ جانوروں اور چرند پرند کو اللہ تعالیٰ نے ان کی ضرورت کے موافق اتنی عقل ومعرفت عطا فرمائی ہوئی ہے کہ جس سے وہ اشیاء کو سمجھ اور پہچان سکیں۔

تشریح:

جانوروں اور چرند وپرند سب میں ان کی حیثیت وضرورت کے مطابق عقل وشعور موجود ہوتا ہے، اس شعور کی وجہ سے ہی وہ زندگی کی بقا کے لئے کوشاں رہتے ہیں، اگر ان میں شعور نہ ہو تو ان کی زندگی مشکل ہوجائے، ہدہد کا حضرت سلیمان علیہ السلام کو ایک مشرک قوم اور ان کی بادشاہ خاتون کی اطلاع دینا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض جانوروں میں کافی زیادہ شعور ہوتا ہے، لیکن انسان کو جو شعور حاصل ہے، اتنا شعور مخلوق میں کسی اور کو حاصل نہیں، اس شعور کی وجہ سے ہی وہ اعمال کے جواب دہ ہیں۔ (مرتب)

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُن فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ . (سورۃ النمل، آیت نمبر ۷۰)

(اور آپ ان پر غم نہ کیجئے اور جو کچھ یہ شرارتیں کر رہے ہیں، اس سے تنگ نہ ہوں)۔

وعظ ونصیحت اور لوگوں سے رابطے میں اعتدال سے کام لینا

جو وعظ وارشاد کے فریضہ میں مشغول ہو اور اس کی بنا پر لوگوں سے میل جول رکھنا پڑے تو اس میں بھی میانہ روی اور اعتدال سے کام لینا چاہیے۔

تشریح:

وعظ وتلقین پر فائز فرد کو اس کام میں اعتدال قائم رکھنا ضروری ہے، ہر وقت لوگوں

سے ملنا، وعظ ونصیحت یا گفتگو کرتے رہنا، ہر وقت دوسروں کی اصلاح کی فکرمندی کا ہونا، یہ اعتدال کے منافی ہے، اس سے دل وروح کی تشنگی میں اضافہ ہوتا ہے، دل وروح کی غذا ہی محبوب کا ذکر ہے، جب غیر معمولی مصروفیات کی وجہ سے اس میں کمی واقع ہوتی ہے، تو ایک طرف اخلاص وللھیت میں فرق واقع ہوجاتا ہے، دوم دل میں اضطراب پیدا ہونا شروع ہوجاتا ہے، بعض اہل اللہ پر ہر وقت ذکر کی کیفیت غالب رہتی ہے، یہ اگرچہ بہتر کیفیت ہوتی ہے، تاہم اللہ کے بندوں کو ان کی اصلاح کے لئے وقت دینا بھی ضروری ہے، ورنہ افراد معاشرہ کی اصلاح کا عمل بری طرح متاثر ہوگا۔ (مرتب)

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِينِ . (سورۃ النمل، آیت نمبر ۷۹)

(سو آپ اللہ پر توکل رکھئے یقیناً آپ صریح حق پر ہیں)۔

حق پر قائم ہونے سے ہر طرح کے سکون کا حاصل ہونا

جو فرد حق پر قائم ہوتا ہے، اس کا دل ودماغ بالکل مطمئن ہوتا ہے، اس میں کسی قسم کا شبہ باقی نہیں رہتا، اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی ذات پر اس کا توکل وبھروسہ روز بروز بڑھتا چلا جاتا ہے، اور اس کے برعکس جو حق پر قائم نہیں ہوتا، اس کے دل میں روز بروز وسوسے وشبہات بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

تشریح:

حق پر استقامت سے قائم رہنے والا فرد دلی اور ذہنی سکون سے سرشار ہوتا ہے، ذکر وعبادت کے مجاہدے اور شریعت پر استقامت اس کی باطنی حالت کو مستحکم سے مستحکم تر کردیتی ہے، ایسے افراد کا اللہ کی ذات پر یقین میں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے، انہیں دوسروں کی طرف دیکھنے کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی، وہ سکون، سکینت اور حلاوت کی ایسی حالت میں رہتے ہیں، جسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے، جب کہ ذکر وعبادت، مخلصانہ اطاعت سے محروم افراد اکثر پریشان رہتے ہیں، ان کا دل ہر وقت اضطراب سے دوچار ہوتا ہے، اس طرح ان کے لئے یہ زندگی ایک طرح سے عذاب بن جاتی ہے۔ (مرتب)

إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ . (سورۃ النمل، آیت نمبر ۸۰)

(آپ مردوں کونہیں سنا سکتے اور نہ بہروں کو اپنی آواز سنا سکتے ہیں (خصوصاً) جب کہ وہ پیٹھ پھیر کر چل دیں)۔

ہدایت کا شیخ کے قبضہ میں نہ ہونا

یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ ہدایت شیخ کے قبضہ میں نہیں، جیسا کہ بعض جاہلوں کا زعم ہے۔

تشریح:

شیخ کا کام اصلاح کے لئے کوششیں کرنا ہے اور اسی کام میں اپنی زندگی خرچ کرنی ہے، ہدایت دینا، اللہ کا کام ہے، اللہ تو سب کو ہدایت دینا چاہتا ہے، لیکن جو محروم افراد طلب ہدایت کی استعداد کو ضایع کر چکے ہوں، غلط ماحول کے فاسد اثرات کی وجہ سے فطرت سلیمہ کو بڑی حد تک مضمحل کر چکے ہیں اور کسی بھی صورت راہ ہدایت پر آنا ہی نہیں چاہتے، انہیں اگر ہدایت دی بھی جائے تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے، جو مریض دوا استعمال کرنے کے لئے تیار ہی نہ ہو، اس کے منہ میں دوا ڈال دینے کے باوجود وہ دوا کو منہ سے نکال دیتا ہو، اسے صحت کیسے حاصل ہو سکتی ہے۔

ہدایت کی پہلی شرط طلب کا ہونا ہے۔ دوسری شرط اس کے لئے وقت نکالنا ہے، تاکہ ہدایت والا مزاج راسخ تر ہوتا جائے۔

موجودہ دور میں فاسد ماحول کے زبردست اثرات نے افراد کو عام طور پر دین کی راہ پر گامزن ہونے اور تزکیہ نفس اور ہدایت کے سلسلہ میں فکرمندی اور تڑپ کو ختم کردیا ہے۔ (مرتب)

إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ رَبَّ هَذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِیْ حَرَّمَهَا وَلَهُ كُلُّ شَیْءٍ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ. (سورۃ النمل، آیت نمبر ۹۱)

(مجھے یہی حکم ہوا ہے کہ میں اس شہر کے مالک کی عبادت کیا کروں جس نے اس کو محترم بنایا ہے اور سب چیزیں اسی کی ہیں اور مجھے یہ حکم ہوا ہے کہ میں فرمانبردار رہوں)۔

فیوض کا اللہ کی طرف منسوب ہونا

پس یہ دلیل ہے اس پر کہ فیوض کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا واجب ہے، اپنے

مجاہدہ وعمل کی طرف منسوب نہ کرے۔

تشریح:

طالب کو مجاہدوں کی توفیق کا حاصل ہونا، ایمانی حلاوت کا عطا ہونا، پاکیزہ کیفیات کا حاصل ہونا، حالت اشتعال کے وقت برداشت کی نعمت کا عطا ہونا، صالح اعمال کی استعداد کا حاصل ہونا، اللہ کے بندوں سے محبت کا ہونا، یہ ساری صفات اور یہ سارے فیوض وبرکات اللہ کا خاص فضل ہے، ان چیزوں کو اپنے مجاہدوں کی طرف منسوب کرنا صحیح نہیں، یہ عاجزی کے منافی ہے، اس سے محبوب کے عتاب کا خطرہ ہے اور خود پر ناز ہونے کا امکان بھی ہے، اس لئے اس معاملہ میں احتیاط ضروری ہے، اگر طالب کے لئے اللہ کی طرف سے حاصل ہونے والی نعمتوں کا ذکر کرنا ضروری ہو تو یہ کہنا چاہیے کہ اللہ کے فضل سے مجھے یہ نعمتیں حاصل ہیں، اس سے ناز وتکبر کے جراثیم کی روک تھام ہوتی ہے۔ (مرتب)

وَنُرِیْدُ أَن نَّمُنَّ عَلَى الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوا فِی الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِیْنَ. (سورۃ القصص، آیت نمبر ۵)

(اور ہم کو یہ منظور تھا کہ جن لوگوں کا زمین (مصر) میں زور گھٹایا جا رہا تھا ہم ان پر (دنیوی ودینی) احسان کریں ان کو (دین میں) پیشوا بنادیں اور دنیا میں ان کو (ملک کا) مالک بنادیں۔

تواضع کے فوائد وثمرات

جو کوئی اللہ کے لئے غرور وتکبر کو چھوڑتے ہوئے تواضع اختیار کرے گا، اسے اللہ تعالیٰ عزت کی چوٹیوں تک پہنچا دیں گے اور عزت کی بلند ترین چوٹی لوگوں کے لئے مقتدا فی الدین ہونا ہے۔

تشریح:

اللہ تعالیٰ جب چاہتے ہیں کہ کسی قوم کو اوپر اٹھادیں تو اس کے لئے حالات سازگار بنادیتے ہیں، اگرچہ اس قوم کو سرفرازی عطا کرنے کے لئے سب سے پہلے آزمائش کے ذریعہ اس کو مستحکم کرتے ہیں اور اسے اس قابل بنادیں کہ وہ اس مقام پر فائز ہو سکے۔

غرور اور تکبر، نفس کا سب سے بڑا ''خاصہ'' ہے، عام طور پر ہر شخص کسی نہ کسی حد تک اس بیماری میں مبتلا ہوتا ہے، معاشرے میں پیدا ہونے والا بیشتر فساد اسی بیماری کی وجہ سے ہوتا ہے، نفس، بڑے پن سے کسی طور دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہوتا، اللہ کے کثرت ذکر اور اہل اللہ کی مستقل صحبت ہی فرد کو اس بیماری سے بچانے کا ذریعہ بن سکتی ہے، جب فرد تکبر اور بڑے پن کے سارے اثرات سے محفوظ ہوتا ہے تو اسے یہ مقام حاصل ہوتا ہے، جہاں اللہ کی طرف سے اسے قبولیت کا شرف عطا ہوتا ہے، عاجزی و تواضع کے بارے میں حضرت مجدد الف ثانیؒ اپنے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں: اللہ کا قرب کمال عجز سے ہی وابستہ ہے، قرب کے متلاشی عجز میں کمال حاصل کریں، اور عجز یہ ہے کہ علم کے ہوتے ہوئے علم سے نظر کا اٹھ جانا، عمل کے ہوتے ہوئے عمل سے نظر کا اٹھ جانا، اخلاص کے ہوتے ہوئے اخلاص سے نظر کا اٹھ جانا، یعنی علم وعمل اور اخلاص کے باوجود اپنے آپ کو کچھ بھی نہ سمجھنا، اپنی ہر چیز کی نفی کرنا اور اس نفی کے احساس کا غالب ہونا، حاصل ہونے والی اپنی ساری نعمتوں کو اللہ کا فضل خاص سمجھنا، جب یہ چیز حاصل ہوتی ہے تو ایسے فرد کی ذات لوگوں کے لئے اصلاح کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ (مرتب)

وَقَالَتِ امْرَأَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ لَا تَقْتُلُوْهُ. (سورۃ القصص، آیت نمبر ۹)

(اور فرعون کی بیوی (حضرت آسیہ) نے (فرعون سے) کہا کہ یہ بچہ میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اسے قتل مت کرو)۔

متبع سنت بزرگ سے محبت کے اثرات

اگر کسی متبع سنت بزرگ سے قلبی محبت پیدا ہوجائے تو یہ انتہائی مفید ہے کہ اس کی محبت سے آہستہ آہستہ اتباع سنت کی توفیق مل جاتی ہے، یہ قاعدہ کلیہ تو نہیں، لیکن اکثر جگہ ایسا ہوتا ہے۔

تشریح:

حضرت آسیہ کے دل میں اللہ تعالیٰ نے ہونے والے نبی کی محبت ڈال دی تھی، اس محبت کا ثمرہ تھا کہ اللہ نے اسے ایمان کی دولت سے سرفراز فرمایا اور صاحب ایمان

عورتوں میں انہیں ممتاز مقام عطا فرمایا اور قرآن میں بھی اس کا ذکر فرمایا۔

کسی اہل اللہ سے محبت کے پیدا ہونے کے نتیجہ میں فرد اہل اللہ کے فیوض و برکات سے بہرہ ور ہونے لگتا ہے اور اہل اللہ کی صفات وخصوصیات کا ایک حصہ اسے عطا ہونے لگتا ہے، اہل اللہ کی صحبت کے ساتھ ساتھ اگر ذکر کے مجاہدے بھی حاصل ہوں تو ایک وقت آتا ہے کہ فرد خود دوسروں کی اصلاح کا ذریعہ بن جاتا ہے، اہل اللہ سے محبت اور ان کی صحبت کے نتیجے میں ذکر وفکر کے مجاہدوں کی سعادت بھی حاصل ہونے لگتی ہے، لیکن دیکھا گیا ہے کہ بعض افراد کا نقطہ نگاہ یہ ہوتا ہے کہ اسے جو کچھ عطا ہو، صحبت سے حاصل ہو، وہ ذکر وفکر کے مجاہدوں کے لئے شعوری طور پر تیار نہیں ہوتے، ایسے افراد اہل اللہ سے ایک حد تک ہی متمتع ہو پاتے ہیں، وہ مجاہدوں کے ثمرات سے فیضیات نہیں ہو پاتے۔ (مرتب)

أَنْ تَأْجُرَنِيْ ثَمَانِيَ حِجَجٍ. (سورۃ القصص، آیت نمبر ۲۷)

(اس شرط پر کہ تم آٹھ سال میری نوکری کرو)۔

معاشی سرگرمیوں کا توکل کے منافی نہ ہونا

یہ اس پر دلیل ہے کہ نوکری، مزدوری یا دیگر معاشی اسباب توکل کے منافی نہیں، البتہ جو شخص اس میں مشغول ہوکر علم باعمل کے لئے فارغ نہ ہوسکے اور وہ تحمل بھی کرسکتا ہو تو اس کے لئے اسباب کو ترک کرنا مستحق ہے۔

تشریح:

معاش کے لئے اسباب کا اختیار کرنا ایک حد تک ضروری ہے اور یہ توکل کے خلاف نہیں ہے، لیکن معاشی جدوجہد میں اپنی بیشتر توانائیاں صرف کرنا اور اس کی وجہ سے ضروری دینی علم اور اللہ کی محبت ومعرفت کے لئے مجاہدوں کے لئے وقت کا نہ نکالنا، یہ سخت خسارے کا سودا ہے، جب پیدائش کا مقصد ہی اللہ کی عبادت ہے اور عبادت کی سب سے افضل صورت ذکر وفکر کے مجاہدے ہیں، اطاعت اس کا حاصل ونتیجہ ہے، اگر اس کے لئے وقت ہی نہ نکل سکے تو ایسی معاشی جدوجہد فرد کے لئے بگاڑ کا ذریعہ بن جاتی ہے، اگر فرد، قناعت اور سادہ زندگی بسر کرسکتا ہے، جو فرد کے بس کی بات ہے تو اس کے باوجود محض خوشحالی یا راحت کی چیزوں کے حصول کے لئے معاشی جدوجہد میں استغراق خسارے کا

سودہ ہے، ایسی معاشی جدوجہد جو اس دور میں عام ہوگئی ہے، وہ فرد وافراد کی بہت ساری روحانی، اخلاقی، ذہنی ونفسیاتی بیماریوں کا موجب بن جاتی ہے، اس لئے کہ معاشی سرگرمیاں دل وروح کو اس کی مطلوبہ غذا دینے کی راہ میں حائل ہوجاتی ہے اور شخصیت کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ (مرتب)

وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطَاناً فَلَا يَصِلُونَ إِلَيْكُمَا بِآيَاتِنَا أَنتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغَالِبُونَ. (سورۃ القصص، آیت نمبر ۳۵)

(اور ہم تم دونوں) حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام) کو خاص شوکت عطا کرتے ہیں جس سے ان لوگوں کو تم پر دسترس نہ ہوگی، ہمارے معجزے لے کر جاؤ تم دونوں اور جو تمہارا پیروکار ہوگا، غالب رہوگے)۔

اہل اللہ کو ہیبت کا عطا ہونا

اس میں دلالت ہے کہ اہل اللہ کو منجانب اللہ ایک شانِ ہیبت عطا ہوتی ہے۔

تشریح:

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو اللہ نے خاص شان ہیبت عطا کی تھی، اہل اللہ کو بھی اسی ہیبت کا کچھ حصہ عطا ہوتا ہے، اس لئے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کے لئے فنا کر چکے ہوتے ہیں اور وہ اپنی زندگی کو اللہ اور اس کے دین کی خدمت کے لئے وقف کر چکے ہوتے ہیں۔

اللہ کے ذکر میں مداومت، اخلاص، للٰہیت، بےنفسی اور دل کی پاکیزگی کی وجہ سے اہل اللہ دوسروں سے نرالی شخصیت کے حامل ہوتے ہیں، ان کے باطن سے ایک طرح کی خوشبو نکلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، جو بھی عقیدت سے ان کے قریب ہوتا ہے، وہ اس خوشبو کے اثرات محسوس کرتا ہے، اہل اللہ کا کردار بھی ایسا ہوتا ہے، جس میں للٰہیت غالب ہوتی ہے، ان اسباب کی وجہ سے ان کی شخصیت بہت زیادہ سادہ ہونے کے باوجود ہیبت کی حامل ہوتی ہے، اللہ اپنے دوستوں کے لئے لوگوں کے دل میں رعب ڈال دیتے ہیں۔ (مرتب)

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ وَهُوَ أَعْلَمُ

بِالْمُهْتَدِينَ. (سورۃ القصص، آیت نمبر ۵۶)

(آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے بلکہ اللہ جس کو چاہے ہدایت کردیتا ہے اور ہدایت پانے والوں کا علم بھی اسی کو ہے)۔

ہدایت کی توفیق کا اللہ کی طرف سے عطا ہونا

یہ صریح ہے اس میں کہ ہدایت کسی کی قدرت میں نہیں، جیسا بعض جہلا کا گمان ہے کہ شیخ کامل جس کو چاہے اپنی نصرت سے واصل باللہ کردے۔

تشریح:

حضور ﷺ، حضرت ابو طالب کے بارے میں بہت زیادہ خواشمند تھے کہ وہ ایمان قبول کرلیں، حضرت ابو طالب نے اپنی زندگی کے آخر وقت تک آپ کی ہر ممکن حد تک مدد بھی کی۔ اس پس منظر میں یہ آیت ہم سب کے لئے لمحہ فکریہ ہے کہ ایمان کی دولت اللہ کے فضل خاص کے بغیر نصیب نہیں ہوتی اور اس دولت کے آخر وقت تک برقرار رکھنے کے لئے مسلسل اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتے رہنے کی ضرورت ہے۔ محض دین اور اہل دین کی مدد ونصرت کرنا کافی نہیں ہے، بلکہ دل کی گہرائیوں میں ایمان ویقین کا مستحکم ہونا ازحد ضروری ہے، اس دور میں ایک حلقے میں دین کی نصرت کا جذبہ تو کسی حد تک موجود ہے، لیکن ایمان ویقین کے گہرائیوں کے حصول کا ذوق وشوق ندارد۔

ہدایت دینا، یہ اللہ کا فضل خاص ہے، تاہم اللہ نے ہدایت کو طلب اور مجاہدوں سے وابستہ کیا ہے، اگر ہدایت کی حقیقی طلب موجود ہو تو مربی تک رسائی میں آسانی پیدا ہوجاتی ہے، اور اللہ کے ذکر وفکر کے لئے مجاہدوں کا ذوق وشوق بھی پیدا ہونے لگتا ہے، اگر فرد میں طلب موجود نہ ہو تو اہل اللہ کی کاوشوں کے باوجود ہدایت کی راہ پر گامزن ہونا مشکل ہوتا ہے، ہدایت دینا، اللہ کے اختیار میں ہوتا ہے، جو شخص فطرت سلیمہ کے اجزاء کو مسخ کرچکا ہو، وہ ہدایت کا اہل ہو، دشوار تر بات ہے۔ (مرتب)

فَأَمَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحاً فَعَسَى أَن يَكُونَ مِنَ الْمُفْلِحِينَ. (سورۃ القصص، آیت نمبر ۶۷)

(البتہ جو شخص توبہ کرے اور ایمان لائے اور نیک کام کیا کرے تو ایسے لوگ امید

ہے کہ فلاح پانے والوں میں سے ہونگے)۔

تین چیزوں سے اللہ کی
رضامندی کا حاصل ہونا

اس میں مقصود کے حصول کو تین چیزوں سے وابستہ فرمایا گیا ہے، پہلی چیز قلبی توجہ کا ہونا ہے (یعنی قلب، اللہ کی طرف متوجہ ہو) یہ توبہ ہے، دوسری چیز عقائد کی صحت ہے اور یہ ایمان ہے، تیسری چیز اعمال کی اصلاح ہے، پس یہ آیت سارے سلوک کی جامع ہے۔

اس حاشیہ کو حضرت مولانا فضل الرحیم صاحب نے بہت مؤثر طور پر پیش کیا ہے۔(ذیل کا حاشیہ انہی سے ماخوذ ہے)

فرد، تین چیزوں کا خیال رکھ کر زندگی گزارے تو ان شاء اللہ، اللہ کی رضا حاصل ہوجائے گی، جو کہ مقصود اعظم ہے، (۱) سب سے پہلے اپنے عقائد کو ہر قسم کی غلاظتوں سے پاک رکھے، اس لئے کہ اس میں ذرا سی کمی بھی برداشت نہیں۔ (۲) اپنے اعمال وافعال کو سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے سانچے میں ڈھالے، کیونکہ اس سے بہترین زندگی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ (۳) اور اگر خدانخواستہ اس دوران غلطی سے یا جان بوجھ کر (نعوذ باللہ من ذالک) کوئی خطا یا گناہ ہوجائے تو فوراً توبہ کرکے اس گناہ کو چھوڑ دے اور آئندہ نہ کرنے کا عہد کرکے، گناہوں سے بچتا رہے، جو یہ کرلے گا، اس کی دنیا بھی جنت کا منظر پیش کرے گی۔

تشریح:

یہ نکتہ بجائے خود مفصل نکتہ ہے، اس کی مزید تشریح کی ضرورت نہیں، البتہ یہ کہنا ضروری ہے کہ ان چیزوں کی وجہ سے فرد میں جو سرور وحلاوت حاصل ہوتی ہے، وہ ایسی ہے، جس پر ساری دنیا کی نعمتیں قربان کی جاسکتی ہیں، لیکن اذیت کی بات ہے کہ ہر دور میں انسانوں کی اکثریت مادیت اور مادی راحتوں سے بلند ہونے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ اس دور میں تو مادیت کے غیرمعمولی غلبے اور فضا میں موجود مادی کثافتوں کی وجہ سے اللہ کی محبت اور اس کی مخلصانہ اطاعت کی راہ پر آنا نہ صرف یہ کہ دشوار ہوگیا ہے، بلکہ اس سے وحشت وبیزاری پیدا ہوگئی ہے۔ (مرتب)

لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ. (سورۃ القصص، آیت نمبر۷۶)

(تو اترا مت، واقعی اللہ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا)۔

واردات پر فرحاں ہونے کے بارے میں

اسی طرح (باطنی) احوال وواردات کو اپنی طرف منسوب کرکے، اس پر فرحاں ہونا مذموم ہے،اگر نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرکے، اس پر خوش ہو تو وہ مطلوب ہے۔

تشریح:

راہ سلوک میں چلتے ہوئے طالبوں کو کیفیات وواردات کی ایک نئی زندگی عطا ہوتی ہے، جس کا طریقت سے باہر تصور بھی نہیں ہوسکتا، بعض اوقات کیفیات کا ایسا ورود ہوتا ہے کہ دل پر جنت کا منظر طاری ہونے لگتا ہے، اس بے پنا خوشی ومسرت کے موقعہ پر بعض اوقات اغوائے شیطانی کے نتیجہ میں سالک پر اپنی فضیلت اور دوسروں کی تحقیر کی نفسیات پیدا ہونے لگتی ہے۔

اگر طالب نے بر وقت سنبھلنے کی کوشش نہیں کی تو اس کی یہ نفسیات پختہ ہونے لگتی ہے اور وہ اپنے آپ کو بزرگ سمجھکر، اپنی اصلاح سے بے پروا ہونے لگتا ہے اور دوسروں کی تربیت کے مقام پر فائز ہونے لگتا ہے، اس طرح وہ تصوف وطریقت کے پردے میں فساد فی الارض کا ذریعہ بنتا ہے۔

ایک تکبر وہ ہوتا ہے،جو مال ودولت اور منصب سے پیدا ہوتا ہے، جس کا آیت میں ذکر کیا گیا، دوسرا تکبر ذکر وفکر کے مجاہدوں کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی کیفیات وواردات سے پیدا ہوتا ہے کہ سالک سمجھنے لگتا ہے کہ اسے بس باطنی نعمت حاصل ہوگئی، اس طرح وہ اپنے آپ کو اپنے شیخ سے بھی بے نیاز سمجھنے لگتا ہے، اللہ ہمیں نفس وشیطان کے اس طرح کے حملوں سے بچالے۔ آمین (مرتب)

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا. (سورۃ القصص، آیت نمبر۸۳)

(آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں، جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ ہی فساد کرنا چاہتے ہیں)۔

آخرت کے گھر کا تکبر اور فساد سے
بچانے والوں کے لئے ہونا

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ جس طرح گناہ، آخرت کی (تیاری کی راہ میں) رکاوٹ ہیں اور فساد سے یہی مراد ہے، اسی طرح تکبر بھی آخرت (کی راہ میں) حائل ہے، اور علو سے مراد یہی ہے، اسی لئے اہل طریقت (اہل تصوف) جتنا اہتمام گناہوں کو چھوڑنے کا کرتے ہیں، اتنا ہی تکبر سے بچاؤ کا بھی کرتے ہیں۔

تشریح:

قرآن کی یہ آیت بڑے انتباہ کی حیثیت رکھتی ہے، اور ہم سب کو سنبھلنے کا موقعہ فراہم کرتی ہے، فرمایا جارہا ہے کہ جو فرد دنیا میں بڑا بننا نہیں چاہتا، نہ ہی فساد کرنا چاہتا ہے، آخرت کی ابدی زندگی کا انعام تو انہی کے لئے ہے، آخرت میں جنت کی سعادت تو انہی کو حاصل ہوگی۔

اس سلسلہ میں ہم اگر اپنا جائزہ لیں گے تو معلوم ہوگا کہ ان دونوں بیماریوں کے جراثیم ایسے ہیں، جس سے ہم محفوظ نہیں، بڑاپن، دوسروں کی تحقیر، بڑے مسئلے سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے مسئلوں پر گھروں، خاندانوں، دوستوں میں جھگڑا، انتشار اور فساد برپا کرنے کی کاوشیں ہمارا وتیرہ بن چکی ہیں۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہم میں سے بہت کم افراد ہیں، جو آخرت کے گھر کے مستحق بن سکیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جب تک مجاہدوں اور صحبت صالحہ کے ذریعہ باطن کی صفائی وتطہیر کا کام نہ ہوگا، محض علم وذہانت سے ان باطنی بیماریوں اور اس کے نتیجے میں فساد سے بچنا دشوار تر ہے۔

نفسی وشیطانی قوتوں سے مقابلہ کرکے، نفس کو مہذب بنانا اور اپنی شخصیت کو پامال کرنا اور اللہ کے بندوں کے لئے باعث خیر وبرکت ہونا آسان کام نہیں، یہ غیر معمولی مجاہدوں کا متقاضی ہے۔

آج ہماری اجتماعی زندگی جس قدر ہولناک فساد سے دوچار ہوگئی ہے، اس میں

بڑے پن کی بیماری، ضد، کینہ اور حسد وغیرہ کی وجہ سے فساد اور جھگڑا پیدا کرنے کی نفسیات کو بنیادی عمل دخل حاصل ہے، باطن کی تعمیر کے کام کو اہمیت دیئے بغیر اس فساد سے بچاؤ کی صورت پیدا نہیں ہوسکتی، ورنہ اس صورت میں آخرت سے محروم ہونے کا خطرہ لاحق ہوگا، تکبر اور فساد کے جراثیم کا تعلق باطن سے ہے، بدقسمتی سے اس دور کے سارے علوم وفنون کی تشکیل اس طرح ہوئی ہے کہ باطن کی وسیع ترین دنیا کا انکار ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ تکبر اور فساد نے ہمہ گیر صورت اختیار کر لی ہے، اس کی وجہ سے انسانیت موت کے سے حالات سے دوچار ہوگئی ہے، اہل دانش کی طرف سے اس پر غور وفکر کا سلسلہ بھی ختم ہے۔ (مرتب)

أَحَسِبَ النَّاسُ أَن يُتْرَكُوا أَن يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ۔ (سورۃ العنکبوت، آیت نمبر۲)

(کیا ان لوگوں نے خیال کر رکھا ہے کہ وہ اتنا کہنے سے چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لے آئے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا)۔

مجاہدوں کے بغیر مدارج سلوک طے نہیں ہوتے

اس میں دلالت ہے کہ مجاہدہ مقصود کے حصول کے لئے شرائط میں سے ہے، اگرچہ وہ اضطراری ہی ہو۔

تشریح:

دنیا کے سارے علوم وفنون کے حصول کے لئے مجاہدے شرط ہیں، پرائمری تعلیم سے لے کر ایم اے تک کی تعلیم ہی کے لئے ۱۴-۱۵ سال لگ جاتے ہیں، اس کے بغیر ایم اے کی ڈگری نہیں ملتی، اسی طرح ذکر وفکر کے ذریعہ نفسی قوتوں کو پامال کرنے، ان کے زور اور شدت کو توڑنے اور اللہ کے قرب کا انعام حاصل کرنے کے لئے بھی کم از کم پندرہ بیس سال تک کے مجاہدے چاہئے، اس کے بغیر عام طور پر نفس مہذب نہیں ہوتا، اور اس کے سنورنے کی صورت پیدا نہیں ہوتی، حب جاہ وحب مال کے جذبات واحساسات کی بنیاد منہدم نہیں ہوتی، کامیابی کے لئے مجاہدے شرط اول ہیں، مجاہدوں کے بغیر فرد کو خلافت مل سکتی ہے، بزرگی کی سند بھی اور بزرگی کی حیثیت سے اسے شہرت بھی حاصل ہوسکتی ہے،

لیکن اس کے حب جاہ وحب مال کے جذبات پامال نہیں ہوتے اور راہ سلوک کے مراحل طے نہیں ہوتے، یہ نکتہ ایسا ہے جس پر سارے اکابر بزرگوں کا اتفاق ہے، سارے بزرگوں کا ذکر وفکر کے مجاہدوں پر زور ہے، اس لئے کہ اخلاص، للھیت، بے نفسی اور اللہ سے مستحکم تعلق کا انحصار مجاہدوں ہی سے وابستہ ہے، دکھ کی بات ہے کہ مجاہدوں کی اس اہمیت کے باوجود آج کل تصوف کی نامور شخصیتوں نے سلوک سے مجاہدوں کو ختم کرکے، ایک آدھ تسبیح تک محدود کردیا ہے، یہ سلف کی راہ سے انحراف ہے، مزید دکھ کی بات یہ ہے کہ حکیم الامت کے سلسلہ سے وابستہ متعدد بزرگوں نے سلسلوں میں مروجہ ذکر وفکر کے مجاہدوں کو لگ بھگ ختم کردیا ہے، اس صورت میں افراد معاشرہ کی اصلاح ہوگی تو کیسے ہوگی؟ (مرتب)

وَمَن جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ. (سورۃ العنکبوت، آیت نمبر ٦)

(جو شخص محنت کرتا ہے وہ اپنے لئے ہی کرتا ہے)۔

عُجب کی روک تھام

اس میں مجاہدے کے بعد عُجب (خود پسندی) ودعویٰ کے استحقاق کی روک تھام ہے۔

تشریح:

نفسی قوت اتنی شدید ہے کہ فرد جوں جوں اللہ کے لئے ذکر وفکر کے مجاہدے کرتا ہے، اسی مناسبت سے نفس کے حملوں میں شدت آتی رہتی ہے، طویل عرصے تک پوری مستقل مزاجی سے اس کا مقابلہ کرکے، اسے مکمل طور پر اللہ ورسول کے تابع کرنا پڑتا ہے، درمیان میں نفس کی طرف سے اپنے بزرگ بن جانے اور دوسروں کا مقتدا بن جانے کے جذبات ابھرتے رہتے ہیں، اگر فرد نے صحبت اور مجاہدوں کا عمل مسلسل جاری رکھا تو وہ نفس کے دعویٰ کی اکساہٹ سے بچ جائے گا، دوسری صورت میں وہ عُجب (خود پسندی) دعویٰ اور بزرگ بن جانے کے احساسات کی زد میں آکر، نفس وشیطان کا شکار ہوکر رہ جائے گا، بزرگی کے نام پر نفس وشیطان نے ان گنت افراد کو صراط مستقیم سے دور کر دیا، نفس کے اس طرح کے مکر وفریب سے بچنے کے لئے اہل اللہ کی مستقل صحبت غیر معمولی تاثیر رکھتی ہے، اس لئے کہ اس صحبت سے نفس پر جو طاقتور صحتمند شعائیں گرتی ہیں تو اس سے نفس کی شرارتوں اور اس کی اکساہٹ میں کمی آتی رہتی ہے، بالآخر ایک وقت ایسا آتا

ہے، جب نفسی قوتوں کا زور ٹوٹ جاتا ہے اور فرد کی یہ نفسیات بن جاتی ہے کہ وہ اللہ کی مخلوق میں اپنے آپ کو سب سے زیادہ سیہ کار سمجھنے لگتا ہے، یہ فنائیت کا مقام ہے، جس کے بعد سالک حالت بقا میں آتا ہے، یعنی فنائیت کے ساتھ اللہ سے باقی رہنے کی صلاحیت کا حامل ہونا۔

وَلَمَّا أَن جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطاً سِيْءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعاً وَقَالُوا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ. (سورۃ العنکبوت، آیت نمبر ۳۴)

(اور جب ہمارے وہ فرستادے لوط کے پاس پہنچے تو لوط ان کی وجہ سے مغموم ہوئے اور ان کے سبب تنگ دل ہوئے اور فرشتے کہنے لگے آپ اندیشہ نہ کریں اور نہ مغموم ہوں)۔

رنج وتکلیف کا کمال کے منافی نہ ہونا

اس سے ثابت ہوا کہ طبعی رنج وقلق کمال کے خلاف نہیں، جب کہ اس کے غیر شرعی تقاضے پر عمل شروع نہ کیا جائے۔

تشریح:

تکالیف ومصیبتوں کا اثر کسی حد تک اہل اللہ پر بھی ہوتا ہے، انہیں پریشانی لاحق ہوتی ہے، لیکن جوں ہی وہ ذکر کے ذریعہ اندر میں غوطہ زن ہوتے ہیں تو ذکر کے انوار سے ان کے سارے دکھ وغم کافور ہوجاتے ہیں، تکالیف کے وقت اہل اللہ کی پریشانی عام لوگوں کی پریشانی سے بالکل مختلف ہوتی ہے، وہ معمولی نوعیت کی پریشانی ہوتی ہے اور وہ جلد ہی دور ہوجاتی ہے، اس لئے کہ ذکر کے لئے غیر معمولی مجاہدوں کی وجہ سے ذکر کے انوار کا ذخیرہ ان کے دل میں موجود ہوتا ہے، دل کی طرف متوجہ ہونے سے یہ انوار سامنے آکر، ان کے احساسِ تکلیف کو دور کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ (مرتب)

اتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ. (سورۃ العنکبوت، آیت نمبر ۴۴)

(جو کتاب آپ پر وحی کی گئی ہے۔ اس کو پڑھا کیجئے اور نماز کی پابندی رکھئے، بے شک نماز بے حیائی اور ناشائستہ کاموں سے روک ٹوک کرتی رہتی ہے اور اللہ کی

یاد بہت بڑی چیز ہے)۔

تلاوت، نماز اور ذکر ومراقبہ کا سارے اعمال کی روح ہونا

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی قربت حاصل کرنے والے اعمال کے اصول یعنی تلاوت، نماز، ذکر ومراقبہ ان تینوں کا ذکر ہے، باقی تمام اعمال انہی کے تابع ہیں۔

تشریح:

تلاوت، نماز ذکر ومراقبہ یہ تینوں چیزیں ایسی ہیں، جس سے فرد ایمانی اعتبار سے طاقتور سے طاقتور تر ہوجاتا ہے، اللہ کی محبت غالب ہونے لگتی ہے، آخرت کی فکرمندی اور اس کی تیاری کا احساس ہمہ وقت موجود ہونے لگتا ہے، ہر طرح کی برائی سے نفرت پیدا ہونے لگتی ہے، سارے پاکیزہ اعمال انہی تینوں چیزوں سے صادر ہوتے ہیں، لیکن صوفیاء کے ہاں ترتیب یہ ہے کہ نماز میں فرض، واجب وسنتوں کے بعد ذکر ومراقبہ کو سب سے زیادہ فیصلہ کن اہمیت حاصل ہے، ذکر ومراقبہ کے لئے طالب جتنا بھی وقت نکالے، وہ کم ہے، اس لئے کہ ذکر کے ملکہ سے ہی فرد کو استقامت واستحکام نصیب ہوتا ہے، البتہ آخر میں مزید ترقی قرآن پر غور وفکر اور نماز سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ (مرتب)

وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ. (سورۃ العنکبوت، آیت نمبر ۴۶)

(اور تم اہل کتاب کے ساتھ بجز مہذب طریقہ کے مباحثہ مت کرو)۔

مخالف کے ساتھ معاملہ کی صورتیں

یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ اول مخالف کے ساتھ نرمی برتی جائے، جب دشمنی ظاہر ہو تو سختی کی اجازت ہے اور اللہ والوں کا مخالفین کے ساتھ یہی طریقہ ہے، باقی طالبین کے ساتھ دوسرا طرز ہے کہ عذر کی حالت میں نرمی اور عذر نہ ہونے کے وقت سختی کا طرز تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ کے ساتھ۔

تشریح:

مخالف کے ساتھ نرمی ضروری ہے، لیکن ایسا مخالف جو دشمنی پر اتر آیا ہو، اس سے

سختی کے بغیر اس کے نقصان سے بچنا دشوار ہے، تاہم اکابر صوفیا تحمل کے اس مقام پر فائز ہوتے ہیں کہ وہ ایسے دشمنوں سے بھی نرمی کا برتاؤ کرتے ہیں، البتہ دین کے مقاصد کی خاطر سختی کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، جو طالب، تربیت کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتا ہو، سمجھانے کے باوجود نہ سمجھے تو اس سے سختی اختیار کرنا ضروری ہے، غصہ کی صفت کے ہونے کا مثبت پہلو یہی ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے ضرورت کے وقت اس کے استعمال سے تربیت کے کام میں آسانی ہوتی ہے، اور حمیت دین کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ (مرتب)

وَمَا هَـٰذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَلَعِبٌ وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ . (سورۃ العنکبوت، آیت نمبر ۶۴)

(اور یہ دنیوی زندگی بجز لہو ولعب کے اور کچھ نہیں اور اصل زندگی عالم آخرت ہے، اگر ان کو علم ہوتا تو ایسا نہ کرتے)۔

دنیاوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دینا

یہ آیت دنیا سے بے رغبتی اختیار کرنے اور آخرت کے شوق کے بارے میں واضح ہے نیز دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے والے پر جہالت کا حکم ہے۔

تشریح:

دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کے شوق کے بغیر نہ تو ایمان کی تکمیل ہوتی ہے نہ ہی تہذیب نفس کا عمل مکمل ہوتا ہے، راہ سلوک میں جب تک دنیا سے بے رغبتی کا مزاج راسخ نہیں ہوتا، تب تک بزرگوں کی طرف سے خلافت نہیں ملتی، دنیا سے بے رغبتی اور چھوٹے پن کی صفات جب غالب آجاتی ہیں، یہی وقت ہوتا ہے، جب فرد کا نفس مہذب ہوتا ہے، ایسا فرد ہی دوسروں کی تربیت کا حامل ہوتا ہے۔

دنیا کو آخرت پر ترجیح دینا، ایسا عمل ہے، جسے جہالت کا عمل کہا جائے گا، ایسا فرد دنیا کی چند دنوں کی زندگی کی بہتری کی خاطر اپنی دائمی زندگی کو برباد کرنے کی راہ پر گامزن ہوتا ہے، جو سب سے بڑی جہالت اور بے وقوفی ہے، دانشمند انسان ایسا ہرگز نہیں کرسکتا، لیکن یہ دانشمندی اللہ سے والہانہ محبت کے نتیجہ میں ہی عطا ہوتی ہے، محض ظاہری علم اور عقل کو تیز کرنے سے حاصل نہیں ہوسکتی۔

فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ. (سورۃ العنکبوت، آیت نمبر۶۵)

اخلاص میں استقامت کے بغیر کام نہیں بنتا

ان کا یہ اخلاص اگر دل سے نہ تھا تب تو اس میں دلالت ہے کہ محض صورۃ (ظاہری) عمل کافی نہیں اور اگر دل سے تھا تو اس پر دلالت ہے کہ عمل کے بغیر استقامت کافی نہیں۔

تشریح:

اصل اخلاص وہ ہے، جس میں استقامت حاصل ہو، وقتی طور پر کسی ایک آدھ عمل میں اخلاص ہونا اور دوسرے اعمال میں دل کا اخلاص سے خالی ہونا، اس طرح کا اخلاص بے فائدہ ہے، دل کا اخلاص سے سرشار ہونا، اہل اخلاص کی صحبت اور ذکر وفکر کے غیر معمولی مجاہدوں کا متقاضی ہے، چونکہ اخلاص کے بغیر اعمال کی قبولیت مشکوک ہوجاتی ہے اور ریا غالب ہوجاتی ہے یا اس کی آمیزش موجود ہوتی ہے، اس لئے اخلاص میں استقامت ورسوخ کے لئے جتنے بھی مجاہدے کرنے پڑیں،وہ کم ہیں، ذکر وفکر کے مجاہدوں کے بغیر اخلاص میں پائداری حاصل نہیں ہوتی، اخلاص ہر وقت درکار ہے، اور وہ چوبیس گھنٹے کا عمل ہے، اس طرح کے اخلاص کے حصول کے لئے بندہ مؤمن کو عرصے تک راہ محبت میں چلنا پڑتا ہے۔ (مرتب)

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ. (سورۃ العنکبوت، آیت نمبر۶۹)

(اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستے ضرور دکھاتے ہیں، بیشک اللہ تعالیٰ ایسے خلوص والوں کے ساتھ ہے)۔

مجاہدہ، مشاہدہ کا ذریعہ ہونا

اس میں دلالت ہے کہ مجاہدہ، مشاہدہ کی مفتاح (چابی) ہے۔

تشریح:

یہ آیت راہ محبت میں حوصلہ وہمت اور مستقل مزاجی سے چلنے والوں کے لئے

خوشخبری کی آیت ہے کہ ذکر وفکر کے مجاہدوں کے نتیجہ میں انہیں مشاہدے کی نعمت حاصل ہوکر رہے گی، یہ اللہ کا وعدہ ہے، اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔

لیکن مشاہدہ یا وصال کی خوشخبری انہی افراد کے لئے ہے، جو اللہ کے لئے مشقیں برداشت کرنے کے لئے تیار ہوں اور تھکنے کا نام نہ لیں اور مشقیں بھی ایسی کہ دوسرے سارے کاموں کو اس کام کے مقابلہ میں ذیلی وثانوی حیثیت دیں۔ دوسرے سارے کاموں کو مجاہدوں کے کام کے تابع کردیں۔ یعنی اللہ کی محبت میں ایسے فداکارانہ انداز سے چلیں کہ بس ہمہ وقت اللہ کے مشاہدے اور وصال کی فکر ہی ان پر غالب رہے۔

یہ نعمت، نفسی قوتوں کو اللہ کے لئے پامال کرنے سے وابستہ ہے۔ جب تک نفسی قوتیں اور ان کی خواہشات کا زور موجود ہے، تب تک طالبوں کو یہ نعمت حاصل نہیں ہوسکتی، مشاہدے کی راہ میں اصل رکاوٹ نفسی قوتیں ہی ہیں۔

نفسی قوتیں فرد کو دنیا پر ٹوٹ پڑنے کے لئے اکساتی رہتی ہیں، جب کہ اللہ کے ذکر وفکر کے ان تھک مجاہدے فرد کو محبوب کے وصال کی راہ پر گامزن کرتے ہیں۔

ان مجاہدوں کے دوران نفس مسلسل بزرگ بننے کی باتیں القا کرتا رہتا ہے اور یہ بھی کہ اب بہت ہوچکا، اب تو جسمانی توانائیاں بھی مضمحل ہوچکی ہیں، اس لئے اب بس کرو اور مجاہدوں کی بجائے اب بزرگی کی مسند پر فائز ہوجاؤ۔

اس طرح نفس، ان گنت افراد کو اللہ کی محبت کی راہ سے دور کرنے، بزرگی کے ذریعہ دنیا کمانے اور شہرت کی راہ پر گامزن کرنے کا ذریعہ بنتا رہا ہے۔

حقیقی طالب، نفس کے اس مکر وفریب میں نہیں آتا، وہ مسلسل مجاہدوں کے ذریعے بالآخر نفس کو مات دینے، اس کی خواہشات کے زور کو توڑنے اور دنیا ومادیت کے جذبات کو پامال کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

اس طرح کے غیر معمولی مجاہدوں کی بدولت ہی اللہ کی طرف سے مشاہدے اور وصال کی نعمت کے حصول کا وعدہ ہے۔

اس دور میں جب کہ لگ بھگ ہر فرد دنیا چاہتا ہے، اور اس کی تگ ودو میں مصروف ہے۔ راحت کے مادی سامان نے اسے فریفتہ کردیا ہے، اور اس کی شب وروز کی جدوجہد دنیا اور مادی سامان کے حصول کی جدوجہد میں صرف ہورہی ہے، ایسے حالات میں اللہ کو

مقصود بنانے والا طالب جو شب وروز محبوب کے لئے ذکروفکر کے مجاہدوں سے کام لیتا ہے، اس سے بڑھکر خوش نصیب کون ہوسکتا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ اس عاجز وسیاہ کار کوبھی اپنے وصال ومشاہدے کی یہ راہ نصیب فرمائے۔ آمین (مرتب)

يَعْلَمُونَ ظَاهِراً مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَافِلُونَ. (سورۃ الروم، آیت نمبر ۷)

(یہ لوگ صرف دنیوی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں اور یہ لوگ آخرت سے بے خبر ہیں)۔

دنیا کے مال ومتاع کو فیصلہ کن اہمیت دینا

اس آیت میں اس شخص کی جہالت کا اظہار ہے، جو اپنی نظر کو صرف دنیا کے مال ومتاع کا محتاج رکھتا ہے اور آخرت جو کہ مقصود ہے اس سے غافل ہے۔

تشریح:

آخرت سے غفلت اور دنیا میں انہاک کی بیماری سب سے بڑی بیماری ہے، انسانی زندگی اور معاشرے میں پیدا ہونے والے فساد کا سب سے بڑا اور اصل محرک یہی ہے، نفس، دنیا کی راحت اور نعمت کے سامان سے کسی طور دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں، غریب ہو یا امیر، اہل علم ہو یا جاہل، ہر فرد عام طور پر مادی زندگی کی بہتری، خوشحال زندگی اور دنیا کی ساری نعمتوں سے متمتع ہونے کے جنون میں مبتلا رہتا ہے، ان کی ساری سرگرمیوں اور سوچ کا مرکز مادی زندگی کا بہتر مستقبل ہوتا ہے، آخرت کی زندگی چونکہ بظاہر نظر نہیں آتی، وہ غیبی مسئلہ ہے اور دنیا نقد سودہ ہے، اس لئے آخرت پر ایمان ہونے کے باوجود عملی زندگی میں آخرت کی تیاری وفکر مندی نہ ہونے کے برابر ہے، دنیا کی زندگی اگرچہ بہت مختصر ہے، لیکن اس کی فکرمندی ایسی ہوتی ہے، گویا یہاں ہزارہا سال رہنا ہے۔ (مرتب)

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجاً لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً. (سورۃ الروم، آیت نمبر ۲۱)

(اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے واسطے تمہاری جنس کی

بیبیاں بنائیں تاکہ تم کو ان سے آرام ملے اور تم میاں بیوی میں محبت پیدا کی)۔

بیوی کی طرف میلان عمدگی کے خلاف نہیں

(اس میں دلالت ہے اس پر کہ بیبیوں کی طرف میلان ہونا حق تعالیٰ کے احسانات میں سے ہے، کیونکہ یہ شکر کا موقعہ ہے، پس اس سے معلوم ہوا کہ یہ میلان کمال کے خلاف نہیں، جیسا کہ بعض خشک زاہد سمجھتے ہیں۔

تشریح:

اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کے تسلسل کا نظام زوجین کے میلاپ سے قائم رکھا ہے، اس لئے میاں بیوی کے درمیان ایک دوسرے سے تعلق وصحبت کا طاقتور داعیہ رکھا ہے، جنسی جذبہ ایک فطری جذبہ ہے، جسے کسی طور پر ختم نہیں کیا جاسکتا، مرد وعورت کے درمیاں جب اللہ کے نام کا واسطہ آتا ہے اور نکاح میں اللہ کا واسطہ ہوتا ہے، تو وہ ایک دوسرے سے محبت کے رشتہ میں منسلک ہوجاتے ہیں، اس طرح شادی کا رشتہ دنیا میں انسانی تسلسل کے قائم رکھنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ (مرتب)

وَإِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُم مُّنِيبِينَ إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا أَذَاقَهُم مِّنْهُ رَحْمَةً إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُم بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُونَ. (سورۃ الروم، آیت نمبر ۳۳)

(اور جب لوگوں کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے (اپنے رب کی طرف سے) تو اسی کو رجوع ہوکر پکارنے لگتے ہیں، پھر جب ان کو اپنی طرف سے کچھ عنایت کا مزہ چکھا دیتے ہیں تو ان میں سے بعض لوگ اپنے رب کے ساتھ شرک کرنے لگتے ہیں)۔

انسان کی طبیعت کا

ہدایت اور گمراہی سے مرکب ہونا

اس میں اشارہ ہے کہ انسان کی طبیعت ہدایت اور گمراہی سے مرکب ہے، مصیبت کے وقت ہدایت کا ظہور ہوتا ہے اور مصیبت دور ہونے کے بعد گمراہی کا۔

تشریح:

انسانی نفس بڑی حیرت انگیز قوت کا حامل ہے، جب وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہوتا

ہے تو فطرت سلیمہ کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے وہ خالص اللہ کو پکارتا ہے اور اپنی مشکلات کی دوری کے لئے اسی کی طرف رجوع ہوتا ہے، بیماری ہو، یا معاشی تنگی یا کوئی حادثہ ہو، اس وقت اسے اللہ ہی یاد آتا ہے، اور گڑگڑا کر اسی سے مانگتا ہے۔

لیکن جوں ہی اللہ اس کی مصیبت کو ٹال دیتے ہے اور اس کے لئے حالات بہتر ہوجاتے ہیں اور وہ بہتر صحت یا معاشی اعتبار سے نوازا جاتا ہے تو وہ نہ صرف اللہ سے غافل ہوجاتا ہے، اسے بھول جاتا ہے، بلکہ نفس کی قوت اسے خواہشات میں مبتلا کر کے، اسے اللہ سے دور تر کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ یہ لگ بھگ ہر انسان کی حالت ہے، سوائے متقی لوگوں کے۔

دولت کا نشہ، معاشی خوشحالی کا فریب، افسری اور حکمرانی کے حجابات، راحت کا سامان وغیرہ ان چیزوں میں اللہ سے دوری، غفلت اور بیزاری کی ایسی خصوصیات موجود ہیں جو فرد میں انانیت اور خودسری کا مزاج پیدا کردیتی ہیں اور مادیت میں اس کے انہماک کو اتنا زیادہ کردیتی ہیں کہ اللہ کے ذکر اور اس کی عبادت کے کام کو وہ کام ہی نہیں سمجھتا۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو فرد کے لئے مادی خوشحالی، مال ومرتبہ اور معاشرے میں ملنے والی حیثیت یا حکمرانی وافسری ایک اعتبار سے عتاب کی حیثیت رکھتی ہے کہ اس سے فرد عام طور پر سرکشی کی راہ پر گامزن ہونے لگتا ہے۔ یہ ساری چیزیں اس کے لئے حجاب اکبر بن جاتی ہیں۔ جب کہ مصائب، مشکلات اور تکالیف انعام کی حیثیت رکھتی ہیں کہ اس وقت فرد کو اپنی اصل حیثیت کا ادراک ہوتا ہے، یہ مصائب اسے اللہ سے مانگنے اور اس کے در پر جھکانے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اگرچہ مصائب ومشکلات مانگنے نہیں چاہئے، لیکن سرکش افراد کے لئے مصائب ایک اعتبار سے رجوع الی اللہ کا ذریعہ بن جاتے ہیں، لیکن جب مصائب سے نجات ملتی ہے تو وہی انسان جو اللہ کی طرف رجوع ہوا تھا، وہ نفس اور مادی قوتوں کے زیر اثر پھر اللہ کو بھول جاتا ہے، اور مادیت میں مستغرق ہوجاتا ہے۔ (مرتب)

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُم بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ. (سورۃ الروم، آیت نمبر ۴۱)

(لوگوں کے اعمال کے سبب خشکی اور تری میں بلائیں پھیل رہی ہیں، تاکہ اللہ تعالی

ان کے بعض اعمال کا ان کو مزہ چکھادے، تاکہ وہ باز آجائیں)۔

برے اعمال کی سزا سے مقصود اصلاح کرنا ہے

اللہ تعالی کا اپنے بندوں کو برے اعمال کی وجہ سے سزا دینا مقصود نہیں، اس سے سزا نہیں، بلکہ اصلاح کرنا مقصود ہے۔

تشریح:

دنیا میں جو سزا ملتی ہے، وہ اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے، اس سے مقصود افراد کو جھنجھوڑنا، بیدار کرنا اور صالح اعمال کی طرف لانا اور اپنے محبوب حقیقی سے تعلق کو قائم اور مستحکم کرنا ہے، اس سزا سے مقصود فرد وافراد کی اصلاح ہے، مقصود سزا نہیں، انسان کا بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ عام طور پر سزا کے باوجود گناہوں سے باز آنے اور اصلاح کی طرف آنے کے لئے تیار نہیں، اس کا بنیادی سبب خواہشات کی طاقتور عادتیں اور نفسی قوتوں کی مضبوط گرفت ہوتی ہے۔ (مرتب)

أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ. (سورۃ لقمان، آیت نمبر ۱۴)

(کہ تو میری اور اپنے ماں باپ کی شکر گزاری کیا کر میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے)۔

نعمت کا واسطہ بننے والوں کا شکریہ ادا کرنا

اس میں تصریح ہے کہ نعمت کا واسطہ بننے والے کا شکریہ ادا کرنا گویا نعمت عطا فرمانے والے کا شکریہ ادا کرنا ہے، اس واسطہ میں والدین، استاد اور پیر سب آگئے، البتہ شریعت کی مخالفت کے وقت ان کا اتباع جائز نہیں۔

تشریح:

والدین، استاد اور مرشد وغیرہ کی طرف سے ملنے والی نعمتیں اہم ہوتی ہیں، فرد انہی کے سہارے زندگی میں آگے بڑھتا ہے اور ارتقا کرتا ہے، مادی ترقی ہو یا روحانی ترقی، یہ والدین، استاد اور مرشد کی مرہون منت ہوتی ہیں، اس لئے ان کے ذریعہ سے حاصل ہونے والی نعمتوں کی شکر ادائیگی ضروری ہے، ان کی شکر ادائیگی دراصل اللہ ہی کی شکر

ادائیگی ہوتی ہے، ان تینوں کے علاوہ ہر احسان کرنے والے کا شکریہ ادا کرنا گویا اللہ کا شکر کرنا ہے، اس کو اللہ نے ہی ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ (مرتب)

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحاً إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ . (سورۃ لقمان، آیت نمبر ۱۸)

(اور لوگوں سے اپنا رخ مت پھیر اور زمین پر اترا کر مت چل، بیشک اللہ تعالیٰ کسی تکبر کرنے والے فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتے)۔

اخلاق کی تعلیم

یہ آیت اصلاح کے مختلف قسموں میں سے ہے، اس میں بعض احکام میں اخلاق کی تعلیم ہے۔

حافظ فضل الرحیم مدظلہ، اسے ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

بہترین اخلاق یہ ہیں کہ لوگوں سے میل جول ہو اور عجز اور انکساری ہو، اور بات کرنے میں اچھے الفاظ اور نرمی اختیار کرے، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ ادائیں ہیں۔

تشریح:

لوگوں سے میل جول، روابط وتعلقات کے وقت بہتر اخلاق کا مظاہرہ کرنا، ان کی الٹی سیدھی باتوں کے باوجود ان سے حسن سلوک اور نرمی کا معاملہ کرنا، یہ انسانیت کے شایان شان اخلاق ہیں، لیکن انسانی شخصیت ان اوصاف سے صحیح معنیٰ میں اس وقت بہرہ ور ہوسکتی ہے، جب وہ اپنی خالق ومالک ہستی سے بہتر تعلقات استوار کرے اور اس کے حقوق ادا کرنے کے قابل ہوگی، یہ بہتر تعلقات ذکر وفکر اور عبادت کے ذوق وشوق کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتے، جو شخص اپنے خالق ومالک اور اپنی سب سے بڑی محسن ہستی کے کم سے کم حقوق ادا کرنے کے قابل نہیں، وہ لوگوں کے حقوق ادا کرنے اور ان سے بہتر سلوک کرنے کی صلاحیتوں کا حامل ہوسکے، ممکن نہیں، پاکیزہ اخلاق حسنہ کا حامل ہونے کے لئے اپنی محبوب ترین ہستی سے والہانہ محبت کا تعلق قائم کرنا ناگزیر ہے، یہی چیز ہے جو فرد وافراد کو حسین اخلاق کا حامل بناتی ہے، عام طور پر مذہبی لوگوں سے یہ شکایت

ہوتی ہے کہ وہ اخلاقی بلندی کے حامل نہیں، سختی ان کے مزاج کا حصہ ہے، اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ان کی مذہبیت رسمی نوعیت کی ہوتی ہے، وہ محبوب حقیقی سے والہانہ محبت کا تعلق قائم کرنے میں ناکام ہوتے ہیں۔

وَمَن كَفَرَ فَلَا يَحْزُنكَ كُفْرُهُ إِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُم بِمَا عَمِلُوا . (سورۃ لقمان، آیت نمبر ۲۳)

(جو شخص کفر کرے، آپ کے لئے اس کا کفر باعث غم نہ ہونا چاہئے، ان سب کو ہمارے ہی پاس لوٹنا ہے، سو ہم ان کو جتلا دیں گے جو کچھ انہوں نے کیا ہے)۔

اصلاح میں مبالغہ سے کام نہ لینا

اس میں دلالت ہے کہ لوگوں کی اصلاح کے سلسلہ میں زیادہ مبالغہ نہ کرے۔

تشریح:

حقیقی شیخ ہر فرد کی استعداد کے مطابق اس کی بتدریج تربیت کرتا ہے، اور اسے ذکر دیتا ہے، آدھے گھنٹے کا ذکر کرنے کی صلاحیت رکھنے والے فرد کو وہ دو گھنٹے کا ذکر نہیں بتاتا، لیکن اس کے باوجود طالب اگر شیخ کی ہدایات پر عمل پیرا نہیں ہوتا اور راہ فرار اختیار کرتا ہے، تو یہ بڑی محرومی کی بات ہے، اگر اس طرح کا طالب شیخ سے قریبی تعلق رکھتا ہو تو اس کے بھاگ جانے سے ایک حد تک صدمہ کا ہونا تو فطری بات ہے، لیکن شیخ کو اس کے درپے نہیں پڑنا چاہیے، اس کا کام اصلاح کی کوشش کرنا تھا، جو فرد اصلاح کے لئے تیار نہ ہو تو اسے چھوڑ دینا چاہیے، اس پر غمگین ہونے کی زیادہ ضرورت نہیں۔ (مرتب)

وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَى دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ. (سورۃ السجدہ، آیت نمبر ۲۳)

(اور ہم ان کو قریب کا عذاب بھی بڑے عذاب سے پہلے چکھا دیں گے تاکہ یہ لوگ باز آجائیں)۔

ادنیٰ عذاب کی تشریح

بعض نے کہا ہے کہ ادنیٰ عذاب دنیا کی حرص ہے، اور اکبر عذاب اس حرص پر جو

سزا ہوگی۔

تشریح:

ایک تو دنیاوی ضروریات ہیں، جن کے حصول کے لئے ایک حد تک معاشی جدوجہد ضروری ہے، لیکن مادی زندگی کی حرص وہوس یہ فرد کو دنیا پرست بنانے کی راہ پر گامزن کر دیتی ہے، موجودہ دور میں دنیا اس قدر خوبصورتی کے ساتھ سامنے آئی ہے کہ دل سے دنیا کی محبت، اس کی تمنا وآرزو کا نکلنا، سب سے زیادہ دشوار کام ہے، اس دور میں لگ بھگ ہر باصلاحیت فرد اپنی ساری توانائیاں دنیا کے حصول کی جدوجہد میں صرف کر رہا ہے اور اپنے دنیا کے بھرپور حصے سے دستبردار ہونے کے لئے کسی طرح تیار نہیں، دنیا کی یہ محبت وتمنا کثرت ذکر اور اہل اللہ کی صحبت کے بغیر نہیں نکل سکتی، اس لئے کہ جب دل غیر معمولی حسن سے فیضیاب ہوتا ہے تو اس کے بعد ہی وہ اس سے کم تر حسن سے دستبردار ہوسکتا ہے، اہل اللہ کی صحبت اور اللہ کے ذکر سے فرد بتدریج محبوب حقیقی کے حسن وجمال سے آشنا ہونے لگتا ہے، جس کی وجہ سے دنیا اور سامان دنیا اسے اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے، لیکن دنیا کی حرص ہر دور میں عمومی صورت اختیار کر جاتی ہے، یہ حرص معاشرے کے ہر مؤثر طبقے کو ایک دوسرے سے چھینا جھپٹی اور تصادم کی راہ پر لگا دیتی ہے، جس سے اللہ کی زمین فساد سے بھر جاتی ہے، یہ سب حرص وہوس ہی کا نتیجہ ہوتا ہے، اس کو یہاں ادنیٰ عذاب سے تشبیہ دی گئی ہے، آخرت میں اس کی جو سزا ہوگی، اسے عذاب اکبر فرمایا گیا ہے۔

اس ادنیٰ عذاب کی ایک بُری صورت یہ ہوتی ہے کہ دنیا میں قوموں کے درمیاں جنگیں ہوتی ہیں، افراد کے درمیاں فساد برپا ہوتا ہے، جس سے اللہ کی زمین فتنہ وفساد اور قتل وغارت سے بھر جاتی ہے، یہ سب حرص وہوس ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْفَتْحُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ. (سورۃ السجدہ، آیت نمبر ۲۸)

(اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم سچے ہو تو فیصلہ کب ہوگا)۔

بحث ومباحثہ سے بچنا چاہئے

یہاں مناظرے کا جواب نہ دینا اور اس سے دوری اختیار کرنے پر دلیل ہے اور

جھگڑے سے بچنے کی۔

تشریح:

بحث ومباحثہ عام طور پر نفس کی اس خواہش کا نتیجہ ہوتا ہے کہ میری بات اونچی رہے اور میرا علم اور میری شخصیت دوسروں پر فائق رہے، اگر شروع میں یہ جذبہ موجود نہ بھی ہو، اخلاص ہی ہو، لیکن بحث ومباحثہ جب آگے بڑھنے لگتا ہے تو اس میں نفسانیت بھی شامل ہونے لگتی ہے، اس کی وجہ سے معاملہ جھگڑے، کشیدگی اور تعلقات کی خرابی کی صورت تک پہنچ جاتا ہے، اس لئے صوفی بحث ومباحثے سے آخری حد تک احتیاط کرتا ہے، وہ حکمت وسلیقے سے حق بات کہتا ہے، اگر دوسری طرف سے ضد کی نفسیات کا مظاہرہ ہوتا ہے تو صوفی صورتحال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے پیچھے ہٹ جاتا ہے اور اس سے یک طرفہ طور پر معذرت ومعافی طلب کرتا ہے۔ (مرتب)

فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانتَظِرْ إِنَّهُم مُّنتَظِرُونَ. (سورۃ السجدہ، آیت نمبر ۳۰)

(سو ان کی باتوں کا خیال نہ کیجئے آپ بھی منتظر رہئے اور یہ بھی منتظر ہیں)۔

عارفین کے کمالات کا انکار کرنے والوں سے دوری اختیار کرنا

اس میں اشارہ ہے کہ جو لوگ عارفین اور سالکین کے کمالات کے منکر ہوں اور ان سے مذاق کرتے ہوں، جب ان کو نصیحت کرنا نافع نہ ہو تو ان کو ان کی حالت پر چھوڑنا مناسب ہے، ان کے ہلاک ہونے کا انتظار کرے کہ ان پر وبال ضرور آنے والا ہے۔

تشریح:

اہل اللہ جو اپنے آپ کو اللہ کے لئے فنا کر دیتے ہیں، وہ غیر معمولی مجاہدوں سے کام لے کر نفسی قوتوں کو اللہ کے تابع بنا دیتے ہیں۔ یہی اہل اللہ معاشرے کی کریم ہیں اور دنیا کی بقا کا ذریعہ بھی۔ ایسے اہل اللہ سے دشمنی اختیار کرنا، ان کی مخالفت کو وظیفہ بنانا اور اسے دینی خدمت کا اہم کام سمجھنا، اس سے ذہنیت اور نفسیات کی بہت بڑی خرابی کی نشاہی ہوتی ہے۔

اول تو فرد، اللہ کے لئے مجاہدوں سے کام نہیں لیتا، جو مجاہدے کر کے نفس کو مہذب بنانے میں بڑی حد تک کامیاب ہوتے ہیں، ان کی مخالفت کو اپنے اہداف میں شمار کرنا یا

اسے مزاج کا حصہ بنانا، یہ اللہ کے عتاب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

یہ بالکل ایسے ہیں، جیسے ایک مالک کے کئی ملازم ہوں، بعض ملازم رسمی نوعیت کی ڈیوٹی ادا کرتے ہوں، اور وقت سے بعد میں آتے ہوں اور سب سے پہلے جاتے ہوں، اور کام بھی سست رفتاری سے سرانجام دیتے ہوں، بعض ملازم ایسے ہیں، جو نہایت چستی سے کام کرتے ہوں اور اپنے مالک کے لئے اپنی ساری توانائیاں صرف کردیتے ہوں۔ اب پہلی نوعیت کے ملازم اگر دوسری نوعیت کے ملازموں کے خلاف غصہ اورنفرت کا اظہار کرتے ہوں اور ان کو بُرا بھلا کہتے ہوں تو ظاہر ہے وہ مالک کے عتاب کا شکار ہوں گے اور سزا بھگتیں گے۔

یہاں بھی یہی حالت ہے، بعض لوگوں نے بڑی خوبصورت طریقے سے اہل اللہ کی مخالفت کو وتیرہ بنایا ہوا ہے، ایسے لوگوں کو اپنے انجام سے ڈرنا چاہئے کہ وہ اللہ کے دوستوں کی دشمنی کی وجہ سے اللہ کو چیلنج دے رہے ہوتے ہیں۔

اہل اللہ کا قصور کیا ہے، جس کی وجہ سے ان کے خلاف محاذ کھڑا کیا جاتا ہے۔ ان کا قصور یہ ہے کہ وہ اللہ کے اسم ذات کا قلبی یا جہری ذکر کرتے ہیں، ان کا دوسرا قصور یہ ہے کہ وہ مادیت کی دلدل میں پھنسے ہوئے افراد کو اللہ کی محبت کی راہ میں لاکر، ان سے بھی ذکر کرواتے ہیں، اس طرح ان کی زندگی کی کایا پلٹ جاتی ہے، لیکن عقلیت کے زعم کے شکار افراد کو یہی چیزیں اہل اللہ کا جرم نظر آتی ہیں، ایسے لوگوں کو دل کی صلاحیتوں کو بیدار کرکے، اپنی حرکتوں سے باز آنا چاہئے، ورنہ ان کے لئے محبوب کے عتاب سے بچنا مشکل ہے، کیا یہ عتاب کم ہے کہ ان کی باطنی آنکھیں بند ہوگئی ہیں اور وہ باطنی بیماریوں میں مبتلا ہوکر، قلبی وذہنی سکون سے محروم ہیں اور مخالفت برائے مخالفت کو انہوں نے زندگی کے اہداف میں شمار کرلیا ہے۔

اللہ کے محبوں اور عارفوں کی مخالفت کو وتیرہ بنانے والوں سے تعلقات قائم رکھنا یا ان سے میل جول رکھنا، یہ خطرے کی بات ہے، اس لئے کہ اہل اللہ کی مخالفت کرنا، ان کی نفسیات کا حصہ بن جاتا ہے، ان کا تصورِ دین، انہیں اہل اللہ کے کمالات کے انکار پر اکساتا ہے، اس لئے کہ اس طرح کے افراد کی صحبت یا دوستی کا لازمی نتیجہ ان کی فکر سے متاثر ہونا ہے، اس لئے سخت احتیاط کی ضرورت ہے، عارفین یا بزرگی کے نام پر اس وقت جو لوگ مشہور ہیں، ان کی مخالفت اہل اللہ کی مخالفت نہیں، یہ شخصیتیں تو بزرگی کے نام پر

دکانداری چمکانا چاہتی ہیں، حقیقی اہل اللہ، جو اللہ کی محبت میں مستغرق ہیں اور جو فقر وزہد کی حال ہیں اور اسلامی شریعت کی مکمل حامل ہیں، ایسے اہل اللہ کی مخالفت کا مطلب ان کے فیوض وبرکات، اخلاص وللہیت سے محرومی ہے، یہ محرومی بھی ایک طرح تو عذاب کی صورت ہے، بظاہر زبان پر اسلام ہے، کچھ رسمی مراسم بھی موجود ہیں، لیکن باطن، بیماریوں اور حب جاہ وحب مال سے بھرا ہوا ہے، اہل اللہ کی مخالفت کی یہ بھی سزا ہے، جو افراد کو ملتی ہے کہ وہ زندگی بھر باطنی اصلاح سے محروم رہتے ہیں۔ (مرتب)

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّن قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِه. (سورۃ الاحزاب، آیت نمبر ۴)

(اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کے سینے میں دو دل نہیں بنائے)۔

نفس کا بیک وقت

دوطرف متوجہ نہ ہونا

اس میں اس قول کی اصل ہے کہ نفس بیک وقت دو طرف متوجہ نہیں ہوتا، اس پر بہت سے مسائل کی بنیاد رکھی گئی ہے، مثلاً وسوسہ کا علاج یہ کیا گیا ہے کہ ذکر کی طرف متوجہ ہوا جائے اور یہاں اس شخص کا جھوٹا ہونا ثابت ہوتا ہے، جو تسبیح بھی پھراتا رہتا ہے اور باتیں بھی کرتا رہتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ میں باتوں میں مشغولیت کے باوجود ذکر کرتا ہوں۔

تشریح:

انسانی نفس کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بیک وقت دوطرف توجہ نہیں کرتا، جس طرح نگاہیں بیک وقت اوپر بھی ہوں، نیچے بھی ہوں، مغرب کی طرف بھی دیکھیں اور مشرق کی طرف بھی، ایسا نہیں ہوتا، تسبیح کو ہاتھ میں لیتے ہوئے باتیں کرتے رہنا پھر اپنے آپ کو ذکر کرنے والوں میں شمار کرنا یہ غلط ہے، یہ نفس کی چال ہے کہ وہ فرد کو بزرگ اور ذاکر کی حیثیت سے معاشرے میں متعارف کرانا چاہتا ہے۔

اوّل تو مبتدی کا نفس طاقتور ہوتا ہے، وہ اس طرح کی حرکتوں کے ذریعہ فرد کو بزرگ بنانے کی راہ پر گامزن کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ فرد کو ذکر کا وہ مقام حاصل ہوجائے، جہاں اللہ سے غفلت نہ ہو، اس کے لئے صبر آزما مجاہدوں سے کام لینا پڑتا ہے، اندر میں

ذکر کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع کرنا پڑتا ہے کہ دنیاوی مصروفیات فرد کے دل کو ذکر سے غافل نہ ہونے دیں، یہ بہت بڑا مقام ہے، جو آسانی سے حاصل نہیں ہوتا، اس کے لئے زندگی کا قابل ذکر حصہ راہ سلوک میں چل کر ذکر کے ملکہ کو راسخ کرنا پڑتا ہے، اس کے بغیر دل کی توجہ دوسرے کاموں کے ساتھ ساتھ اللہ کی طرف بھی متوجہ ہو، دشوار تر ہوتا ہے۔

قرآن میں ایسے لوگوں کی تعریف کی گئی ہے، جنہیں خرید وفروخت اور کاروباری مصروفیات اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتی۔ یہ مقام اللہ کے فضل خاص اور ذکر وفکر کے غیر معمولی مجاہدوں کے نتیجہ میں ہی حاصل ہوتا ہے۔ (مرتب)

هُنَالِکَ ابْتُلِیَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالاً شَدِیْدا. (سورۃ الاحزاب، آیت نمبر۱۱)

(اس موقعہ پر مسلمانوں کا امتحان کیا گیا اور سخت زلزلہ میں ڈالے گئے)۔

مصیبتوں میں قبض

جیسی چیزوں کا شامل ہونا

اس سے معلوم ہوا کہ مصیبتوں کا پیش آنا اور ان میں باطنی پسندیدہ چیزیں مثلاً قبض وغیرہ بھی شامل ہے، کبھی یہ مصیبت صدق (سچائی کے) امتحان کے لئے ہوتی ہے، بس اس حالت میں سالک پر واجب ہے کہ صبر سے کام لے اور اطاعت پر ثابت قدم رہے۔

تشریح:

مصیبتیں بالخصوص باطنی طور پر ناسازگار حالات کا ہونا، کبھی قبض واضطراب کا ہونا، کبھی ساری کوششوں کے باوجود ذکر میں کیفیات کا نہ ہونا، کبھی گھنٹوں ذکر کرنے معاً بعد بے چینی کا شروع ہونا، یہ ساری چیزیں ایسی ہیں، جو متوسط طالب کو اکثر پیش آتی رہتی ہیں، یہ چیزیں طالب کے لئے امتحان کی حیثیت رکھتی ہیں، طالب کو عرصہ تک ان حالات سے گذرنا پڑتا ہے۔ اس کے بغیر اس کا سلوک طے نہیں ہوتا۔ اس لئے راہ سلوک میں طالب کو حوصلہ، ہمت اور صبر سے کام لے کر اپنے آپ کو محبوب کے سپرد کرنا پڑتا ہے کہ وہ اسے جس طرح کے حالات وکیفیات میں بھی رکھے، یہ اس کا فضل ہے، اللہ محبوب طالب کے صدق کا امتحان لے کر ہی اسے اپنے وصال کی نعمت عظمیٰ عطا کرتا ہے۔

راہ محبت میں صبر سے کام نہ لینا اور کیفیات وحالات کے مدوجزر سے پریشان ہوکر راہ محبت سے فرار کی راہیں تلاش کرنا، یہ امتحان میں ناکامی سے عبارت ہے۔

ایسے افراد کو نہ صرف یہ کہ قرب اور وصال کی دولت نصیب نہیں ہوتی، بلکہ بے صبری اور فرار کی وجہ سے انہیں نفسی قوتوں کے حوالہ کیا جاتا ہے۔

طالب کو یہ نکتہ سمجھکر مستقل مزاجی سے چلتے رہنا چاہئے۔ دونوں جہانوں کی سعادت اسی سے وابستہ ہے، اس لئے کہ ان مراحل سے گذر کر ہی نفس قابو میں آتا ہے، دوسری صورت میں نفسی قوتوں میں تلاطم موجود ہوتا ہے۔ اشتعال، ضد، حسد وکینہ اور حب جاہ وحب مال سے بچت کی صورت حالت فنا کے غلبہ سے وابستہ ہے، جو ہر طرح کے حالات میں مجاہدوں سے تعلق رکھتا ہے۔

وَلَمَّا رَاَی الْمُؤْمِنُونَ الْاَحْزَابَ قَالُوا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّا اِیْمَاناً وَتَسْلِیْماً. (سورۃ الاحزاب، آیت نمبر۲۲)

(اور جب ایمانداروں نے ان لشکروں کو دیکھا تو کہنے لگے کہ یہ وہی ہے جس کی ہم کو اللہ اور رسول نے خبر دی تھی اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ فرمایا تھا اور اس سے ان کے ایمان میں اور ترقی ہوئی)۔

ناپسندہ چیزوں کا

کاملین کے لئے معارف میں اضافہ کا ذریعہ ہونا

اس میں دلالت ہے ناپسندیدہ چیزیں جس میں قبض (بے چینی) بھی شامل ہے، وہ کاملین کے لئے کبھی معارف میں اضافہ کا سبب ہوتا ہے۔

تشریح:

قبض (بے چینی) اور کیفیات میں ادل بدل یہ ایسی چیز ہے، جو کاملین سے بھی وابستہ ہے، انہیں بھی اس سے سابقہ پڑتا ہے، اگرچہ غیر معمولی مجاہدوں اور طویل عرصے تک حالت قبض میں رہنے، اور حالت فنا سے حالت بقا میں آنے کی وجہ سے ان کا قبض زیادہ سخت نہیں ہوتا، اور اس قبض میں خود ایک طرح کی لذت پوشیدہ ہوتی ہے۔ ان کا قبض ان کے درجات کی بلندی کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے اور معارف میں

اضافہ کا بھی۔ (مرتب)

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ إِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحاً جَمِيلاً . (سورۃ الاحزاب، آیت نمبر ۲۸)

(اے نبیؐ آپ اپنی بیبیوں سے فرمادیجئے کہ تم اگر دنیوی زندگی اور راحت چاہتی ہوتو میں تم کو کچھ متاع دیدوں اورتم کو خوبی کے ساتھ رخصت کروں)۔

دنیا اور اس کی زینت کا

اللہ اور اس کے رسول سے دوری کا ذریعہ ہونا

اس میں دلالت ہے کہ دنیا اور اس کی زینت کی محبت اللہ اور اس کے رسول سے دوری کا سبب ہے۔

تشریح:

دنیا اور اس کی زینت کے سامان کی محبت اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے، اس دور میں یہ بیماری اتنی بڑھ گئی ہے کہ لگ بھگ ہر فرد کسی نہ کسی حد تک اس بیماری میں مبتلا ہے، ایک ہے ضروریات کی حد تک دنیا کی چاہت، اس کے لئے جدوجہد ضروری ہے۔ دوسری، دنیا کی راحت اور سامان دنیا کی دل میں محبت کا ہونا، یہ ایسی چیز ہے جو سارے فتنوں کی جڑ ہے، اس لئے حدیث شریف میں فرمایا گیا کہ دنیا کی محبت ساری بُرائیوں کی بنیاد ہے۔

دنیا کی محبت اپنے ساتھ دوسری بُرائیاں اس لئے لاتی ہے کہ فرد کو نفسی خواہشات کی تکمیل کا موقعہ دولت کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے، اس لئے اکثر دیکھا گیا ہے کہ جہاں بھی دنیا آئی ہے، وہاں عام طور پر سنگ دلی، قساوت قلبی، غریبوں سے دوری، تکبر وانانیت کی بیماری، بے رحمی اور دنیا کی فکر میں مستغرق ہونے کی خرابیاں ازخود آئی ہیں۔ اس لئے حدیث شریف میں دنیا کو ملعون قرار دیا گیا ہے۔

فرد اگر سادگی اور قناعت کا گر سیکھ لے اور تھوڑے پر راضی رہنے کی نفسیات کا حامل ہوجائے تو دنیا کے حوالے سے فرد کی حسرت وارمان ختم ہو سکتے ہیں۔

دنیا کی محبت دل کی گہرائیوں سے نکل جائے ، اس کے لئے ذکر کے مجاہدے اور

زہد کے صاحب اہل اللہ کی صحبت ضروری ہے۔ ذکر کے مجاہدے اور اہل اللہ کی صحبت اپنے ساتھ اللہ کے حسن، اللہ کے انوار اور اللہ کی توانائی لاتے ہیں۔ اللہ کے حسن کے اجزاء سے بہرہ وری کے بعد دنیا اور سامان دنیا کے حسن کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ بالخصوص موجودہ دور میں دنیا کی محبت سے بچنے کا سب سے قیمتی نسخہ یہی ہے۔

اگرچہ یہ نسخہ ہر دور کے لئے بہترین نسخہ ثابت ہوا ہے، اس دور میں جب کہ فضا مادیت اور مادی حسن سے عبارت ہے اور ظلمات کا غلبہ ہے، مگر اس کے بغیر چارہ کار بھی نہیں ہے۔ (مرتب)

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلاً مَّعْرُوفاً .

(سورۃ الاحزاب، آیت نمبر ۳۲)

(تو تم بولنے میں نزاکت مت اختیار کرو کہ ایسے شخص کو خیال ہونے لگتا ہے جس کے دل میں خرابی ہے اور قائدہ کے مطابق بات کرو)۔

فتنہ کے اسباب سے بچنے کی تلقین

اس میں فتنہ کے اسباب سے بچنے کا ارشاد ہے، اگرچہ اسباب بعیدہ ہی ہوں، خاص طور پر عورتوں سے کہ ان کا معاملہ بڑا سخت ہے۔

تشریح:

قرآن کی تعلیم چونکہ ہر دور کے افراد کے لئے ہے، ہمارے لئے اس کی اہمیت زیادہ ہے، اس لئے کہ ہم فساد زدہ دور میں رہتے ہیں۔ فتنے کے علاوہ فتنے کے اسباب سے بھی بچنے کی ضرورت ہے، اس آیت میں اس کی تاکید ہے۔ مثلاً فرد ایسے کام ہی نہ کرے، جس سے اسے رشوت دینی پڑے یا سود لینا پڑے، یا جھوٹ کا سہارا لینا پڑے۔

عورتوں کا فتنہ اس دور کا سب سے بڑا فتنہ ہے، وہ زندگی کے ہر شعبہ اور ہر موڑ پر فرد کے ساتھ وابستہ ہوگئی ہیں۔ ملازمت میں وہ ساتھ کام کرتی ہیں، کالجوں ویونیورسٹیوں میں وہ ساتھ پڑھتی ہیں۔ کمپیوٹر سینٹر میں ان کے ساتھ بیٹھکر کمپیوٹر سیکھنا پڑتا ہے، سفر میں ان سے واسطہ پڑتا ہے۔

عورت اور مرد کے مزاج کی تشکیل کچھ اس طرح واقع ہوئی ہے کہ وہ ایک دوسرے

سے ملنے کے لئے مضطرب رہتے ہیں، گفتگو شروع ہونے کے بعد دونوں کا دل ایک دوسرے کے لئے کشش محسوس کرتا ہے اور مضطرب بھی ہوتا ہے، بالخصوص مرد کے لئے عورت کی گفتگو ، اس کو دیکھنا، اس کے قریب ہونا، اس سے تنہائی اختیار کرنا، بہت بڑا فتنہ ہے، جو فرد کے دل کے سکون کو غارت کردیتا ہے۔

یورپ کے ایک ملک میں کئی شعبوں میں کام کرنے والی عورتوں اور مردوں کے حالات کا جائزہ لے کر ایک تحقیقی رپورٹ شائع ہوئی، جس میں بتایا کہ ہر شعبہ سے وابستہ مرد اور عورت دونوں کے دل ایک دوسرے کے لئے دھڑکتے رہتے ہیں، جس کی وجہ دونوں کی قوت کارکردگی متاثر ہوئی ہے۔

اسلام نے مرد وعورت کے لئے جداگانہ دائرہ کار متعین کئے ہیں، اس کی خلاف ورزی ہوگی تو اس کے نتائج سے بچنا دشوار ہی نہیں، لگ بھگ ناممکنات میں شامل ہے۔ زنا کے بڑھتے ہوئے واقعات اور اس کے نتیجہ میں قتل کے واقعات اور خاندانی نظام کی تباہی شرم وحیا، عفت کا خاتمہ، ہر وقت جنسی جذبات کا اشتعال وغیرہ یہ سب اسلامی تعلیمات کی خلاف ورزی ہی کا نتیجہ ہیں۔

مرد کا عورت سے پردہ اسلامی شریعت کا اہم حکم ہے، جو بھی اس کی خلاف ورزی کرے گا، وہ اس کے نتائج بھگتے بغیر رہ سکے، مشکل ہے، اس دور میں معاشی جدوجہد نے فیصلہ کن اہمیت اختیار کرلی ہے، جدید تعلیم سے وابستہ لگ بھگ ہر فرد کی خواہش ہے کہ اس کی لڑکیاں اعلیٰ جدید تعلیم حاصل کریں، اس کی بہتر ملازمت کی صورت پیدا ہو سکے اور بہتر جگہ اس کی شادی کی بھی، اس خواہش کی وجہ سے لڑکیوں کو جان بوجھکر ابتلا وآزمائش میں مبتلا کیا جاتا ہے۔

مخلوط تعلیمی اداروں میں لڑکیوں کا لازمی نتیجہ عام طور پر جو ظاہر ہوتا ہے، وہ شرم وحجاب سے عاری ہونے اور آزادی کے رجحان کے غلبے کی صورت میں ہی ظاہر ہوتا ہے۔

مغرب کی مادہ پرست تہذیب نے مسلم دنیا کو جو سب سے بُرا تحفہ دیا ہے، وہ عورت کی آزادی کا تحفہ ہے، جس نے معاشرے میں نئی نسل کو جنسی آوارگی کی راہ پر گامزن کردیا ہے۔ ہر وہ فرد جو معاشی طور پر خوشحال ہے، وہ چاہے غیر مذہبی ہو یا مذہبی، شیطان نے اس کے دل میں یہ بات بٹھادی ہے کہ لڑکی کی اعلیٰ تعلیم کا حصول ناگزیر ہے، اس کے بغیر لڑکی

کو جاہل تصور کیا جانے لگا ہے۔ یہ سب شعوری یا غیر شعوری طور پر مغربی تہذیب کے اثرات ہیں۔

آج سے پچاس سال پہلے تک لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے کا میلان ورجحان نہ ہونے کے برابر تھا، لیکن جوں جوں دجال کے ظہور کا وقت قریب آرہا ہے، اسی مناسبت سے آزادی اور تعلیم کے نام پر لڑکیوں کو تیزی سے بگاڑ کی راہ پر ڈالا جارہا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دولت بجائے خود فتنہ ہے۔ دولت نہ ہو تو اس خواہش کے باوجود عملاً ایسا کرنا دشوار ہے۔

عورت کی عزت وعصمت کو قائم وبرقرار رکھنے کے لئے عورت کے حوالے سے اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے، ورنہ عورت کو خرابی کی راہ پر ڈالنے کی سزا دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت میں بھی بھگتنی ہوگی۔ (مرتب)

وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَاهُ فَلَمَّا قَضَى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَراً زَوَّجْنَاكَهَا لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ. (سورۃ الاحزاب، آیت نمبر ۳۷)

(آپ لوگوں سے اندیشہ کرتے تھے اور ڈرنا تو آپ کو اللہ ہی سے زیادہ سزاوار ہے اور پھر جب زیدؓ کا اس سے جی بھر گیا تو ہم نے آپ سے اس کا نکاح کردیا تاکہ مسلمانوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں کچھ تنگی نہ ہو)۔

لوگوں کی ملامت کی پرواہ نہ کرنا

یعنی آپ لوگوں کے اعتراض سے ڈرتے تھے۔ جس میں دلالت ہے کہ جس فعل میں کوئی دینی مصلحت ہو، جیسے اس قصہ میں مصلحت تھی، اس میں ملامت کی پرواہ نہ کرنا چاہئے، وہ مصلحت وہی ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے، (جو ترجمہ میں موجود ہے) البتہ جس میں بجائے مصلحت کے عام مومنین کے لئے کوئی فساد یا نقصاندہ پہلو ہو، اس میں احتیاط کرنا چاہئے، جیسے حضور ﷺ نے حطیم میں کیا۔

تشریح:

قرآن ہماری تعلیم وتربیت کا سب سے بہتر ذریعہ ہے، اس آیت میں ہمارے لئے لائحہ عمل یہ ہے کہ لوگوں کے اعتراض وعدم اعتراض سے بے نیاز ہوکر، دینی مصلحت کو پیش

نظر رکھیں، ہر وہ کام جو اللہ کی رضامندی سے تعلق رکھتا ہو، اس کام کو سرانجام دینے کے لئے حوصلہ وہمت سے کام لیں۔ پوری دنیا ایک طرف ہوجائے تو بھی بندہ مومن کو کاموں میں دینی مصلحت کو سامنے رکھنا چاہے اور اسے ترجیح دینا چاہئے، اللہ کو بندے کی یہ ادا بہت پسند ہے کہ وہ دین پر عمل پیرا ہونے کے معاملے میں معاشرے کے رسم ورواج اور ناراضگی وعدم ناراضگی سے بلند ہوجائے، بندے کی اسی روش سے اسے ایمان کے بہتر سے بہتر درجات حاصل ہوں گے۔

اس دور میں بالخصوص معاشرتی ومعاشی سرگرمیوں میں دین کو خارج کردیا گیا ہے، اس طرح کے حالات میں رسم و رواج سے بے نیاز ہوکر، دینی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا، عزیمت کی علامت ہے، جو درجات کی بلندی کا ذریعہ ہے۔

البتہ فساد زدہ معاشرے میں جہاں لوگ دین کی مثالی تعلیمات سننے کے روادارانہ ہوں اور یہ خطرہ درپیش ہو کہ دین کی مثالی تعلیمات پر زور دینے سے حلقہ سے وابستہ افراد میں جو تھوڑا بہت دین موجود ہے، وہ بھی رخصت ہونا شروع ہوگا تو وہاں خاموشی بہتر ہے۔ (مرتب)

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلاً سَدِيْداً يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ. (سورۃ الاحزاب، آیت نمبر ۷۰۔۷۱)

(اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور سیدھی بات کہو اللہ تمہارے اعمال کو قبول کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کرے گا)۔

صالح اعمال کے اثرات

اس میں دلالت ہے کہ جس طرح صالح اعمال کو ثواب میں دخل ہے، اسی طرح دوسرے اعمال کی اصلاح میں بھی ان کو دخل ہے، اسی طرح مشائخ بعض اوقات ایک عمل کا حکم کرتے ہیں، مگر اس سے مقصود دوسرے عمل کی اصلاح ہوتی ہے، اس تعلق کو وہ حضرات خوب جانتے ہیں۔

تشریح:

بعض اعمال ایسے ہوتے ہیں، جس سے ثواب کے ساتھ ساتھ بہت سارے معاملات میں اصلاح کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح وہ عمل بذات خود بھی مقصود ہوتا

ہے تو دوسرے صالح اعمال کا ذریعہ بھی بنتا ہے، مثلاً اہل اللہ کے یہاں تواضع وعاجزی پر زیادہ زور ہے، تواضع اور عاجزی جہاں بہت نیک اور بابرکت عمل ہے اور بہت اجر کا مستحق ہے، وہاں اس عمل سے تکبر کی جڑ اکھڑتی ہے۔ تکبر جو زندگی کے ہر موڑ پر سامنے آکر فرد کو خیر کے بہت سارے کاموں سے روکنے کا موجب بنتا ہے، بزرگوں کی طرف سے تواضع وعاجزی پر زور دینے کی وجہ سے افراد کی تعمیر سیرت کی بنیاد مستحکم ہوتی ہے۔ یا مثلاً بزرگوں کا ذکر پر زیادہ زور ہوتا ہے، اس لئے کہ جب دل میں ذکر کا نور آنا شروع ہوجاتا ہے تو بہت ساری بُرائیوں سے بچنے اور بہت ساری نیکیوں پر عمل پیرا ہونے کی استعداد پیدا ہوجاتی ہے۔

اس طرح کی حکمتیں ایسی ہیں، جو نفسی قوتوں کے مراحل سے گزرنے والے اہل اللہ ہی بہتر سمجھتے ہیں، اس لئے ان سے اصلاح کا تعلق قائم رکھنے کے نتیجے میں فرد کی طرف سے ایک عمل کے اختیار کرنے سے اس کے لئے بہت سارے دوسرے اعمال کی بہتری ہونے لگتی ہے، اس لئے کہ اہل اللہ کو مجاہدوں اور فنائیت کے نتیجے میں حکمت عطا ہوتی ہے۔ (مرتب)

وَمِنَ الْجِنِّ مَن يَعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهِ. (سورۃ سبا، آیت نمبر ۱۲)

(اور جنات میں سے بعض وہ تھے جو ان کے آگے کام کرتے تھے ان کے رب کے حکم سے)۔

جنات کو تابع کرنے کے بارے میں

اس میں دلالت ہے کہ اگر جنات کا تابع ہونا کسی عمل وغیرہ کے ذریعے سے نہ ہو، محض منجانب اللہ ہو تو عبدیت کے منافی نہیں۔

تشریح:

جنات کو تابع بنانے کے لئے عملیات پر زور ہے، عملیات کے ذریعہ مالدار بننے کا ایسا سلسلہ شروع ہوچکا ہے کہ فرد حیرت زدہ ہوجاتا ہے، بعض عامل ہیں، جو پیسے لے کر عملیات کے زور پر لوگوں پر جنات کو مسلط کرتے ہیں، یا عملیات سے ان کو مفلوج کردیتے ہیں، دوسرے عامل ہیں، جو پیسے لے کر جنات نکالنے کا کام کرتے ہیں،

ایسے اہل اللہ بھی موجود ہیں، جن کے پاس جنات منجانب اللہ آتے ہیں اور ان کے تابع ہوتے ہیں، لیکن ان کا کام جنات کی تربیت کرنا ہوتی ہے، نہ کہ ان سے دنیاوی کام لینا۔ (مرتب)

حَتّٰی إِذَا فُزِّعَ عَن قُلُوبِهِمْ قَالُوا مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ قَالُوا الْحَقَّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ . (سورۃ سبا، آیت نمبر ۲۳)

(یہاں تک کہ جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہوجاتی ہے تو ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے رب نے کیا حکم فرمایا، وہ کہتے ہیں کہ حق بات کا حکم فرمایا ہے، وہ عالیشان سب سے بڑا ہے)۔

ہیبت کا فہم کی راہ میں
رکاوٹ ہونا

روح میں ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ ہیبت بھی فہم کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے، احقر کہتا ہے کہ ہیبت کا فہم کی راہ میں رکاوٹ بن جانا، کبھی اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ انسان کو معذور کردیتا ہے، جیسے بعض اہل حال کی حالت ہوجاتی ہے۔

تشریح:

اللہ کی ہیبت جہاں انعام ہے، وہاں بہت زیادہ ہیبت فرد کی معطلی کا ذریعہ بھی بن جاتی ہے، بعض اہل حال، اللہ کی زیادہ ہیبت سے معذور بھی ہوجاتے ہیں، اللہ کی شان عظمت کا غلبہ فرد میں ہیبت پیدا کردیتا ہے، اگر ذکر وعبادت کے ملکہ میں آہستہ آہستہ رسوخ ہوتا رہے تو ہیبت ایک حد سے آگے نہیں بڑھتی، لیکن اگر ذکر وفکر کا بہت زیادہ غلبہ ہوگیا، فرد شب وروز اسی شغل میں مصروف رہا تو اس سے یہ خطرہ موجود ہوتا ہے کہ سالک کہیں معطل نہ ہوجائے، اس لئے حقیقی اہل اللہ طالب کو راہ سلوک وراہ محبت میں اس طرح چلاتے ہیں، جس سے معذوری کی حالت نہ آنے پائے۔

اگرچہ اللہ کی ہیبت کے اثرات سے فرد کی زندگی کی کایا پلٹ جاتی ہے، لیکن راہ سلوک وراہ محبت میں توازن کی ضرورت درپیش ہوتی ہے، تاکہ طالب کا ذہن اور اس کے اعضاء معطل نہ ہوجائیں۔ (مرتب)

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالُوا مَا هَٰذَا إِلَّا رَجُلٌ يُرِيدُ أَن يَصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُكُمْ. (سورۃ سبا، آیت نمبر ۴۳)

(اور جب ان لوگوں کے سامنے ہماری آیتیں جو صاف صاف پڑھی جاتی ہیں تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ محض ایسا شخص ہے جو چاہتا ہے کہ تم کو ان چیزوں سے روکے جن کو تمہارے بڑے پوجتے تھے)۔

اولیاء کی مخالفت

روح میں ہے کہ یہی حال اولیاء کے منکرین کا ہے کہ وہ لوگوں کو ان سے اعتقاد رکھنے اور ان کا اتباع کرنے سے روکتے ہیں۔

تشریح:

اہل اللہ، اللہ سے محبت کی تعلیم دیتے ہیں، جس سے زندگی کے سارے رنگ ڈھنگ عین اسلام کے مطابق ڈھل جاتے ہیں اور اخلاص وللھیت پیدا ہوتی ہے، اور فرد وافراد میں انسانی جوہر اجاگر ہوتے ہیں، اہل اللہ کی تعلیم کی اس نوعیت کے عدم فہم کی وجہ سے عقل محض کے حاملین اہل اللہ کی مخالفت کرتے ہیں، ان کی یہ مخالفت کچھ تو فہم کی کمی اور کبھی غلط فہمی کا نتیجہ ہوتی ہے، اکثر اس میں علمی برتری کا احساس موجود ہوتا ہے، اہل اللہ کی مخالفت کرکے لوگوں کو ان کی صحبت میں جانے سے روکنا، یہ دراصل ان کو تزکیہ سے روکنے سے مترادف ہے، سبب یہی ہے کہ اہل اللہ کی صحبت، تزکیہ کا ذریعہ بنتی ہے۔ اہل اللہ کی پاکیزہ صحبت کے بغیر تعلیم وتربیت کا کیسا ہی بہتر نظام تشکیل دیں، اس سے معاشرے میں بڑھتے ہوئے فساد اور مادیت پرستی کے میلانات کی روک تھام مشکل ترین بات ہے، اس لئے کہ اصلاح، کتابوں اور محض وعظ ونصیحت سے نہیں ہوتی، اصلاح کے لئے قلب میں ذکر چاہئے، اللہ کے انوار حسن کا ذخیرہ چاہئے، جو اہل اللہ کے دلوں میں موجود ہوتا ہے۔ (مرتب)

فَلَمَّا جَاءَهُمْ نَذِيرٌ مَّا زَادَهُمْ إِلَّا نُفُوراً . (سورۃ فاطر، آیت نمبر ۴۲)

(پھر جب ان کے پاس ایک پیغمبر آپہنچے تو ان کی نفرت ہی کو ترقی ہوئی)۔

مرید کو زیادہ وظائف نہ کرنے کی ہدایت

اس سے صوفیہ کی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ اوراد اور اشغال سے خراب استعداد کے حامل فرد کا مرض اور زیادہ بڑھ جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بزرگوں میں شمار کرنے لگتا ہے اس آیت میں استکبار فی الارض سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

تشریح:

مرید کے لئے فرائض وواجبات کی ادائیگی کے بعد اصلاح نفس کے لئے اصل دستور العمل وہی ہے، جو اسے اپنے شیخ کامل کی طرف سے ملے، شیخ ہر شخص کی طبیعت وصلاحیت کے پیش نظر اسے جو ذکر دے اور اس کے ذکر کا جو دورانیہ متعین کرے اور وقت گزرنے کے ساتھ اس میں اضافہ وترمیم کرتا رہے، طالب کو چاہیے کہ وہ شیخ کے دستور العمل پر عمل کرے، اپنے طور پر زیادہ وظائف نہ کرے یا کتابوں سے دیکھکر اوراد ومراقبات شروع نہ کرے، اس لئے کہ وظائف کا شوق بعض اوقات افراد کو ذہنی مریض بنا دیتا ہے، بعض وظائف کی کثرت سے جلالی صفات کے عکس پڑتے ہیں، بعض وظائف اپنے ساتھ جنات کو لانے کا ذریعہ بنتے ہیں، اس لئے طالب کو وظائف کے معاملہ میں احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ (مرتب)

قَالُوا مَا أَنتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا. (سورۃ یٰسین، آیت نمبر ۱۵)

(ان لوگوں نے کہا کہ تم تو ہماری طرح معمولی آدمی ہو)۔

منتہی کا ظاہری حالت کے اعتبار سے مبتدی کی طرح ہونا

اس قول کا منشا یہ تھا کہ منتہی ظاہری حالات کے اعتبار سے مبتدی کی طرح ہوتا ہے۔

تشریح:

منتہی کی ظاہری حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی امتیازی شان کا حامل نہیں ہوتا، اس کی عبادت اور ذکر وفکر کا دورانیہ بھی زیادہ نہیں ہوتا، اس پر دعوتی کام کا غلبہ ہوتا ہے، مبتدی اور منتہی کے درمیان بظاہر فرق کرنا مشکل ہوتا ہے، اس لئے کہ منتہی عشق کی بھٹی سے گذر کر

کندن ہو چکا ہوتا ہے، مجاہدوں سے اس کی شخصیت میں ٹھہراؤ اور استحکام آتا ہے، اس کے لئے زیادہ گفتگو کرنا اور لوگوں سے رابطہ رکھنا نقصان دہ نہیں ہوتا، بلکہ یہ چیزیں اس کے دعوتی اہداف میں شامل ہوتی ہیں، منتہی، اصلاح نفس کے قابل ذکر مراحل سے گزر کر، نفس کو بڑی حد تک مہذب بنانے میں کامیاب ہو چکا ہوتا ہے، جب کہ مبتدی کا نفس اللہ کی طرف بڑھنے اور اللہ کی مخلصانہ عبادت واطاعت کے سلسلہ میں شدید حائل ہوتا ہے، وہ گفتگو میں تیز ہوتا ہے، زیادہ سے زیادہ بولنا چاہتا ہے، جو بات دو چار جملوں میں ادا ہوسکتی ہے، اس بات کو بڑے شد ومد سے اور بار بار دہراتا رہتا ہے، مبتدی کو لوگوں سے ملنے کا شوق دامنگیر ہوتا ہے، ذکر کے مجاہدے اس پر شاق گذرتے ہیں، ادھر اُدھر کی باتیں کرنا اس کا مشغلہ ہوتا ہے۔

اس اعتبار سے مبتدی ومنتہی کے درمیان بظاہر فرق نظر نہیں آتا، جب کہ حقیقتاً دونوں کے درمیان جوہری نوعیت کا فرق ہوتا ہے، وہ فرق یہ ہوتا ہے کہ منتہی کا دل متوجہ الی اللہ ہوتا ہے اور اس کا دل اللہ کے ذکر کے نور سے سرشار ہوتا ہے، اس کا بولنا اور لوگوں سے ملنا محض اللہ کے لئے ہوتا ہے، اس کی ساری سرگرمیوں کا ہدف اللہ کی رضامندی ہوتی ہے، طویل عرصہ کے مجاہدوں کے نتیجہ میں اس کی یہ نفسیات پختہ ہوچکی ہوتی ہے، جب کہ مبتدی کا دل مجاہدوں کے لئے تیار نہیں ہوتا، وہ نفس کی اکساہٹ پر اپنا زیادہ وقت دنیاوی سرگرمیوں میں صرف کرتا ہے، وہ اخلاص کے معاملہ میں پیچھے ہوتا ہے۔

اس لئے عام لوگوں کو مبتدی ومنتہی کے درمیان فرق کرنا مشکل لگتا ہے، مبتدی کو منتہی کے مقام پر فائز ہونے کے لئے غیر معمولی مجاہدوں کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، اس کے بعد کہیں جا کر اس کا بولنا، اس کا ملنا اور اس کی ساری سرگرمیوں کا مرکز اللہ کی ذات ہوتی ہے، اس سے پہلے وہ نفس پرستی کے سمندر میں ڈبکیاں لگاتا رہتا ہے۔ (مرتب)

قَالُوا إِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ. (سورۃ یٰسین، آیت نمبر ۱۸)

(وہ لوگ کہنے لگے کہ ہم تو تم کو منحوس سمجھتے ہیں)۔

مقبولین کے انکار کے نتائج

روح میں ہے کہ جب انہوں نے اللہ کے رسولوں کی تکذیب کی تو ان پر قحط یا

جذاب کا مرض مسلط ہوا اور مقبولین کے انکار کے وقت اللہ تعالیٰ کی یہی عادت جاری رہی ہے۔

تشریح:

اللہ کے نبیوں اور علمائے ربانی کی دعوت اللہ کی طرف ہوتی ہے کہ بندے اپنے رب کی معرفت کی راہ پر گامزن ہوکر، دوسرے معبودوں (جس میں نفس بھی شامل ہے) اس کی پوجا سے دستبردار ہوں، لیکن اللہ کی خالص عبادت واطاعت سے نفس پرستی کی مستحکم عادتوں پر ضرب کاری لگتی ہے اور مادی خوشحالی اور راحت کے سامان کی قربانی دینی پڑتی ہے اور زندگی کے ہر موڑ پر نفس کی بجائے اللہ کی اطاعت اختیار کرنی پڑتی ہے، اس لئے نفس پرستی کی عادتوں کے غلام افراد کے لئے اللہ کے رسولوں اور علمائے ربانی کی دعوت ان کے مزاج میں ضد پیدا کردیتی ہے، اس لئے اللہ کی طرف بلانے والوں کے خلاف نفس پرست اور مادہ پرست افراد کا غم وغصہ اور انتقامی کاروائیاں تیز تر ہوجاتی ہیں، جب دعوتی کام میں مقبولین اپنی آخری توانائیاں خرچ کرڈالتے ہیں، اس کے جواب میں سرکشی ہی کا رویہ سامنے آتا ہے تو پھر اللہ کی طرف سے مخالفین پر عتاب نازل ہوتا ہے، یہ عتاب مختلف صورتوں میں ہوتا ہے، مقبولین کے انکار کے نتیجہ میں اللہ کی یہ سنت ایسی ہے جو اٹل ہے اور ہمیشہ اللہ کا یہی دستور رہا ہے۔ (مرتب)

أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِي آدَمَ أَن لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ. (سورۃ یٰسین، آیت نمبر ۶۰)

(اور اے مجرمو، آج اہل ایمان سے الگ ہوجاؤ کیا میں نے تم کو تاکید نہیں کی تھی کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرنا)۔

اپنے نفسی بتوں کے اظہار کی حیثیت

صوفیاء حضرات کا اپنے آپ کو بت پرست کہنا یہ کفر کے معنیٰ میں نہیں آتا، بلکہ یہ نفس کی اطاعت کے معنیٰ میں آتا ہے۔

تشریح:

نفس کے اندر ایک پورا بت خانہ موجود ہے، جس بت کدے کے سامنے لگ بھگ

ہر فرد صبح سے شام تک سجدہ ریزی کرتا ہے، یہ بت کدے حب جاہ وحب مال، حرص وہوس، حسد، ریا اور مادی حسن پر فریفتگی وغیرہ کی صورت میں موجود ہوتے ہیں، شیطان فرد کے ان جذبات کو ابھارتا رہتا ہے، صوفی غیر معمولی مجاہدوں سے باطن میں موجود اس بت کدوں کو توڑ پھوڑ دیتا ہے، متوسط صوفی کو ان بت کدوں کا بڑی شدت سے مشاہدہ ہوتا ہے، اس لئے اگر متوسط صوفی اپنے نفس کو بت کدہ کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کا نفس ابھی طاقتور ہے، اور وہ اللہ کی خالص عبادت واطاعت کرنے کی راہ میں سخت رکاوٹ ہے یا منتہی صوفی بھی نفس کے بت کا ذکر کرتا ہے تو اس سے اس کا مقصود اللہ کی شان عظمت کے مقابلے میں اپنے سیاہ کار ہونے کا اظہار ہوتا ہے۔ (مرتب)

إِذْ جَاءَ رَبَّهُ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ. (سورۃ الصّٰفّٰت، آیت نمبر ۸۴)

(اور جب کہ وہ اپنے رب کی طرف صاف دل سے متوجہ ہوئے۔)

قلب کی سلامتی کا مدار

اس میں اس بات کا اشارہ ہے کہ اللہ کا قرب اس بات سے وابستہ ہے کہ قلب عقائد ذات وصفات (میں آمیزش) جیسی آفات سے محفوظ وسالم ہو۔

تشریح:

قلب کو قلب سلیم بنانے، فرد کو عقائد واعمال کے فساد سے بچانے اور توحید کے رنگ کو غالب کرنے کے لئے بڑے مجاہدوں کی ضرورت ہے، اس کے بغیر قلب، قلب سلیم نہیں بنتا اور برائی سے نفرت اور ہر طرح کی نیکی سے قلبی اور طبعی مناسبت پیدا نہیں ہوسکتی، اللہ کے قرب کے حصول کے لئے قلب کا قلب سلیم ہونا ناگزیر ہے، اس کے بغیر فرد کی نجات خطرے میں ہے، نفس کی ساخت میں خواہشات اور مادی دنیا پر فریفتگی کے جذبات شامل ہیں، جب کہ قلب سلیم بالکل اس کے الٹ ہے، وہ اپنے رب کی رضا پر راضی رہتا ہے اور اس کی عبادت واطاعت میں خوشی ومسرت محسوس کرتا ہے، اللہ کے قرب کے مقامات قلب سلیم اور عقائد واعمال کے فساد سے حفاظت سے وابستہ ہیں۔ (مرتب)

وَمَا مِنَّا إِلَّا لَهُ مَقَامٌ مَّعْلُومٌ. (سورۃ الصّٰفّٰت، آیت نمبر ۱۶۴)

(اور ہم میں سے ہر ایک کا ایک معین درجہ ہے)۔

راہ سلوک میں مد وجزر کا ہوتے رہنا

قرب اور مشاہدہ کی وجہ سے فرد کبھی تنزلی کی طرف اور کبھی ترقی کی طرف لوٹتا ہے، لیکن فرشتے قرب ومشاہدہ کی وجہ سے ایک ہی حالت میں رہتے ہیں، کیونکہ ان کا ایمان نہ گھٹتا ہے، نہ بڑھتا ہے اور انسان کبھی گناہوں کی وجہ سے ایمان میں کمزور ہوجاتا ہے اور کبھی نیکیوں کی وجہ سے اس کا ایمان بڑھ جاتا ہے۔

تشریح:

انسان کو نفس کی جو قوت دی گئی ہے، وہ ایسی قوت ہے، جو فرد کو اپنی طرف کھینچتی رہتی ہے، اس کی وجہ سے فرد سے گناہ صادر ہوتا ہے، بعض اوقات نفس مضمحل ہوتا ہے، اس وقت نیکیوں کا غلبہ ہوتا ہے، جب تک طالب کی نفس کے ساتھ آخری حد تک معرکہ آرائی کا سلسلہ قائم نہ ہوگا، تب تک نفسی قوتوں کا یہ مدوجزر جاری رہے گا، فرشتے چونکہ قرب ومشاہدہ کی ایک ہی حالت پر قائم ہیں، اس لئے ان کے ایمان ویقین کی کیفیت یکساں طور پر برقرار ہے۔ (مرتب)

إِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ وَالطَّيْرَ مَحْشُورَةً كُلٌّ لَّهُ أَوَّابٌ. (سورۃ صٓ، آیت نمبر ۱۷، ۱۸)

(اور ہم نے پہاڑوں کو حکم کر رکھا تھا کہ ان کے ساتھ شام اور صبح تسبیح کیا کریں اور پرندوں کو بھی جو کہ جمع ہوجاتے تھے، سب ان کی وجہ سے مشغول ذکر رہتے)۔

اجتماعی ذکر کے فوائد وثمرات

اس کو قولی تسبیح پر محمول کرنے کی صورت میں جیسا کہ قرآن سے ظاہر ہے اور کشف سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، دو باتیں ماخوذ ہوتی ہیں، ایک اجتماعی ذکر، جس سے نفس کی خوشی، تقویت، ہمت اور ذکر کی برکات حاصل ہوتی ہیں، دوسری بات جو ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ بعض اشغال کی صحت جس میں سارے عالم کو ذکر تصور کیا جاتا ہے، یہ اجتماعی ذکر ہمت کو مجتمع کرنے اور خطرات کو روکنے کے سلسلہ میں عجیب تاثیر رکھتا ہے۔

تشریح:

اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کائنات کی ساری مخلوق اللہ کا ذکر کرتی ہے،

دوسری بات جو معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ اجتماعی ذکر اثرات وافادیت کے اعتبار سے زیادہ مؤثر ہے، یہ اجتماعی ذکر افراد میں محبوب حقیقی کے لئے والہانہ پن کی فضا پیدا کردیتا ہے، اس سے خوشی ومسرت کی بے پناہ فضا پیدا ہوتی ہے، اہل اللہ کے ہاں ہفتہ میں ہونے والا ایک دوبار اجتماعی ذکر طالبوں کو پورے ہفتہ تک ذکر سے متحرک رکھتا ہے۔

اجتماعی ذکر کا سلسلہ قرآن کی آیت سے ثابت ہے، اجتماعی ذکر کے بڑے فوائد وثمرات ہیں کہ اس طرح کے ذکر کے حلقہ میں شمولیت کی وجہ سے ایک تو فرشتوں کا نزول ہوتا ہے، وہ ذکر کے حلقہ کا گھیراؤ کرلیتے ہیں، دوم یہ کہ طالبوں میں صاحب دل شخصیت کے فیوض وبرکات سے بہرہ وری ہوتی ہے، سوم یہ کہ ذکر میں شریک ہونے والے طالبوں کا ذکر کا ملکہ مستحکم ہونے لگتا ہے، اجتماعی ذکر کے حلقے کے اتنے فوائد کے باوجود اس میں عدم شرکت محرومی کی بات ہے، دوسرا نکتہ روحانی پرواز کی بلندی اور اس کی صحت کا ہے، روح، محبوب کی طرف پرواز چاہتی ہے، جو ذکر کے ذریعہ سے ہی اسے حاصل ہوتی ہے، روح کی غذا ہی یہی ہے، اس غذا کی کمی کی وجہ سے روح شدید اضطراب کا شکار ہوجاتی ہے۔ (مرتب)

وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَا إِلَىٰ سَوَاءِ الصِّرَاطِ. (سورۃ صٓ، آیت نمبر ۲۲)

(اور بے انصافی نہ کیجئے اور ہم کو سیدھی راہ بتادیجئے۔)

خلاف تہذیب باتوں کو برداشت کرنا

ان اہل معاملہ کے اس خلاف تہذیب بات کو داؤد علیہ السلام کا برداشت فرمانا، دلیل ہے کہ اس پر حاکم کو، اسی طرح مفتی اور شیخ کو ایسے معاملات میں برداشت سے کام لینا چاہئے، نیز اس میں اس شخص کے لئے عبرت ہے، جس کو اپنے تقدس پر ناز ہو کہ جب معصوم سے یہ کہا جاتا ہے کہ حد سے تجاوز نہ کیجئے تو غیر معصوم کو اپنے نفس پر یہ اعتماد کرنا کہ مجھ میں یہ احتمال نہیں، کب زیبا ہے۔

تشریح:

تحمل، بردباری اور برداشت کی صفت کے استحکام کے بغیر کام نہیں بنتا اور دعوتی کام میں بہتری کی بجائے بگاڑ پیدا ہوتا ہے، اس لئے حقیقی اہل اللہ آخر وقت تک بردباری

سے کام لیتے ہیں، جس کی وجہ سے معاملات بگڑنے کی بجائے سدھرنے لگتے ہیں اور فساد پیدا ہونے کی بجائے باہم محبت پیدا ہونے لگتی ہے، اس لئے کہ لوگوں سے معاملات کے وقت ان کی الٹی سیدھی باتیں سننے اور انہیں برداشت کئے بغیر اسلام کے علمی ودعوتی کام کو فروغ حاصل نہیں ہوسکتا، بلکہ اس سے بگاڑ بڑھتا ہی رہتا ہے۔

معاشرے میں فساد کی جڑ، مزاج کی سختی ہے۔ مزاج کی یہ سختی تربیت وتزکیہ کے مراحل سے گزرے بغیر دور ہو، انتہائی دشوار گزار امر ہے، اپنے تقدس پر ناز بھی اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ فرد، مجاہدوں کے ذریعہ اپنے نفس کو فنا کر چکنے میں کامیاب نہیں ہوتا، یہ ناکامی فرد وافراد کو بہت سارے بگاڑ سے دوچار کردیتی ہے، مزاج کی سختی بظاہر ایک خرابی نظر آتی ہے، لیکن یہ ایسی خرابی ہے، جس سے نہ صرف بنے بنائے کام بگڑ جاتے ہیں، بلکہ یہ سختی بڑے بڑے اداروں کی تباہی کا سبب بھی بن جاتی ہے، دراصل مزاج کی سختی میں بباطن بڑے پن اور شیخی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے، اس لئے اداروں کی تباہی تو گوارا کی جاتی ہے، لیکن اپنی رائے سے دستبرداری قبول نہیں ہوتی۔ (مرتب)

وَاِنَّ كَثِيراً مِّنَ الْخُلَطَاء لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ اِلَّا الَّذِيْنَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَقَلِيْلٌ مَّا هُم . (سورۃ صٓ، آیت نمبر ۲۴)

(اور اکثر شرکاء ایک دوسرے پر زیادتی کیا کرتے ہیں مگر ہاں جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں اور ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں)۔

اکثر لوگوں میں ظلم اور
شر کی جبلت کا غالب ہونا

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر (لوگوں میں) جبلۃً یا عادۃً ظلم اور شر کا غلبہ رہتا ہے اور جو جبلۃً پاک ہیں یا مجاہدے سے پاک ہوگئے ہوں، ایسے (افراد) کم ہی ہیں۔

تشریح:

عام لوگوں کی حالت کی عکاسی ہے کہ لگ بھگ ہر دور میں اکثر لوگوں پر ظلم اور شر کا غلبہ رہتا ہے اور وہ نفسی خواہشات کے تابع ہوتے ہیں اور اللہ ورسول کی اطاعت کے معاملہ میں وہ بے حس ہوتے ہیں۔ البتہ ایسے افراد جن کی فطرت سلیمہ محفوظ ہو یا جو ذکر وفکر

کے مجاہدوں سے نفس کو مہذب بنانے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ ایسے افراد خوش نصیب ہیں، لیکن اس طرح کے افراد ہر دور میں کم ہی رہے ہیں۔ اس دور میں تو اس طرح کے افراد کی نایابی حیرت کی حد تک کم ہے۔ ہزاروں لوگوں میں بمشکل چند افراد ایسے نکل آتے ہیں، جن پر اصلاح کی فکر غالب ہو اور جو نفس اور نفسی قوتوں کو مطیع اور مہذب بنانے کے کام کو کام سمجھتے ہوں اور اس کے لئے مجاہدوں سے کام لیتے ہوں۔

قرآن کی اس آیت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اکثر لوگوں میں ظلم اور شر کی نفسیات کتنی پختہ ہوجاتی ہے اور نفس کی اصلاح کا کام کتنا مشکل ترین کام ہے۔

اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ نفس کی ساخت میں فساد کے زبردست اثرات موجود ہیں۔ جب بہت سارے نفس پرست افراد مل جاتے ہیں تو وہ معاشرے کو فساد زدہ کردیتے ہیں اور فساد سے بھرپور معاشرے کے اثرات بد سے نکل کر نفس کو مہذب بنانے اور اللہ کی اطاعت کی راہ پر گامزن کرنا دشوار تر کام ہوجاتا ہے۔ اس لئے مشکل سے چند افراد ہی اصلاح کی راہ پر گامزن ہو پاتے ہیں۔

انسان کے اس المیہ پر جتنے بھی خون کے آنسو بہائے جائیں کم ہیں ایک اس لئے کہ اپنی محسن اور خالق ہستی سے بغاوت کی راہ وفا شعاری سے بالکل متصادم ہے، دوسرے اس لئے کہ اس سے افراد کی اپنی دائمی زندگی خسارے سے دوچار ہوتی ہے۔ (مرتب)۔

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكاً لَّا يَنبَغِيْ لِأَحَدٍ مِّنْ بَعْدِيْ إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ. (سورۃ صٓ، آیت نمبر ۳۵)

(پھر انہوں نے (اللہ کی طرف) رجوع کیا اور دعا مانگی اے میرے رب میرا پچھلا قصور معاف فرما؟ اور مجھے ایسی سلطنت عطا فرما کہ میرے سوا (میرے زمانہ میں) کسی کو میسر نہ ہو اور آپ بڑے دینے والے ہیں)۔

منصب کا کامل کے لئے مضر نہ ہونا

ایسی سلطنت طلب کرنے سے مقصود یہ تھا کہ اس کو مزید قرب کا ذریعہ بنادیں، مزید قرب کا سب سے زیادہ ذریعہ مال کے لئے دوسروں کی (ضروریات کی) تکمیل ہے اور سلطنت اس کا بہت اچھا ذریعہ ہے اور زیادہ قریب یہ ہے کہ احد سے مراد اہل دنیا لئے

جائیں، چونکہ ایسا بڑا منصب اہل دنیا کے لئے مضر تھا، اس لئے شفقت کی وجہ سے ان کو ایسی دنیا ملنے سے مستغنی کردیا، پس آیت سے دلالت ہوئی کہ بعض چیزیں کامل کے لئے مضر نہیں ہوتی، جب کہ (خام) ناقص کے لئے مضر ہوتی ہیں، جیسے اس پر دلالت تھی کہ منصب اور کمال ایک دوسرے کے منافی نہیں، جب کہ منصب میں دینی مصلحت موجود ہو۔

تشریح:

حکومت اور بڑے بڑے عہدوں میں چونکہ فرد کے بگاڑ کے بہت سارے امکانات وخطرات موجود ہوتے ہیں، اکثر دیکھا گیا کہ حکمران اور بڑے بڑے افسران آپے سے نکل جاتے ہیں، ہر قسم کے ظلم وستم پر اتر آتے ہیں، حکمرانی وافسری سے نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے مزاج میں بگاڑ وفساد پیدا ہوجاتا ہے، تکبر اور بڑا پن ان کی نفسیات کا حصہ بن جاتا ہے، اسی طرح کثرت دولت سے بھی نخوت پیدا ہوتی ہے، اس لئے منصب، عہدے اور کثرت دولت فرد وافراد کو حد اعتدال میں رہنے نہیں دیتے، لیکن اللہ کے مقبول بندوں کو اگر عہدے مل جائیں تو وہ ان عہدوں کو خلق کی بھلائی کے لئے استعمال کرتے ہیں، اور ان عہدوں کے غلط استعمال سے کانپتے رہتے ہیں۔ (مرتب)

هَذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ أَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ . (سورۃ ص، آیت نمبر ۳۹)

(یہ ہمارا عطیہ ہے، سوخواہ دو یا نہ دو تم سے کچھ دارو گیر نہیں)۔

سالک کا بڑا سرمایہ
قلبی یکسوئی کا ہونا

یعنی نہ تو دینے پر حساب ہوگا اور نہ ہی لینے پر حساب ہوگا، ہر طرح سے استعمال کی اجازت ہے، اس میں حکمت یہ ہے کہ تاکہ ان کا قلب حقوق کی ادائیگی کے سلسلہ میں پریشان نہ ہو، کیونکہ اصل نقصان اسباب دنیا کی تشویش کا ہے، اس سے بچا لیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سالک کا بڑا سرمایہ قلبی یک سوئی ہے۔ اس لئے صوفیہ کو اس کا خاص اہتمام ہے۔ (یعنی قلبی یکسوئی کا)

تشریح:

راہ محبت میں قلبی یکسوئی کی ضرورت لاحق ہوتی، ورنہ سالک سخت تشویش میں مبتلا

ہوتا ہے، اس تشویش کی وجہ سے ایک تو ذکر اور اس کے معمولات متاثر ہوتے ہیں، دوم قرب حق میں رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے صوفیہ قلبی یکسوئی کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

طالبوں کو اگر معاشی تفکرات سے نجات مل جائے اور ان کا معاشی مسئلہ حل ہوجائے تو انہیں قلبی یکسوئی میں غیر معمولی مدد ملتی ہے، چنانچہ وہ اپنی طرز زندگی کو سادہ رکھتے ہیں اور کم سے کم ضروریات پر اکتفا کرتے ہیں، وہ زیادہ دنیاوی مسائل میں الجھتے نہیں، اس سے انہیں کافی وقت مل جاتا ہے، صوفیہ کو معاشی خوشحالی وتنعم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، وہ دال روٹی اور سادہ سے سادہ لباس پر گذارہ کرنے کا فن جانتے ہیں۔

ویسے بھی تجربہ یہی ہے کہ اللہ تعالی اپنے طالبوں کو معاشی ضروریات کے سلسلہ میں لوگوں کی محتاجی سے بچاتے ہیں۔ (مرتب)

أَفَمَن شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِّن رَّبِّهِ. (سورۃ الزمر، آیت نمبر ۲۲)

(سو جس شخص کا سینہ اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیا اور وہ پروردگار کے نور پر ہے تو کیا وہ شخص اور اہل قساوت برابر ہیں)۔

سینہ کی کشادگی اور نور کا عطا ہونا

حدیث میں اس نور اور شرح صدر کی علامت یہ آئی ہے کہ دائمی زندگی (آخرت) کی طرف توجہ ہو دارالغرور (دھوکے کے گھر یعنی دنیا) سے بے تعلقی اور موت کے لئے تیاری ہو۔

فَوَيْلٌ لِّلْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُم مِّن ذِكْرِ اللَّهِ. (سورۃ الزمر، آیت نمبر ۲۲)

(سو جن کے دل اللہ کے ذکر سے متاثر نہیں ہوتے (ذکر کی طرف آنے کے لئے تیار نہیں) ان کے لئے بڑی خرابی ہے)۔

طبیعت میں رقت کا نہ ہونا، شرح صدر کے منافی نہیں

شرح صدر کے مقابلہ میں قساوت (دل کی سختی) کا آنا، اس سے یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے تو شرح صدر سے خالی ہونا جو اوپر کی آیت میں مذکور ہے، اس سے اس وہم کی

خرابی معلوم ہوتی ہے، جو بعض سالکین کو ہوتا ہے کہ وہ طبیعت میں رقت کو نہ ہونے کو قساوت سمجھتے ہیں۔

تشریح:

اس آیت کے پہلے حصہ میں ایک اہم بات جو بیان فرمائی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ بندہ مومن کا سینہ کھل جاتا ہے اور اسے ایک نور عطا کیا جاتا ہے، وہ حالت نور میں چلتا ہے اور حالت نور میں رہتا ہے۔ یہ نور اسے اللہ کی عبادت واطاعت کی راہ پر گامزن کرتا ہے، وہ اس نور کی برکت سے عبادت واطاعت کی راہ پر گامزن رہتا ہے، یہ نور اسے زندگی بھر کے معاملات میں حق وباطل کے بارے میں فرق کرنے کی استعداد سے بہرہ ور کرتا ہے، وہ جوں ہی گناہ کرتا ہے، اس کا یہ نور مدھم ہوجاتا ہے۔ توبہ واستغفار کرنے سے یہ نور بحال ہوجاتا ہے۔

اس نور کی برکت سے اسلامی شریعت پر چلنا اور گناہوں سے دور رہنا، اس کے لئے آسان ہوجاتا ہے، حدیث شریف میں اس نور کی علامت یہ بتائی گئی ہے کہ دل میں دائمی زندگی کی فکر غالب ہونے لگتی ہے اور دنیا کی دھوکہ کی زندگی کے بارے میں بندہ مومن کی حساسیت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے،دنیا میں اس کی بیشتر مصروفیات ذکر وفکر، عبادت، خدمت اور اطاعت کے کاموں سے وابستہ ہوتی ہیں، معاش کے لئے اس کی جدوجہد مختصر ہوتی ہے، اس لئے کہ وہ دنیا کو آخرت کے مقابلہ میں چندلمحوں کی زندگی سے زیادہ حیثیت نہیں دیتا، اس لئے اس کی نگاہوں میں دنیا کی چندلمحوں یا چند دنوں کی زندگی اس قابل نہیں ہوتی کہ اس میں توانائیاں صرف کی جائیں۔

اسی آیت کے دوسرے حصے میں ان لوگوں کے لئے جو اللہ کے ذکر کی طرف آنے کے لئے تیار نہیں، جو ذکر کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، ان کے لئے ہلاکت کی خبر سنائی گئی ہے۔

شرح صدر اور قساوت قلبی ایک دوسرے سے بالکل متصادم چیزیں ہیں، شرح صدر کی صورت میں ذکر سے طبعی مناسبت پیدا ہونے لگتی ہے اور ذکر کا ملکہ راسخ ہونے لگتا ہے، جب کہ قساوت قلبی یعنی دل کی سختی کی صورت میں ذکر وعبادت سے وحشت وبے زاری

اور دل کی عدم رغبت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

طبیعت میں رقت کا پیدا نہ ہونا، یہ قساوت قلبی میں ہرگز شامل نہیں۔ بعض سالکوں کو یہ غلط فہمی لاحق ہوتی ہے کہ انہیں رونا نصیب نہیں ہوتا، اور سوز وساز کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ یہ قساوت قلبی ہرگز نہیں، یہ چیزیں کیفیات کے ادل بدل میں شامل ہیں، جس میں بندے کے لیے بہت ساری مصلحتیں وابستہ ہیں۔ (مرتب)

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً رَّجُلاً فِيهِ شُرَكَاء مُتَشَاكِسُونَ وَرَجُلاً سَلَماً الرَّجُلٍ. (سورۃ الزمر، آیت نمبر ۲۹)

(اللہ تعالیٰ نے ایک مثال بیان فرمائی ہے کہ ایک شخص ہے، جس میں کئی ساجھی ہیں، جن میں باہم ضداضدی ہے اور ایک شخص ہے جو پورا ایک شخص کا ہے)۔

دوشخصوں کی دومختلف حالتیں

یہی حالت اس شخص کی ہے، جو دنیا کی کوششوں میں مستغرق ہے، دوسری حالت خالص مومن کی ہے، جس کو مولا سے کوئی چیز غافل نہیں کرتی۔

تشریح:

ایک شخص ہے، جو بیک وقت کئی افراد کا غلام ہو، وہ مختلف افراد کی ملکیت میں ہوتو ظاہر ہے، اس شخص کے بارے میں ان کے مالکوں کے درمیان رسہ کشی اور ٹکراؤ ہوگا، ہر ایک چاہے گا کہ وہ صرف اور صرف میری ملکیت ہو اور میری غلامی اختیار کرے اور میرے ساتھ یکسو ہوجائے، جب ایسا نہیں ہوگا تو غلام دونوں کے درمیان پس کر رہ جائے گا۔

یہ کافر کی مثال ہے، جو ایک اللہ کو چھوڑ کر کئی معبودوں کی عبادت کرتا ہے اور مختلف افراد کو اپنا آقا بنا لیتا ہے، دوسری مثال مومن کامل کی ہے، جو صرف اور صرف اللہ واحد کی غلامی قبول کرتا ہے اور وہ اللہ کے ساتھ مکمل طور پر یکسو ہوجاتا ہے، اور جسے اللہ کا ذکر غافل ہونے نہیں دیتا، اللہ کے ذکر کی محویت اور اللہ سے یکسوئی اسے سکون واطمینان کے بلند درجے پر فائز کرنے کا موجب بن جاتی ہے، اس طرح اس کی زندگی میں وحدت پیدا ہوجاتی ہے۔ (مرتب)

وَإِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَإِذَا ذُكِرَ

الَّذِينَ مِن دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ. (سورۃ الزمر، آیت نمبر ۴۵)

(اور جب فقط اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل بے چین ہوجاتے ہیں، جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے اور جب اس کے سوا اوروں کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس وقت وہ لوگ خوش ہوجاتے ہیں)۔

توحید خالص کے ذکر سے اضطراب کا ہونا

اسی کے مشابہ بعض جاہل طریقت والوں (اہل تصوف) کی حالت ہے کہ توحید خالص کے ذکر سے وہ بے چین ہوتے ہیں اور اولیاء سے مانگنے اور ان کی طرف سے کام بنانے والوں کی حکایات سے خوش ہوتے ہیں۔

تشریح:

اس آیت میں لوگوں کی اس حالت کی نشاندہی کی گئی ہے کہ جب بھی کسی مجلس میں اللہ کے ذکر کی بات ہوتی یا اللہ کا ذکر ہوتا ہے تو عام طور پر افراد کو ذکر کی یہ بات نہ صرف پسند نہیں آتی، بلکہ اللہ کے ذکر سے ان کے دل میں وحشت، بے زاری اور بے قراری کی سی حالت ہوجاتی ہے۔ جب کہ دنیا، سامان دنیا اور راحت دنیا کا ذکر ہوتا ہے تو وہ خوشی اور مسرت محسوس کرنے لگتے ہیں، یہ بہت المناک صورتحال ہے، جو اپنے محسن حقیقی کے ذکر کے حوالے سے افراد کی ہوتی ہے۔

مولانا نے یہاں ان افراد کی اس حالت کی بھی نشاندہی فرمائی ہے کہ بعض جاہل اہل تصوف کی مجلسوں میں اللہ سے زیادہ بزرگوں کے تصرفات اور مریدوں کی غائبانہ صورت میں مدد کرنے کی حکایات ہوتی ہیں، اس سے وہ قلبی تسکین محسوس کرنے لگتے ہیں۔

اکثر یہی دیکھا گیا ہے کہ بزرگوں سے وابستہ افراد کی محفلوں میں شرکت ہوتی ہے تو محفل کا بیشتر وقت اپنے اپنے بزرگوں کے تصرفات اور کشف وکرامات بیان کرنے میں صرف ہوجاتا ہے، یعنی اللہ کی شانِ عظمت سے زیادہ بزرگوں کی اہمیت ان کے یہاں زیادہ ہوتی ہے، سنجیدہ سے سنجیدہ افراد کو بھی دیکھا گیا ہے کہ انہیں مجلسوں میں بزرگوں

کی امداد اور تصرفات بیان کرنے میں زیادہ لذت وروحانی مسرت محسوس ہوتی ہے۔ (مرتب)

وَبَدَا لَهُم مِّنَ اللَّهِ مَا لَمْ يَكُونُوا يَحْتَسِبُونَ. (سورۃ الزمر، آیت نمبر ۴۷)

(اور اللہ کی طرف سے ان کو وہ معاملہ پیش آئے گا جس کا ان کو گمان بھی نہیں تھا)۔

اعمال ومجاہدات سے کشف کو مقصود سمجھنا

اس میں اس شخص کی غلطی معلوم ہوتی ہے جو اپنے اعمال ومجاہدات سے کشف کو مقصود سمجھتا ہے، اگر کشف کوئی کمال ہوتا تو وہ کفار کو حاصل نہ ہوتا۔

تشریح:

ذکر وفکر کی دنیا میں آنے کے بعد عام طور پر فرد کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ اسے کشف ہونے لگے اور وقت سے پہلے ہونے والے واقعات یا دوسری دنیا کے مشاہدات ہونے لگیں، اسے بزرگوں کی ارواح اور فرشتے وغیرہ نظر آنے لگیں۔ عام طالب کشف ہی کو مجاہدات کا حاصل سمجھتے ہیں، اگر مجاہدوں کے باوجود انہیں کشف نہیں ہوتا تو وہ اپنے آپ کو محروم سمجھتے ہیں۔ حالانکہ کشف ضروری نہیں ہے، اصل مقصود ذکر وفکر، عبادت واطاعت میں استقامت ہے، اس کے مقابلہ میں باقی ساری چیزیں ہیچ ہیں۔ کشف کی حیثیت انعام اور حوصلہ افزائی سے زیادہ نہیں۔ لیکن سب سے بڑا انعام تو ذکر وفکر کے مجاہدوں اور اعمال صالحہ کی توفیق کا حاصل ہونا ہے، حقیقی طالب تو کشف وعدم کشف کو یکساں سمجھنے لگتا ہے۔ وہ دونوں حالتوں میں راضی ہوتا ہے۔ (مرتب)

وَبَدَا لَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوا وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ. (سورۃ الزمر، آیت نمبر ۴۸)

(اور ان پر تمام بُرے اعمال ظاہر ہوجائیں گے اور جس کے ساتھ وہ استہزا کیا کرتے تھے وہ ان کو آگھیرے گا)۔

کفران نعمت

اس شخص کی برائی بیان ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے نعمتیں عطا فرمائیں، تاکہ وہ شکر ادا

کرے، لیکن وہ اپنی تدابیر کی طرف نظر کر کے، ان تدابیر کی تعریف کرتا ہے، بجائے اللہ تعالیٰ کے۔

تشریح:

راہ سلوک میں مجاہدوں کے نتیجے میں اللہ کی طرف سے بہت سارے انعامات وثمرات عطا ہوتے ہیں، ذکر وفکر میں محویت کا ثمرہ، بہتر کیفیات کا ثمرہ، قلبی اور ذہنی سکون کا ثمرہ، باطنی قوتوں کے فہم کا ثمرہ، وغیرہ غیرہ۔

متوسط صوفی کو نفس وشیطان ور غلاتا رہتا ہے کہ یہ سارے ثمرات اس کے مجاہدوں ہی کا نتیجہ اور حاصل ہیں، اس طرح سالک قبل از وقت بزرگ بننے کی راہ پر گامزن ہونے لگتا ہے، اگر وہ باصلاحیت بھی ہے تو اسے مرید بھی مل جاتے ہیں، دولت بھی حاصل ہونے لگتی ہے اور شہرت بھی۔

یہ سب نتیجہ ہوتا ہے ثمرات کو اپنے مجاہدوں کا حاصل سمجھنے کا، حالانکہ مجاہدوں کی توفیق بھی اللہ کی طرف سے ہی عطا ہوتی ہے، اگر ادھر سے عطا نہ ہو تو فرد کتنی بھی کوشش کر لے وہ نفسی قوتوں اور مادی زنجیروں کو توڑنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔

دوسری بات یہ کہ طریق (تصوف) کے مذکورہ ثمرات بھی اس کا فضل خاص ہی ہوتا ہے، اغوائے نفس کے نتیجے میں سالک اللہ کے اس فضل خاص کو نظر انداز کر کے، اپنے مجاہدوں کو اہم اور اصل سبب سمجھنے لگتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ سالک کو سخت مجاہدوں سے کام لینا پڑتا ہے، اس حد تک کہ وہ روزانہ مجاہدے کر کے تھک جاتا ہے، لیکن مجاہدوں کی توفیق کا عطا ہونا یہ اللہ کے فضل خاص ہی کا تو نتیجہ ہے، اگر سالک کی ساری کوششوں کے باوجود اللہ تعالیٰ اس کی کیفیات کو سلب کر دے تو سالک محروم رہ جاتا ہے، اس لئے مجاہدوں اور اس کے ثمرات کو اللہ کا فضل سمجھنا چاہئے اور ان چیزوں کو اپنی طرف منسوب کرنے کے نتیجہ میں سالک میں تکبر کی نفسیات پیدا ہو جاتی ہے۔

تکبر اور فساد کی نفسیات میں جو جذبات کارفرما ہوتے ہیں، وہ منصب اور مالی اعتبار سے مستحکم سے مستحکم تر ہونے اور مادی مفادات کے جذبات ہی کارفرما ہوتے ہیں، اسی

سے ظلم، لوٹ مار، رشوت اور معاشی استحصال وغیرہ ہوتا ہے، اسی سے مفادات کی جنگ تیز سے تیز تر ہوتی ہے، اسی سے ایک دوسرے سے تصادم برپا ہوتا ہے، اسی سے ایک دوسرے پر بالادستی کے مظاہر سامنے آتے ہیں، یہاں تک کہ ملکوں اور قوموں کی سطح پر واقع ہونے والا تصادم بھی تکبر اور فساد کی نفسیات ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

جب کہ بڑے پن سے دستبرداری اور عجز وانکساری، چھوٹے پن اور منصب سے اعراض اور قناعت وسادگی سے زندگی گزارنے کے نتیجہ میں بندہ مؤمن میں انکساری وعاجزی پیدا ہوتی ہے۔

وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوهُهُم مُّسْوَدَّةٌ أَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ . (سورۃ الزمر، آیت نمبر ۶۰)

(اور آپ قیامت کے روز ان لوگوں کے چہرے سیاہ دیکھیں گے، جنہوں نے اللہ پر جھوٹ بولا تھا، کیا ان متکبرین کا ٹھکانہ جہنم میں نہیں ہے)۔

قلبوں کی سیاہی کا

چہروں سے ظاہر ہونا

روح میں ہے کہ ان کے قلبوں کی سیاہی ان کے چہروں سے ظاہر ہو جائے گی۔ اس میں راز یہ ہے کہ عالم آخرت حقیقت کے ظاہر ہونے کا عالم ہے۔

تشریح:

قیامت کا دن جو حقیقت کے آشکار ہونے کا دن ہوگا، اس روز کافروں کی حالت یہ ہوگی کہ ان کے کفر اور شرک کی بدولت ان کے چہرے ظلمات وسیاہی کا نمونہ ہوں گے، اس لئے کہ کفر، شرک اور بڑے بڑے گناہوں کی خاصیت ہی ظلمات وسیاہی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس دنیا میں بھی بعض صاحب کشف لوگوں کو ان کے اعمالِ بد کی وجہ سے ان کے چہروں پر صاف طور پر یہ سیاہی نظر آتی ہے۔ اللہ ہمیں اس رسوائی سے بچائے اور اپنی محبت کی راہ نصیب فرما کر، ہمارے چہروں کو روشن فرمادے۔ آمین۔ (مرتب)

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا. (سورۃ الزمر، آیت نمبر ۷۳)

(جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے تھے، وہ گروہ در گروہ ہو کر جنت کی طرف روانہ

کئے جائیں گے)۔

دیدار الٰہی کا شوق

بعض نے کہا ہے کہ میدان حشر میں ان کو ایک بار اللہ کی رویت ہوچکی ہوگی جیسا کہ مسلم کی حدیث شریف میں ہے اور ان کو یہ معلوم نہ ہوگا کہ جنت میں بھی رویت ہوگی، اس لئے وہ جنت میں جاتے ہوئے متردد ہوں گے، پس فرشتوں کے شوق کی نوبت آئے گی اور بعض نے کہا ہے کہ اس شوق کا فاعل شوق ہے، جب ان کو معلوم ہوگا کہ جنت میں رویت ہوگی تو اس شوق میں دوڑے ہوئے چلے جائیں گے اور دونوں قولوں میں مشترکہ بات ان کا رویت الٰہی کو مقصود بالذات سمجھنا ہے۔

تشریح:

اگر پہلے قول کو صحیح سمجھا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ میدان حشر میں اللہ کے دیدار کی محویت نے ان سے یہ بات بھلادی تھی کہ جنت میں بھی اللہ کا دیدار ہوگا، اللہ کے دیدار کی محویت سے ایسا ہونا ممکنات میں سے ہے، چونکہ اللہ کے عاشقوں کے سارے مجاہدے اللہ کے مشاہدے کے لئے تھے، اس لئے ان کی حالت یہ ہوگی کہ وہ اللہ کے مشاہدے سے کم پر راضی نہ ہوں گے، جب ان کی محویت کی حالت میں کمی ہوگی، ان کا ادراک پورا صحیح ہوگا تو ان پر یہ بات آشکار ہوگی یا آشکار کرادی جائے گی کہ اللہ کی رویت کا تمہارا مقصد تو جنت میں حاصل ہوگا، اس پر وہ ذوق وشوق اور والہانہ انداز سے جنت کی طرف جائیں گے۔

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ إِيْمَانَهُ. (سورۃ المومن، آیت نمبر ۲۸)

(اور ایک مومن شخص نے جو کہ فرعون کے خاندان سے تھے، جو اپنا ایمان پوشیدہ رکھتے تھے)۔

اہل باطل سے حق کو چھپانے کا مسئلہ

اس میں اس بات کی دلالت ہے کہ اہل باطل سے حق کو چھپانا، جب کہ خوف کی وجہ سے ہو، جب کہ خاص طور پر اس میں اصلاح وارشاد کی مصلحت بھی ہو، یہ قبیح نہیں۔

تشریح:

اہل باطن، حق بات کو کسی صورت سننا نہیں چاہتے، اس صورت میں بندہ اگر اپنے آپ کو ان کے عتاب سے بچائے اور آگے چل کر حالات وضرورت کے تحت اصلاح وارشاد کا حق ادا کرنے کی خاطر ایسا کرتا ہے تو اس کی گنجائش موجود ہے۔ فرعون کے خاندان کے فرد نے اپنے ایمان کو چھپایا ہوا تھا، لیکن جب حق بات مؤثر طور پر پیش کرنے کی ضرورت درپیش ہوئی تو اس نے بہت خوبی سے یہ کردار ادا کیا، قرآن میں اس مومن کی حق وصداقت کی تلقین پر مشتمل کئی آیتیں شامل ہیں، یہ آیتیں اتنی ایمان افروز ہیں کہ انہیں پڑھکر ایمان ویقین کی کیفیات پیدا ہوتی ہیں اور اس کی جرئت رندانہ پر حسرت ہونے لگتی ہے۔ (مرتب)

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ . (سورۃ المومن، آیت نمبر ۵۵)

(اور اپنے گناہ کی معافی مانگئے، اور صبح وشام اپنے رب کی تسبیح اور تعریف کرتے رہئے)۔

اپنے رب سے بخشش مانگنا

یعنی اپنی شان کے اعتبار سے، اور اس میں اصل ہے حسنات الابرار سیئات المقربین کی۔

تشریح:

صبح وشام اپنے رب کی تسبیح وتعریف کرتے رہئے، یہ اللہ کے رسول ﷺ کو تاکید ہے تو ہم تو اس تلقین کے زیادہ مستحق ہیں کہ ہمارا دل اللہ کے ذکر سے سرشار ہو، تاکہ نفس کی قوتوں پر قابو پانے کی صورت پیدا ہو سکے، اللہ کے ذکر سے تجدید ایمان کی صورت پیدا ہوتی ہے اور نئی توانائی آجاتی ہے، اس لئے ہم ذکر کا جتنا بھی اہتمام کریں کم ہے۔ (مرتب)

اللّٰهُ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيْهِ. (سورۃ المومن، آیت نمبر ۶۱)

(اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لئے رات بنائی تاکہ تم اس میں آرام کرو)۔

رات کے وقت

ہر ایک کے سکون کا مختلف ہونا

روح میں ہے کہ رات کے وقت ہر فرد کا سکون جدا ہوتا ہے، عوام کا سکون راحت نفس وبدن کے ساتھ، اہل اطاعت کا سکون حلاوت اعمال کے ساتھ اور اہل محبت کا سکون شوق قلب کے ساتھ، لیکن ان میں افضل سکون اعمال کی لذت میں ہے۔

تشریح:

رات کا آخری بڑا حصہ انوار سے سرشار ہوتا ہے، حدیث شریف کے مطابق اللہ تعالیٰ کا ساتویں آسمان پر نزول ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اعلان فرماتے ہیں کہ ہے کوئی مجھ سے مانگنے والا تو میں اسے عطا کردوں۔

رات کے ان اوقات میں عبادت اور ذکر فکر کی اہمیت غیر معمولی ہوجاتی ہے اور زندگی پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس وقت کی عبادت سے فرد دن بھر سکون وسکینت سے سرشار رہتا ہے۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ اللہ کے ان تیز انوارات سے ہم جیسے عام لوگ استفادہ کرنے سے بے بہرہ رہتے ہیں، جو بڑی محرومی کی بات ہے، اہل محبت اس وقت اللہ کے ساتھ والہانہ طور پر حالت شوق میں رہتے ہیں، ذکر وفکر تہجد وغیرہ سے انہیں نئی زندگی نصیب ہوتی ہے، اللہ کے ساتھ ان کے والہانہ عشق میں اضافہ ہوتا ہے، وہ چاہتے ہیں کہ رات ختم ہونے کا نام نہ لے، تاکہ وہ اللہ کے تیز انوار حسن سے پوری طرح متمتع ہوسکیں۔

اعمال کی لذت سے مراد سنت کے مطابق اعمال ہیں، جس میں قرآن کی کثرت سے تلاوت، نوافل کے علاوہ بھی قرآن میں غوطہ زنی اور احادیث سے ثابت اوراد ووظائف شامل ہیں۔ (مرتب)

فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ . (سورۃ المومن، آیت نمبر ۶۴)

(سو (تمہاری) عمدہ صورت بنائی)۔

حسن وجمال آئینہ ہونا

روح میں ہے کہ تم کو اپنے جمال وجلال کا مرأت (آئینہ) بنایا۔

تشریح:

اللہ نے انسان کی ساخت ایسی بنائی ہے کہ اس میں روح کے ساتھ مادی قوت بھی رکھی ہے۔

اس طرح اگر انسان چاہے تو مادی حسن پر فریفتہ ہوکر، اپنی قوتیں وصلاحیتیں مادی دنیا کے حصول کی جدوجہد میں فنا کردے، اگر چاہے تو اللہ کے حسن وجمال کے عکسوں کے ذریعہ ارتقا کے مراحل طے کرے، یہ انسان کے اختیار میں ہے، حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں کائنات کی کسی چیز میں سما نہیں سکتا، سوائے بندہ مؤمن کے دل میں بندہ مؤمن کی یہ بڑی سعادت ہے کہ اس کا دل اللہ کے انوار حسن کو اخذ کرلیتا ہے، اس کی مزید تشریح میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اللہ نے اس کے اعضاء، اس کی جسمانی ساخت اور اس کا چہرہ مہرہ ایسا بنایا ہے کہ وہ حسن کا مجسمہ نظر آتا ہے، انسان جیسی حسین مخلوق دوسری کوئی نہیں، دوسری مخلوق پر انسان کو بڑا شرف حاصل ہے۔ لیکن یہ انسان جب اپنی زندگی اللہ کی اطاعت میں بسر کرتا ہے اور اس کی زندگی سے اللہ کے اوصاف حمیدہ کا ظہور ہوتا ہے تو اس وقت وہ صحیح معنیٰ میں ساری مخلوق سے احسن صورت میں سامنے آتا ہے، اس کا مقام ودرجہ سب سے بلند ہوجاتا ہے۔ (مرتب)

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ. (سورۃ حم السجدہ، آیت نمبر ۸)

(اور برخلاف ان کے) جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے نیک کام کئے، ان کے لئے (آخرت میں) ایسا اجر ہے جو (کبھی) ختم ہونے والا نہیں)۔

بیماری کی وجہ سے اعمال میں کمی کا معاملہ

یہ آیت ان مریضوں اور بوڑھوں کے حق میں نازل ہوئی، جو مرض یا ضعف وپیری کے سبب کمال اطاعت سے عاجز ہوجائیں تو ان کے لئے ویسا ہی ثواب ہے، جو حالت صحت وقوت میں عمل کرنے سے لکھا جاتا تھا اور اسی سے مشائخ، سالکین کو تسلی دیتے ہیں کہ جب ان کو کوئی عذر پیش آجاتا ہے، جس سے وہ پورا عمل نہیں کرسکتے۔

تشریح:

بیماری کی حالت میں فرائض واجبات کی صحیح ادائیگی میں کمی یا ذکر واذکار کی ادائیگی

میں تخفیف واقع ہوتی ہے۔ یہ تخفیف مجبوری کی وجہ سے ہے۔ ایسے افراد کے لئے حالت صحت والے اعمال لکھے جاتے ہیں۔ ان کے اجر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ مریضوں اور ضعیفوں پر اللہ کا یہ بڑا انعام ہے۔ مریض وضعیف اگرچہ اپنے اعمال میں کمی پر تشویش میں مبتلا ہوتے ہیں، لیکن حوصلہ رکھنا چاہئے کہ اللہ محبوب کو ان کی حالت معذوری ہی پسندیدہ ہے، صالح اعمال کے حامل افراد کی آرزو تو یہ ہوتی ہے کہ انہیں اگر ہزار سال کی عمر بھی نصیب ہو تو وہ اللہ کی عبادت واطاعت اور ذکر وفکر میں صرف کریں، ان کی یہ آرزو اللہ کو سب سے زیادہ پسند ہے۔ (مرتب)

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ. (سورۃ حٰمٓ السجدہ، آیت نمبر ۳۰۔۳۱)

(جن لوگوں نے کہا اللہ ہمارا رب ہے، پھر اس پر جم گئے، ان پر فرشتے اتریں گے دنیا میں بھی تو آخرت میں بھی)۔

فرشتوں کی طرف سے سکینت کا فائض ہونا

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ظاہری اور باطنی امتحان کے موقعہ پر ملائکہ ان پر سکینت وبرکات فائض کرتے ہیں، اس میں کلام بالمشافہ بھی شامل ہے، اور اس تقدیر پر ملائکہ کا کلام غیر نبی سے بھی ثابت ہوتا ہے اور استقامت میں یہ ساری چیزیں شامل ہے۔

تشریح:

اللہ کو رب کہکر، اس پر استقامت اختیار کرنا یعنی اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں مدغم کرنا اور زندگی کے سارے معاملات میں اللہ کی مخلصانہ طور پر اطاعت کرنا، یہ ایسی چیز ہے، جس کے انعام کے طور پر بندہ مومن کو خوشخبری سنائی گئی ہے کہ دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت میں بھی ان پر فرشتے اتریں گے، جو ان کی سکینت کا ذریعہ ثابت ہوں گے اور انہیں خوشخبری سنائیں گے۔ ممکن ہے زندگی میں موت کے وقت کی یہ حالت بیان کی گئی ہو،لیکن بعض مقربین کے ساتھ فرشتوں کا یہ معاملہ زندگی کے مختلف مراحل پر بھی ہوتا ہے۔ مولانا کی تصریح کے مطابق ملائکہ کا کلام غیر نبی کے ساتھ بھی ثابت ہے، جس طرح حضرت مریم کے ساتھ ہوا۔

استقامت، اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے، استقامت کے لئے بڑے مجاہدوں سے کام لینا پڑتا ہے اور نفسی قوت کے زور کو توڑ کر مزاج کو اللہ کے لئے خاص کرنا پڑتا ہے۔ استقامت کے نتیجہ میں ملنے والا انعام اتنا بڑا ہے کہ ایک ہی زندگی کیا، اگر سینکڑوں زندگیاں بھی میسر ہوں تو بندہ مومن یہ اپنے محبوب کے لئے فدا کرسکتا ہے، اصل انعام تو اللہ کی رضامندی کا انعام ہے، اللہ کی رضامندی کے نتیجہ میں پھر دوسری نعمتیں بھی حاصل ہوتی رہیں گی، بندہ مومن کے لئے کتنی بڑی خوش بختی کی بات ہے، اللہ کی رضامندی کے حصول اور اس پر استقامت کی وجہ سے اسے دنیا وآخرت دونوں میں سکینت کی نعمت عظمیٰ عطا فرمائی جائی گی۔ (مرتب)

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّن دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحاً. (سورۃ حٰمٓ السجدہ، آیت نمبر ۳۳)

(اور اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے)۔

داعی الی اللہ کا عامل ہونا ناگزیر ہے

سارے صالح اعمال میں اس طرف اشارہ ہے کہ داعی الی اللہ وشیخ کو خود بھی عامل ہونا چاہئے، ورنہ اس کی تعلیم میں برکت نہیں ہوتی۔

تشریح:

داعی وشیخ اگر عمل میں کوتاہ واقع ہو تو اس کوتاہی کے اثرات اس کے حلقے سے وابستہ افراد پر پڑے بغیر نہیں رہتے، دوسروں کی تعلیم وتربیت کے لئے شیخ کو خود عامل ہونا پڑتا ہے۔ عمل سے ہی تعلیم میں تاثیر ہوتی ہے، بلا عمل تعلیم برکت سے خالی ہوتی ہے اور اس سے زندگیوں میں حقیقی تبدیلی واقع نہیں ہوتی، کچھ ظاہری تبدیلی ضرور واقع ہوتی ہے، لیکن اخلاق وکردار میں پاکیزگی پیدا نہیں ہوتی اور باطنی امراض سے بچاؤ کی صورت پیدا نہیں ہوتی، داعی وشیخ جب خود صالح عمل کا حامل ہوتا ہے اور دنیاداری کے مظاہر سے دور ہوتا ہے تو اس کے اثرات اس کے حلقہ سے وابستہ افراد میں بھی ظاہر ہوتے ہیں۔

شیخ نے اگرچہ غیر معمولی مجاہدے کرکے سلوک طے کرلیا ہے، دوران سلوک اسے

جن حالات سے گذرنا پڑا ہے، اسے ایک بزرگ نے اس طرح بیان کیا ہے کہ سالک کی عرصہ تک یہ حالت رہی ہے کہ گویا وہ دیوار سے ٹکرا رہا ہے۔ یعنی اسے نفس سے مقابلہ کے لئے خوفناک جنگ لڑنی پڑی ہے، اس جنگ میں روزانہ اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کہیں اس مقابلے میں اس کے اعصاب واعضاء جواب نہ دے جائیں، اللہ نے اپنے فضل سے اس کی طلب اور حوصلہ وہمت ومجاہدوں کی برکت سے اسے راہ سلوک طے کرادی، لیکن راہ سلوک طے ہونے کے باوجود اسے روزانہ کے ذکر ومراقبہ کے معمول کو بھی برقرار رکھنا ہے، اس لئے کہ ذکر، دل وروح کی ایسی غذا ہے، جو اس کی دائمی نوعیت کی غذا ہے، جس دن صوفی سے ذکر میں ناغہ ہوگا یا غفلت ہوگی، اس کے نفس کا سانپ فوں فوں کرے گا اور اعمال میں بھی کوتاہی واقع ہوگی اور ایمانی کیفیات میں تروتازگی کا فقدان ہوگا، جس کی وجہ سے گفتگو میں تاثیر اور برکت متاثر ہوگی۔ (مرتب)

وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُوحَظٍّ عَظِيْمٍ وَإِمَّا يَنزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ. (سورۃ حٰم السجدہ، آیت نمبر۳۵۔۳۶)

(اور اگر آپ کو شیطان کی طرف سے وسوسہ آنے لگے تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے بلاشبہ وہ خوب سننے والا اور خوب جاننے والا ہے)۔

اہم تعلیم

اس مجموعہ میں تین مسئلے ہیں، ایک اخلاق کی تعلیم، دوسرے اخلاق میں مجاہدہ تیسرے کاملین کے لئے وسوسہ کا امکان، اور اللہ سے التجا میں اس کا مضر نہ ہونا اور فاستعذ باللہ میں اس طرف اشارہ ہے کہ کسی وقت بے فکر نہ ہونا چاہئے۔

تشریح:

اخلاق حسنہ ایسی چیز ہے، جو دینی مقاصد میں شامل ہے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میں اخلاق حسنہ کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں، دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا تم سے سب سے اچھا وہ ہے، جو اخلاق میں بہتر ہے، تصوف کی ریاضتوں کے نتیجہ میں جو انسان وجود میں آتا ہے، وہ اخلاق حسنہ کا حامل انسان ہوتا ہے،

ذکر وفکر کے مجاہدوں سے جب نفس کے اندر موجود باطل راہ فرار اختیار کرتا ہے اور تزکیہ نفس کا عمل بڑی حد تک ہوجاتا ہے تو اس سے نیا انسان سامنے آتا ہے، جو اخلاق حسنہ کا حامل ہوتا ہے اور اپنوں اور غیروں سب کے لئے شفیق ہوتا ہے، وہ محبت ورواداری کا نمونہ ہوتا ہے، ذکر وفکر کے مجاہدوں کے بغیر اخلاق حسنہ کی صلاحیتوں وصفات کا پیدا ہونا امر محال ہے، اس لئے کہ یہ کثرت ذکر ہی ہے، جس میں انسانی نفس میں موجود رزائل کی صفائی وتطہیر کی خصوصیت موجود ہے، کثرت ذکر کے بغیر نفس کے اندر گندگی کا ڈھیر موجود ہوتا ہے، اس گندگی کی موجودگی میں فرد میں اوصاف حمیدہ پیدا نہیں ہو سکتے۔

اس حاشیہ میں تیسرا مسئلہ کاملیں میں وسوسے کا ہونا ہے، وسوسہ ایسی چیز ہے، جو کمال کے ہرگز منافی نہیں ہے، یہ بشریت کا تقاضا ہے، لیکن وسوسہ کمزور حالت میں ہو اور وہ سالک کے لئے بُرائی پر اکسانے کا موجب نہ ہو، ایسے وسوسہ پر تشویش کی ضرورت نہیں۔

اَللّٰهُ يَجْتَبِىْ إِلَيْهِ مَنْ يَّشَاءُ وَيَهْدِىْ إِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ. (سورۃ الشوریٰ، آیت نمبر۱۳)

(اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور اپنی طرف اسی کو کھینچتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے)۔

جذب وسلوک

روح میں ہے کہ اس میں اشارہ ہے، جذب وسلوک کی طرف، اس کی وجہ یہ ہے کہ جبی کے معنیٰ جذب کے ہیں اور ہدایت کے معنیٰ سالک کا ارادہ طریق۔

تشریح:

اللہ کی طرف سے بندے کو اپنی طرف کھینچنا، اپنی محبت ومعرفت کی راہ پر چلانا اور اسے ایسی استعداد وقوت عطا فرمانا کہ وہ زندگی بھر استقامت سے اس کی راہ پر چلتا رہے اور نفس، مادی قوتوں اور شیطان کا مقابلہ کرکے، اس راہ پر گامزن رہے، یہ اللہ کا بڑا فضل وانعام ہے، یہ انعام رجوع اور طلب کی بنا پر ہی عطا ہوتا ہے۔ راہ سلوک میں جذب بھی ہوتا ہے تو مجاہدے بھی، حالت جذب میں طالب پر وارفتگی طاری ہوتی ہے، وہ محبوب کی راہ

پر ازخود چل پڑتا ہے اور مجاہدوں کی کوششوں کے بغیر ذکر ازخود اس سے جاری ہونے لگتا ہے اور اس کے لئے اس پر ذوق وشوق کی عجیب غریب فضا پیدا ہوتی ہے۔ سالک کو ایک تو جذب کے ذریعہ اوپر اٹھایا جاتا ہے، جب تک مصلحت ہوتی ہے، جذب کے ذریعہ اسے چلایا جاتا ہے۔

زیادہ تر سالکوں کو غیر معمولی مجاہدوں سے گزار کر، قربت کا مقام عطا کیا جاتا ہے، بلکہ دوران سلوک جذب اور مجاہدوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

اس دور کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ مادیت پرستی کے ماحول نے اللہ کی طرف رجوع کی طلب ختم کردی ہے، جس کی وجہ سے خانقاہیں ویران ہوگئی ہیں اور اللہ کی محبت کے رازدان تن تنہا یا چند طلبہ کے ساتھ زندگی گزار کر، رخصت ہوتے ہیں، ان سے استفادہ کے لئے افراد معاشرہ آمادہ نہیں۔

طلب کا ختم ہونا، یہ مسلم معاشرے کا سب سے بڑا المیہ ہے، طلب کے خاتمہ کا نتیجہ ہے کہ افراد معاشرہ پر دنیاداری بلکہ دنیا پرستی کی لعنت مسلط کردی گئی ہے، عالمی سطح سے مادیت پرستی کی جو طوفانی لہریں شروع ہوئی ہیں، ان لہروں نے مسلم معاشروں کو بڑے پیانہ پر مادیت کی دوڑ میں شریک ہونے کی راہ پر لگا دیا ہے۔

ہدایت کی راہ پر گامزن کرنے کا اللہ کا وعدہ ان افراد کے ساتھ ہے، جن میں طلب اور رجوع کی حالت موجود ہو، جب طلب اور رجوع ختم ہوجائے تو افراد معاشرہ پر مردنی چھا جاتی ہے اور وہ اپنی ساری توانائیاں دنیا کے چند دنوں کے مستقبل کو بہتر بنانے میں صرف کرنے لگتے ہیں۔

چند دنوں کے مستقبل کی فکرمندی اور اس کے لئے ان تھک جدوجہد، یہ دراصل طلب کے خاتمہ کی سزا ہے، جو ہمیں مل رہی ہے۔ (مرتب)

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْأَرْضِ. (سورۃ الشوریٰ، آیت نمبر ۲۷)

(اور اگر اللہ تعالیٰ اپنے سب بندوں کے لئے روزی کشادہ کردیتا تو وہ دنیا میں شرارت کرنے لگتے)۔

بعض افراد کے لئے بسط کا نقصاندہ ہونا

اسی طرح بعض افراد کے لئے باطنی بسط نقصاندہ ہوتا ہے تو بسط (خوشی کی کیفیات)

کے نہ ہونے سے غم زدہ نہ ہونا چاہئے۔

تشریح:

سارے بندوں کے لئے یکساں طور پر معاشی خوشحالی کے دروازے کھلنے سے معاشرے کا نظام درہم برہم ہونے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے، اس لئے کہ اس سے افراد نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے کے کام نہ آتے، بلکہ معاشی خوشحالی افراد کو ایک دوسرے سے متصادم کرنے کا ذریعہ بن جاتی، اس وقت بھی بڑی حد تک اس کا منظر ہم دیکھ رہے ہیں کہ سرمایہ دار، سرمایہ دار سے حالت رقابت میں ہے تاجر، تاجر سے حالت تصادم میں ہے، خوشحال طبقہ سے وابستہ ہر طبقے کے افراد ایک دوسرے سے حالت کشیدگی میں ہیں، اور دوسروں پر برتری حاصل کرنے کی ایک نہ ختم ہونے والی دوڑ ہے، جو جاری ہے۔

ظاہری خوشحالی کے ساتھ باطنی خوشحالی جسے حالت بسط کہتے ہیں، وہ بھی ایسی چیز ہے کہ اگر سالکوں کو غیر معمولی مجاہدوں کے بغیر باطنی بسط کی نعمت حاصل ہوتی تو وہ بزرگی کی دعویٰ کی راہ پر گامزن ہوتے، اس طرح باطنی بسط کی زیادتی ایک دوسرے سے تصادم کا ذریعہ بن جاتی اور بزرگی کے روپ میں ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے کی کاوشیں ہوتی، اس لئے طالبوں کے لئے عام طور بسط کی حالت فائدے سے زیادہ نقصاندہ ثابت ہوتی ہے۔

البتہ مجاہدوں کے ذریعہ جوں جوں طالب کی اصلاح میں بہتری کی صورت پیدا ہوتی ہے، اسی نسبت سے اس کی باطنی بسط کی حالت میں بہتری پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جو سالک دوران سلوک زیادہ عرصہ تک حالت قبض میں رہتے ہیں، یعنی محبوب کے جلال کے تیروں کی حالت میں رہتے ہیں، ان سے معاشرے کو زیادہ فائدہ حاصل ہوتا ہے، اس لئے کہ طویل عرصے تک اضطراب کے انگاروں سے گذرتے رہنے کے نتیجے میں ان کے دعویٰ اور بڑے پن کی بنیاد منہدم ہوجاتی ہے۔

جن طالبوں کو بسط کی کیفیت کم حاصل ہوتی ہے، وہ ایک اعتبار سے خوش قسمت ہیں کہ محبوب حقیقی کی طرف سے ان کی بہتر تربیت ہورہی ہیں کہ بسط نہ ہونے کے باوجود وہ راہ سلوک میں چل رہے ہیں۔ ایسے طالبوں کو فکرمندی کی کوئی ضرورت نہیں، انہیں

مطمئن ہونا چاہئے کہ محبوب انہیں آزمائش کی بھٹی سے گزار کر نفس مطمئنہ کے مقام پر فائز کرنا چاہتا ہے۔ (مرتب)

وَمَا أَصَابَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ. (سورۃ الشوریٰ، آیت نمبر ۳۰)

(اور تم کو جو مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمہارے اپنے ہاتھوں سے کئے ہوئے کاموں سے ہی پہنچتی ہے)۔

قبض کا دو طرح کا ہونا

اسی طرح مصیبت باطنی قبض (بے چینی) کبھی گناہ کے سبب ہوتی ہے، روح میں ہے کہ قبض کی یہ نوعیت گناہوں کی ہے اور گناہ نہ کرنے والوں پر قبض کی حالت ان کے درجات کی بلندی یا کسی دوسری حکمت کے لئے بھی آتی ہے، اسی طرح قبض کبھی بعض مصلحتوں کے لئے ہوتا ہے۔

تشریح:

قبض (بے چینی) کی ایک نوعیت گناہوں کی وجہ سے بھی ہوتی ہے، یہ گناہ ظاہری نوعیت کے ہوں یا باطنی نوعیت کے، دونوں قسم کے گناہوں سے شدید قبض کی حالت ہوتی ہے۔

اس کی علامت یہ ہوتی ہے کہ قبض میں ظلمت اور سیاہی کے اثرات غالب ہوتے ہیں، توبہ اور آہ وزاری کرنے سے یہ مصیبت ختم ہوجاتی ہے۔ دوسرا قبض جو عام طور پر اہل سلوک کو ہوتا ہے، وہ راہ سلوک کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے، اس کے بغیر راہ سلوک اور راہ محبت کا تصور بھی نہیں کیا جاتا، یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ یہ قبض سالک کے لئے ہارسینگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس قبض کے ذریعہ طالب کو راہ سلوک میں تیز رفتاری سے چلایا جاتا ہے، یہ قبض بظاہر اپنے ساتھ بے چینی کے انگارے لاتا ہے، لیکن بباطن وہ محبوب کا انعام ہوتا ہے کہ اس سے طالب کی جو ترقی ہوتی ہے، وہ ذکر سے بھی نہیں ہوتی، اس لئے کہ ذکر میں حلاوت ہوتی ہے، جب کہ قبض میں شدید اضطراب کی حالت غالب ہوتی ہے۔

اس قبض میں بہت ساری حکمتیں اور مصلحتیں پوشیدہ ہیں۔ اس لئے طالب کو قبض سے فکرمند ہرگز نہ ہونا چاہئے۔ (مرتب)

مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَٰكِن جَعَلْنَاهُ نُوراً. (سورۃ الشوریٰ، آیت نمبر ۵۲)

(آپ کو نہ یہ خبر تھی کہ کتاب کیا چیز ہے اور نہ یہ خبر تھی کہ ایمان کیا چیز ہے اور لیکن ہم نے اس قرآن کو ایک نور بنایا)۔

کمالات کے حامل افراد کا کمالات سے عاری ہونا

اس میں اس بات کی دلالت ہے کہ ہر کامل اپنی ذات میں کمالات سے عاری ہے اور کمالات سب اسی ہستی کے ہیں، جس ہستی کو ہبہ عطا فرمانے کی قدرت حاصل ہے، ساتھ ساتھ اسے سلب کرنے کی بھی قدرت ہے تو کسی کو اپنے کمال پر ناز نہ کرنا چاہئے۔

تشریح:

راہ سلوک میں عرصہ تک چلتے رہنے کے نتیجہ میں سالک پر اپنی صفات وکمالات کی نفی کا احساس غالب رہتا ہے، اس لئے کہ اسے دوران سلوک روزمرہ زندگی میں یہ تجربہ ومشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ راہ سلوک میں چل کر، نفسی قوتوں سے مقابلہ کرنا، اس کے اپنے بس کی بات نہیں ہے، یہ محض اللہ کا کرم تھا کہ اس نے اس سے نفس کا ہمالیہ پہاڑ طے کرایا، دوران سلوک طالب روزانہ کئی بار گرتا ہے پھر اٹھتا ہے، روزانہ مرتا ہے، پھر زندہ ہوتا ہے۔

مرنے سے مراد اس کا دل محبوب کے جلال کے تیروں سے چھلنی ہوتا رہتا ہے، یہ طالب کی روزمرہ کی کہانی ہوتی ہے، بیس پچیس سال کے مجاہدوں کے بعد کہیں جا کر، وہ حالت سکر سے حالت صحو اور حالت فنا سے حالت بقا میں آتا ہے۔ حالت بقا دراصل اپنی ذات اور اپنے کمالات کی مکمل نفی کی حالت ہوتی ہے۔

منتہی سالک قدم قدم پر یہ محسوس کرتا ہے کہ جس ہستی نے اسے ہبہ کے طور پر یہ نعمت عطا فرمائی ہے، وہ اس نعمت کو سلب بھی کر سکتا ہے۔ اس لئے منتہی صوفی صبر، شکر، توکل وقناعت، فقر اور نیستی کی حالت میں رہتا ہے۔ جو صوفی دعویٰ پر اتر آتا ہے یا دوسروں کی تحقیر کرنے لگتا ہے یا سرمایہ داروں کی سی زندگی گذارنے لگتا ہے، اکثر دیکھا گیا ہے کہ اس سے یہ نعمت سلب کر لی جاتی ہے۔ اس لئے صوفی کو کسی بھی مرحلے پر طریقت کے اصولوں کی خلاف ورزی سے ڈرتے رہنا چاہئے، اس سلسلہ میں حقیقی صوفیاء کی جو

حالت ہوتی ہے، وہ قابل دید ہوتی ہے۔ (مرتب)

وَإِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ أَنْ تَرْجُمُوْنِ. (سورۃ الدخان، آیت نمبر ۲۰)

(اور میں اپنے پروردگار اور تمہارے پروردگار کی پناہ لیتا ہوں، اس سے کہ تم لوگ مجھے پتھر سے قتل کرو)۔

اپنی قوت کے دعویٰ کی مذمت

حق تعالیٰ سے التجا اور اپنی شجاعت وقوت کا دعویٰ نہ کرنا (جیسے مدعیان تصوف کیا کرتے ہیں) یہ عبدیت (اپنے بندے ہونے کا) اظہار ہے۔

تشریح:

اللہ سے قربت کے مقامات کی حامل شخصیت اپنے آپ کو مکمل طور پر اللہ کی پناہ میں دیدیتی ہے، وہ اپنی ہمت وقوت کے دعویٰ سے خالی ہوتی ہے، یہی چیز عبدیت کا مظہر ہے اور شان عبدیت ہے۔ اس دور میں مدعیان تصوف میں دعویٰ کا رنگ غالب آ گیا ہے، اس لئے جذبۂ شہرت بھی موجود ہے تو زیادہ سے زیادہ مرید بنانے کی کاوشیں بھی۔

یہ علامت ہے، خام ہونے کی اور مجاہدوں کے فقدان کی، جب مجاہدے انتہا تک پہنچتے ہیں اور شیخ کی طویل عرصے کی صحبت نصیب ہوتی ہے تو دعویٰ ختم ہوجاتا ہے اور نفی کا رنگ غالب آجاتا ہے۔ (مرتب)

إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ. (سورۃ الاحقاف، آیت نمبر ۹)

(میں تو صرف اسی کا اتباع کرتا ہوں، جو میرے پاس وحی کے ذریعہ سے آتا ہے)۔

اپنے متبعین کے لئے نجات کا حکم صادر کرنا

آیت میں دو شخصوں پر رد ہے، جو اولیاء کی طرف کلی اور جزوی علم منسوب کرتا ہو اور دوسرا جو اپنے اور اپنے متبعین کے لئے نجات کا شدت سے (جزما) حکم کرتا ہو۔

تشریح:

علم کی اصل ہستی اللہ کی ذات ہے، اہل اللہ کو جو بھی علم عطا ہوتا ہے، وہ اسی کی

طرف سے عطا ہوتا ہے، اس لئے علم کو کلی یا جزوی طور پر اہل اللہ کی طرف منسوب کرنا، پھر اللہ کی صفات کو ان میں شمار کرنا، یہ جہالت ہے، جو اس دور میں کچھ زیادہ ہی ہوگیا ہے، بعض افراد کو دیکھا گیا ہے کہ منقبت کے نام پر اپنے بزرگوں کی اتنی تعریف کرتے ہیں کہ اللہ کی ساری صفات ان میں شامل کردیتے ہیں (اللہ معاف فرمائے) اپنے متعلقین کے لئے نجات کا شدت سے حکم کرنا، یعنی انہیں نجات کی بشارت سنانا، یہ بھی اس دور میں خام صوفیاء کا وتیرہ ہوگیا ہے، اس کی وجہ سے ان کے حلقوں سے وابستہ افراد عمل سے عاری ہورہے ہیں اور بزرگ سے پوجنے کی حد تک مظاہر محبت کرتے ہیں، یہ سب صوفیاء خام کی جہالت کا نتیجہ ہے۔ (مرتب)

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُم بِهَا فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ. (سورۃ الاحقاف، آیت نمبر ۲۰)

(جس روز کافر آگ کے سامنے لائے جائیں گے کہ تم اپنی لذت کی چیزیں اپنی دنیوی زندگی میں حاصل کرچکے اور ان کو خوب برت چکے سو آج تم کو ذلت کی سزا دی جائے گی)۔

کثرت دنیا کا باعث خطرہ ہونا

یہ آیت زہد پر دلالت ہے اور اس پر کثرت دنیا خطرہ کا باعث ہے، لیکن مطلقاً نہیں، بلکہ گناہوں کے ساتھ ہو۔

تشریح:

یہ آیت اس اعتبار سے بڑی لرزانے والی ہے کہ دنیا میں نعمتوں کے زیادہ استعمال سے کہیں آخرت کی نعمتوں کی سلبی کی صورت پیدا نہ ہو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو متعدد بار گوشت گھر لے جاتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ یہ کیا؟ پھر آپ نے قرآن کی یہ آیت پڑھی، اس لئے زیادہ نعمتوں کا استعمال اور دنیا کی کشادگی خطرے سے خالی نہیں، دنیا کی کل زندگی ہے ہی کیا کہ اس کی وجہ سے آخرت کی زندگی کو خطرے میں ڈالا جائے۔

زہد اور فقر، یہ ہر دور میں اللہ کے نیک بندوں کی خصوصیت رہی ہے، مال حاصل

ہونے کے باوجود وہ حالت فقر کو پسند کرتے ہیں، اس لئے بھی کہ اللہ کے رسول نے حالت فقر ہی کو اختیار کیا اور اسے ترجیح دی ہے اور اللہ کے رسول یہ دعا فرماتے تھے کہ یا اللہ، مجھے مسکینوں کے ساتھ رکھ، مسکینوں کے ساتھ موت دے اور مسکینوں کے ساتھ اٹھا، اللہ کے رسول ﷺ کی فقر کی یہ زندگی اہل اللہ کی امتیازی شان رہی ہے۔

اس سلسلے کی دوسری اہم بات یہ ہے کہ کثرت دولت کی ایک بُری خاصیت (جس کا مظاہرہ ہر دور میں ہوتا رہا ہے) وہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے نہ چاہتے ہوئے بھی فرد کے مادی رجحانات ومیلانات میں اضافہ ہوجاتا ہے، اس کے مزاج میں تغیر پیدا ہوجاتا ہے، اس میں غریبوں، فقیروں اور مسکینوں سے دوری، بلکہ ان سے کدورت پیدا ہونے لگتی ہے، اس میں تکبر کے اثرات آنے لگتے ہیں، بخل پیدا ہونے لگتا ہے، راحت کے سامان سے زیادہ سے زیادہ استفادے کا میلان بڑھنے لگتا ہے، دولت، فرد کی سرکشی میں اضافہ کردیتی ہے کہ اسے گناہوں کی دلدل میں مبتلا کرنے کا موجب بن جاتی ہے، ہر دور کے دولتمندوں کی بہت بڑی اکثریت کی یہی حالت رہی ہے،اس دور میں تو دولت، فردوافراد میں فساد پیدا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ بن گئی ہے، اہل مغرب کی نقالی، مادی تہذیب سے مرعوبیت اور اس تہذیب کے مظاہر ومناظر دولتمندوں کی نشانی بن گئی ہے، ہاں، یہ دولت جب حقیقی اہل اللہ کے یہاں آتی ہے تو وہ اپنے ساتھ فقر اور عاجزی کے احساسات لاتی ہے، وہ اس دولت کو اپنی ذات پر کم، بلکہ دینی خدمت کے مقاصد کے لئے زیادہ استعمال کرتے ہیں۔

مال اگر جائز طور پر حاصل ہو اور غیر شرعی کاموں اور شان وشوکت کے مظاہرے میں خرچ نہ ہو اور مال سے اللہ کی غریب مخلوق کے حقوق ادا کئے جائیں تو ایسا مال زہد کے منافی نہیں، لیکن مال کی خصوصیت ہے کہ وہ جہاں بھی آتا ہے، وہاں عام طور پر مال پر فدائیت کی ادائیں شروع ہوجاتی ہیں اور مال کے حوالے سے حرص وہوس کے بت مزید مستحکم ہوتے ہیں۔ ہاں، مال اگر حقیقی اہل اللہ کے پاس آتا ہے تو دل میں مال کی نہ تو ہوس موجود ہوتی ہے اور نہ ہی قدر وقیمت، ان کے لئے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا خوشی کا باعث بنتا ہے۔ (مرتب)

يَا قَوْمَنَا أَجِيبُوا دَاعِيَ اللَّهِ وَآمِنُوا بِهِ يَغْفِرْ لَكُم مِّن ذُنُوبِكُمْ وَيُجِرْكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ. (سورۃ الاحقاف، آیت نمبر۳۱)

(اے بھائیو، تم اللہ کی طرف بلانے والے کا کہنا مانو اور اس پر ایمان لے آؤ، اللہ تعالی تمہارے گناہ معاف کردے گا اور دردناک عذاب سے معاف رکھے گا)۔

بندے کا نجات پانا
اس کے استحقاق سے زیادہ ہونا

شاید ثواب کا ذکر نہ کرنا، اس طرف اشارہ ہو کہ بندے کا نجات پاجانا، یہ بھی اس کے استحقاق (اس کے حق) سے زیادہ ہے اور اپنے آپ کو درجات کا اہل کیوں سمجھے، یہ عین مذاق ہے قلندر کا۔

تشریح:

بندے کو آخرت میں نجات کا حاصل ہونااور عذاب سے بچانا، یہ اللہ کا بہت بڑا فضل اور اس کا انعام ہے، ورنہ پوری زندگی، عبادت واطاعت میں صرف ہونے کے باوجود فرد اللہ کی قدر دانی کا معمولی حق بھی ادا نہیں کرسکتا، اس کے یہ اعمال اس قابل ہی نہیں کہ اس کے لئے نجات کا ذریعہ بن سکیں، آخرت میں نجات کا حاصل ہونا، یہ اس کے استحقاق سے زیادہ ہے، اگر بندے سے صحیح طور پر احتساب ہوا تو اس کی بچت کی صورت مشکل ہوگی، لیکن آخرت میں اللہ کی رحمت پوری تابانیوں کے ساتھ ظاہر ہوگی، اس لئے انشاء اللہ بچت کی صورت پیدا ہوگی، اس صورت میں بندہ، بزرگی کے جس مقام بھی فائز ہوجائے، اس کے لئے ناز کی کوئی گنجائش موجود نہیں، بلکہ اسے تو ہر صورت میں اللہ کی نعمتوں کی شکرادائیگی کرنی چاہئے کہ اس نے اپنے فضل خاص سے نیکی کی توفیق عطا فرمائی ہے۔ (مرتب)

وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ . (سورۃ محمد، آیت نمبر۳۳)
(گناہ کرکے اپنے اعمال کو برباد مت کرو)۔

گناہ سے انوار وبرکات کا مضمحل ہوجانا

گناہ کرکے عمل باطل مت کرو، اس سے مراد ذات عمل نہیں، نور عمل ہے، گناہ سے اس کے انوار وبرکات مضمحل ہوجاتے ہیں، جب تک توبہ نہ کرے۔

تشریح:

گناہ کا سب سے بڑا نقصان جو ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس سے قلب کی نورانیت

ختم ہوکر، تاریکی غالب آنے لگتی ہے۔ اگر گناہوں میں اضافہ ہوتا رہے، ایک گناہ کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا تو اس سے قلب سیاہ ہوجاتا ہے، اس کے بعد قلب پر نصیحت کی باتیں بمشکل اثر انداز ہوتی ہیں، بلکہ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ گناہوں کے بعد اگر توبہ نہ کی گئی تو نیک اعمال کی توفیق چھن جاتی ہے۔ اور قلب میں نورانیت کی جگہ تاریکی آنے لگتی ہے، اس صورتحال سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ گناہ کے فوراً بعد خلوص دل سے توبہ کی جائے۔ (مرتب)

وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْماً . (سورۃ محمد، آیت نمبر۳۸)

(اور اگر تم روگردانی کروگے تو اللہ تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کرے گا)۔

دینی خدمت کے کام کو اپنی ذات کا مدار سمجھنا

اس میں اس گمان کو ختم کرنا ہے کہ کسی دینی خدمت کو اپنی ذات کا مدار سمجھے، جیسے بعض اہل عجب (عجب۔ تکبر کی ایک صورت ہے جسے خود پسندی بھی کہہ سکتے ہیں) اپنے کو دین کا مدار سمجھتے ہیں۔

تشریح:

دین کی خدمت کی سعادت کا حاصل ہونا، یہ اللہ کا فضل خاص ہے، وہ جسے عطا فرمائے، اس کام کو اپنا کارنامہ سمجھنا اور اپنی ذات کی طرف منسوب کرنا یا اپنی صلاحیتوں کا مرہون منت سمجھنا، دوسروں کے دینی کام کو حقیر سمجھنا اور یہ تاثر دینے کے لئے کوشاں رہنا کہ دینی تحریک، دینی دعوت یا دینی مدرسہ میری ذات سے قائم ہے، یہ ایسی ادا ہے، جو اللہ کو بہت ناپسند ہے، اس طرح کے فرد وافراد خود پسندی میں مبتلا ہوجاتے ہیں، ان سے بالآخر یہ سعادت سلب کردی جاتی ہے، یا ان کے دعوتی کام سے برکت ختم کردی جاتی ہے، اور آخرت میں بھی اس کے صلے سے محرومی کا خطرہ درپیش ہوتا ہے، اس لئے فرد خدمت دین کا جتنا بھی بڑا کام کرے، اسے محض اللہ کا فضل سمجھے، اپنی ذات کی مکمل نفی کرے، اور اس کام کو اپنی طرف منسوب کرنے کی ہرگز کوشش نہ کرے، ورنہ محرومی کے سوا کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔

هُوَ الَّذِىٓ أَنزَلَ السَّكِينَةَ فِىْ قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ. (سورۃ الفتح، آیت نمبر۴)

(وہ اللہ ایسا ہے، جس نے مسلمانوں کے دلوں میں تحمل پیدا کیا)۔

مؤمنوں کو سکینت عطا فرمانا

یہ ایک ایسی چیز ہے جس میں نور، قوت اور روح (موجود) ہوتی ہے، جس سے سکون حاصل ہوتا ہے اور اعمال میں سہولت پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ احوال میں ضبط پیدا ہوتا ہے۔

تشریح:

اللہ کی یہ سنت ہے کہ اخلاص کے ساتھ کام کرنے والے داعیوں کو جب بھی مصائب کا سامنا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے معاً بعد ان پر سکینت کی کیفیت عطا فرمادیتے ہیں، جس سے مصیبتوں کا احساس کافور ہوجاتا ہے، سکینت، خوشی، لذت، سہولت، دل کی کشادگی، اعمال میں آسانی، احساس مصیبت کی جگہ احساس حلاوت، یہ ساری چیزیں اللہ کی طرف سے انعام کے طور پر انہیں عطا فرمائی جاتی ہیں۔

نفس کے خلاف مجاہدے ہوں یا دشمن کے خلاف جہاد، اس معرکہ آرائی میں طالب جب بھی تھک جاتا ہے اور اس پر احساس مصیبت کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں، عین اسی وقت اللہ کی مدد شامل ہوجاتی ہے اور بندوں کی کیفیات میں پاکیزگی پیدا کرکے، انہیں خوشی وحلاوت سے سرشار کردیا جاتا ہے، یہ اللہ کی سنت ہے، جو ہر دور کے مخلص بندوں کے ساتھ ان کے اخلاص واستقامت کی برکت سے ان پر لاگو ہوتی ہے۔

فَتُصِيبَكُم مِّنْهُم مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِىْ رَحْمَتِهٖ مَن يَشَاءُ. (سورۃ الفتح، آیت نمبر۲۵)

(جس پر ان کی وجہ سے ضرر پہنچتا تو سب قصہ طے کردیا جاتا، لیکن ایسا اس لئے نہیں کیا، تاکہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں جس کو چاہے داخل کرے)۔

گناہ سے عمل کی صلاحیت کا ضعیف ہونا

یہاں سوال یہ ہے کہ جب بے خبری میں ان کے ہاتھ سے اہل ایمان پامال ہوتے تو اس میں کوئی معصیت (گناہ) نہ ہوتی تو پھر معرۃ بغیر علم کے کیا معنی، اس میں کئی اقوال

ہیں، جن کا حاصل طبعی افسوس کا اظہار ہے تو معصیت مراد ہی نہیں، میرے نزدیک زیادہ قریب بات یہ ہے کہ اگر چہ گناہ نہ ہو، لیکن خود عمل میں جو اگر چہ بغیر علم کے ہو، یہ خاصیت ہے کہ علم کے بعد اگر اس کا تدارک نہ کیا جائے تو نیکی کی استعداد میں کمی آ جاتی ہے، جس کا اثر اعمال میں پھر مشکلات ہے، اور اس کا ضرر ہونا ظاہر ہے اور اہل قلوب کو اس کا مشاہدہ ہوتا ہے۔

تشریح:

یہاں مولانا نے جو سب سے اہم نکتہ بیان فرمایا ہے، وہ یہ ہے کہ اخلاص نیت کے باوجود ہونے والے گناہ سے اگر چہ معصیت نہ ہو، لیکن گناہ میں جو خاصیت موجود ہے، وہ یہ ہے کہ اگر اس کے ازالہ کی کوشش نہ کی گئی تو اعمال صالحہ کی استعداد میں کمی واقع ہو جاتی ہے، کوشش کے باوجود نیک اعمال کے لئے دل میں آمادگی کا پیدا ہونا مشکل ہوتا ہے، فرد بس نیک اعمال کی خواہش ہی کر کے رہ جاتا ہے۔ گناہ کی یہ خاصیت ایسی ہے، جس کا اہل تصوف کو اکثر مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، اس لئے گناہ سے ہر ممکن حد تک بچنے کے لئے کوشاں ہونا چاہئے، اگر گناہ ہوجائے تو جلدی سے استغفار کیا جائے اور اس کے ازالہ کے طور پر اپنے اوپر جرمانہ مقرر کیا جائے، یا اگر ذکر فکر اور عبادت میں سستی واقع ہوئی ہے تو جرمانہ کے طور پر دگنی عبادت کی جائے، تاکہ نفس کو سزا کا شدت سے احساس ہو اور آئندہ وہ گناہ سے محتاط ہو۔

بندے کی یہ ادا اللہ کو ایسی پسند ہے کہ اس کی وجہ سے وہ گناہ سے قلب میں ہونے والے حجابات کو دور کر دیتا ہے اور شرح وبسط پیدا کر دیتا ہے۔

گناہ سے قلب میں اعمال صالحہ کی استعداد میں کوتاہی واقع ہونے یا حجابات پیدا ہونے کا نکتہ بہت اہم نکتہ ہے، جسے سمجھنے کی ضرورت ہے، تاکہ اس سلسلہ میں حساسیت پیدا ہو۔ (مرتب)

قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُل لَّمْ تُؤْمِنُوا وَلَٰكِن قُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ. (سورۃ الحجرات، آیت نمبر ۱۴)

(یہ گنوار کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، آپ فرما دیجئے کہ تم ایمان تو نہیں لائے بلکہ

یہ کہو کہ ہم مطیع ہو گئے اور ایمان تو اب تک تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا)۔

ہدایت کو اللہ کا احسان سمجھنا

اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اپنے اعمال پر نظر نہ کی جائے اور ہدایت کو اللہ تعالیٰ کا انعام وفضل سمجھا جائے۔

تشریح:

اعمال کی توفیق اللہ ہی کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔ راہ محبت کا طالب جب اصلاح نفس کی راہ پر چلتا ہے تو اسے قدم قدم پر اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ اگر اس پر اللہ کا فضل خاص نہ ہو تو وہ نہ تو اپنی کیفیات ایمانی کو برقرار رکھ سکتا ہے اور نہ ہی اعمال صالحہ پر اختیار رکھتا ہے۔ طالب کو روزمرہ زندگی میں اس کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، اس لئے راہ سلوک کا طالب فخر اور ناز سے کام نہیں لیتا، وہ اپنے عمل کو اپنی طرف منسوب نہیں کرتا، وہ اسے اللہ کی طرف منسوب کرتا ہے، اللہ کی اس توفیق پر وہ اپنے محبوب حقیقی پر فدا ہونے لگتا ہے اور آخری حد تک اس کی شکر ادائیگی سے کام لیتا ہے۔

یہ آیت اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ جب تک دل کی گہرائیوں میں ایمان کا نور داخل نہیں ہوتا، تب تک محض ظاہری اطاعت اور ظاہری اسلام، ایک تو فرد وافراد پر صبغۃ اللہ (اللہ کے رنگ کو) غالب کرنے کا ذریعہ نہیں بنتا، دوم یہ کہ اس طرح کے قبول اسلام سے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت آسان نہیں ہوتی، اس آیت سے ایک اہم نکتہ یہ معلوم ہوا کہ محض ظاہری اسلام پر اکتفا کرنا اور مجاہدوں کے ذریعہ دل میں ایمان کے نور کو داخل کرنے کے لئے کوشاں نہ ہونا، اس طرح کا اسلام مطلوب نہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ کو ایسی اطاعت محبوب ہے، جس میں دل میں اللہ کے لئے والہانہ محبت موجود ہو، اللہ پر فدائیت کا رنگ غالب ہو، اللہ پر ایمان ویقین کی پوری فضا موجود ہو۔

ظاہری اطاعت اگر چہ نعمت ہے، لیکن اس نعمت کی اصل قدر وقیمت ایمان پر محنت کے نتیجہ میں ہی حاصل ہوگی، دل پر جتنی زیادہ محنت ہو، اسلام میں اتنا زیادہ نکھار پیدا ہوگا، ورنہ زبان سے تو اسلام جاری ہوگا، لیکن عملی زندگی ایمان کے اثرات سے خالی ہوگی، موجودہ دور میں یہی ہورہا ہے کہ دل میں ایمان کو مستحکم کرنے کے لئے مجاہدوں سے

بے نیازی کی روش غالب ہے، چنانچہ ہماری عملی اور معاشرتی زندگی مادہ پرست قوموں کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے اور مادی زندگی کا بہتر مستقبل ہماری زندگی کا سب سے بڑا ہدف بن گیا ہے، اس آیت میں ظاہری اطاعت کے ساتھ ساتھ دل کی تبدیلی پر سب سے زیادہ زور ہے کہ دل کے بدلنے سے ہی شخصیت پر ایمان کا رنگ غالب ہوتا ہے۔

فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ. (سورۃ ق، آیت نمبر ۳۹)

(سوان کی باتوں پر صبر کیجئے اور اپنے رب کی تسبیح اور تعریف کرتے رہئے)۔

توجہ الی اللہ مصیبتوں سے
بچاؤ کا طاقتور ذریعہ

اس میں صاف دلالت ہے کہ مصیبتوں میں تسلی کا سب سے طاقتور ذریعہ توجہ الی اللہ ہے۔

تشریح:

ہر مصیبت، غم، دکھ، اذیت سے بچاؤ کا سب سے بڑا ذریعہ اللہ کا ذکر، اس کی تسبیح وتعریف ہے، اللہ کا یہ ذکر جب مزاج کا حصہ بن جاتا ہے تو توجہ الی اللہ مستحکم ہوجاتی ہے، توجہ الی اللہ کے راسخ ہوتے ہوئے بڑے سے بڑا غم اور بڑی سی بڑی تکلیف ہیچ محسوس ہوتی ہے، اس لئے کہ اللہ کی یاد سے دل منور اور شاداب ہوتا ہے، تکلیف، مصیبت اور غم کا احساس تو دراصل محبوب سے دوری ہی کا نتیجہ ہوتا ہے، محبوب سے ذکر وعبادت کے ذریعے تعلق قائم ہونے کے بعد مصیبت وغم کا احساس ازخود احساس حلاوت ولذت میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

یہ ایسا اہم نکتہ ہے، جو بندہ مؤمن کے سکون وراحت اور اس کی جملہ بیماریوں وشفایابی کا علاج ہے، لیکن مادہ پرستی پر مشتمل تہذیب کے ہمہ گیر اثرات کی وجہ سے اس دور میں یہی نسخۂ کیمیا ہے، جو سب سے زیادہ نظر انداز ہوا ہے، اب حالت یہاں تک پہنچی ہے کہ کسی بھی تقریب اور مجلس میں اللہ کے ذکر اور توجہ الی اللہ کی بات شروع ہوتے ہی بیزاری کی روش غالب ہونے لگتی ہے، یعنی مزاج اتنا مسخ ہوگیا ہے کہ مسلمان، اللہ کے ذکر کے حوالے سے بات سننے پر ہی تیار نہیں، دنیا بھر کی باتوں کے لئے وقت موجود ہے اور

دل میں ان کے لئے آمادگی بھی، لیکن اللہ کے ذکر کی بات شروع ہوتے ہی بے چینی شروع ہوجاتی ہے۔

موجودہ معاشرے کی فساد انگیزی کا اہم اور بنیادی سبب افراد کی اللہ کے ذکر اور توجہ الی اللہ کے سلسلہ میں یہی روش ہے، اس روش کے ہوتے ہوئے معاشرے کی صحت وسلامتی کے سارے راستے مسدود ہوجاتے ہیں۔

بندہ مؤمن کو جو بھی تکلیف ومصیبت درپیش ہوتی ہے، اس سے بچاؤ کے لئے وہ اللہ ہی کی طرف رجوع ہوتا ہے اور اسی سے آسانی اور معافی طلب کرتا ہے، اس لئے وہ نہ تو بے قابو ہوتا ہے اور نہ ہی وہ لوگوں کو مدد کے لئے پکارتا ہے۔ بندے کی اللہ سے مانگنے کی نفسیات اتنی پختہ ہوتی ہے کہ اسے دوسروں کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہی لاحق نہیں ہوتی، وہ اپنے ہر معاملہ میں اللہ ہی سے دل کی گہرائیوں سے مانگنے لگتا ہے۔ اسے آئے دن اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ اس عمل سے یا تو اس کے لئے آسانی کا معاملہ ہوتا ہے اور وہ اس مصیبت وبحران سے نکل آتا ہے یا پھر اسے صبر وشکر، تحمل وبردباری کے ساتھ سکینت کی حالت عطا کردی جاتی ہے، اس سے اس کی اس مصیبت کا احساس ختم ہوجاتا ہے، بندہ مؤمن پر اللہ کی یہ ایسی ادا ہے کہ وہ اس کا جتنا بھی شکر واحسان ادا کرے، کم ہے۔ (مرتب)

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ. (سورۃ الذاریات، آیت نمبر ۳۹)

(میں نے جن وانس کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کریں)۔

جن وانس کی پیدائش کا مقصد

مجاہد سے اس کی معنی لیعرفون (یعنی اپنی معرفت کے لئے پیدا کیا ہے) نقل کی گئی ہے، اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ عبادت، معرفت کے بغیر اہمیت کے لائق نہیں ہوتی اور نہ معرفت بغیر عبادت کے، اب اہل ظاہر نے صرف عبادت کی صورت کو لے لیا ہے اور جاہل صوفیوں نے صرف معرفت کو۔

تشریح:

عبادت کا حق معرفت کے بغیر کچھ بھی ادا نہیں ہوسکتا، اور اللہ کی معرفت کے بغیر

نفس کی حالت میں بنیادی تغیر پیدا ہو اور نفس کے بتوں کی پرستش سے بچاؤ کی صورت پیدا ہو، محال ہے اور فنائے نفس کے بغیر عبادت واطاعت میں نفسی قوتوں کی شدید آمیزش شامل ہوتی ہے، ریا، تکبر، عبادت میں دل کی عدم حاضری، خشوع وخضوع کا فقدان، دوران عبادت دنیا بھر کی باتوں کی یاد وغیرہ یہ ساری چیزیں اللہ کی معرفت سے محرومی یا اس کے فقدان کا نتیجہ ہوتی ہیں، اس لئے لیعبدون سے لیعرفون مراد لینا بالکل صحیح ہے، حقیقت یہ ہے کہ عبادت میں روح، معرفت ہی سے پیدا ہوتی ہے، معرفت سے ہی اللہ کی شان عظمت کا غلبہ پیدا ہوتا ہے۔

لیکن معرفت کی ایسی تشریح، جس میں اللہ ورسول کی اطاعت سے بے نیازی ہو، اس کی اہمیت موجود نہ ہو، ایسی معرفت صوفیائے خام کی اختراع ہے، اصل معرفت وہی ہے جس سے اللہ کی مخلصانہ عبادت واطاعت وجود میں آتی ہو، صوفیائے خام اسلامی شریعت سے خود بھی دور رہتے ہیں، تو اپنے حلقہ اثر کو بھی اللہ ورسول کی اطاعت سے دور رکھتے ہیں، ایسی معرفت کے حامل سزا کے مستحق ہیں، نہ کہ انعام کے۔

جہاں اللہ کی معرفت ضروری ہے، وہاں زندگی بھر کے معاملات میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت بھی ناگزیر ہے، اس کے بغیر ایمان کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔

فَفِرُّوا إِلَى اللَّهِ إِنِّي لَكُم مِّنْهُ نَذِيرٌ مُّبِينٌ. (سورۃ الذاریات، آیت نمبر ۵۰)

(تو تم اللہ کی طرف دوڑو، میں تمہارے واسطے اللہ کی طرف سے کھلا ڈرانے والا ہوں)۔

توجہ الی اللہ کے لئے ذوق وشوق کا ہونا

اس میں دلالت ہے کہ توجہ الی اللہ کے لئے خوب ذوق وشوق ہونا چاہئے۔

تشریح:

اللہ کی ذات ایسی عظیم اور محسن ہستی ہے کہ اس کی طرف سے سستی اور غفلت کی عادت کو ختم کرنے کے لئے دوڑنے کی ضرورت ہے، سست رفتاری سے نہیں، بلکہ حوصلہ وہمت سے کام لے کر، اس کے ذکر وفکر اور عبادت واطاعت میں تیز رفتاری سے چلنے کی ضرورت ہے۔ فرد جب اللہ کی طرف پوری قوت اور ساری توانائیوں کے ساتھ چلے گا اور اس سلسلہ میں کسی عذر اور بہانے کو حائل نہ ہونے دے گا تو اس کی طرف سے اس کے

لئے راہیں ہموار کر دی جائیں گی، حجابات دور کر دیئے جائیں گے اور ذکر وفکر اور اطاعت کی راہ آسان سے آسان تر کر دی جائے گی۔ لیکن اکثر دیکھا گیا ہے نفس، شیطان اور مادی ماحول کے اثرات سے فرد پر غفلت کی ایسی حالت طاری ہوتی ہے کہ دنیا کے ہر کام کے لئے اس کے پاس وقت موجود ہے، لیکن اگر وقت نہیں ہے تو اللہ کی راہ محبت، ذکر کے حلقوں میں شرکت اور عبادت کے مزاج کو راسخ کرنے کے لئے وقت نہیں۔ پھر نفس کی طرف سے ضروری کاموں کے ایسے بہانے تراشے جاتے ہیں کہ اس طرح کے طرز عمل سے واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ دل میں اللہ کی محبت اور اس کی قدر موجود نہیں ہے، قدر اگر ہے تو وہ مادی دنیا اور اس کی پیدا کردہ مصنوعی ضروریات کی ہے، ان چیزوں کے لئے فرد کے پاس بہت وقت موجود ہے اور ان کاموں کی راہ میں رکاوٹ کے لئے کوئی بہانہ موجود نہیں ہے، سارے بہانے راہ محبت، عبادت وذکر ہی کے لئے ہیں۔

ہم سے مطالبہ ہے کہ اللہ کی راہ محبت کو سارے کاموں پر ترجیح دے کر، دوسرے کاموں کو اوپر نیچے کر کے، اس کام کو سب سے زیادہ ترجیح دی جائے اور راہ اطاعت ومحبت میں تیز رفتاری سے چلا جائے۔

جب اللہ کی راہ محبت کو ثانوی حیثیت یا اس سے بھی کم حیثیت دی جاتی ہے، جس کی علامت یہ ہے کہ ذکر کے لئے برائے نام وقت نکالا جاتا ہے اور ذکر کے اجتماعی حلقوں میں شرکت بھی بھاری بوجھ سمجھا جاتا ہے تو اس کے نتیجہ میں اللہ کی طرف سے اپنی راہ میں چلنے کی سعادت یا تو سلب کر دی جاتی ہے یا فرد کو اس کی طلب کے فقدان کی وجہ سے اسے سست رفتاری سے چلایا جاتا ہے، سست رفتاری سے نفسی قوتیں پوری طرح تابع ہوں، دل وروح کو سکینت حاصل ہو، دشوار تر بات ہے۔ (مرتب)

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ.
(سورۃ الطور، آیت نمبر ۴۸)

(اور آپ اپنے رب کی تجویز پر صبر سے بیٹھے رہئے کہ آپ ہماری حفاظت میں ہیں، اور اٹھتے وقت اپنے رب کی تسبیح وتعریف کیا کیجئے)۔

سکینت میں مراقبۂ حضور کا کردار

اس سے معلوم ہوا کہ صبر وسکینت کے حصول میں مراقبۂ حضور (اللہ کے دھیان کے

غلبہ) کو قوی عمل دخل حاصل ہے۔

تشریح:

اللہ کے دھیان سے متوجہ الی اللہ ہونے کا ملکہ راسخ ہوتا ہے، عبادت وذکر وفکر میں حلاوت محسوس ہوتی ہے، ذہنی وفکری انتشار دور ہوتا ہے، اعمال صالحہ میں چستی پیدا ہوتی ہے، دنیا میں اپنے کردار کی ادائیگی کی فکر غالب ہوتی ہے، ہر طرح کی بُرائی سے بچنے کی سبیل پیدا ہوتی ہے، سب سے بڑی بات یہ کہ صبر وسکینت پیدا ہوتا ہے، مراقبۂ حضور کے کتنے غیر معمولی فوائد وثمرات ہیں، لیکن مادیت پرستی کے موجودہ ماحول نے فرد وافراد کے گلوں میں ایسے طوق ڈال دیئے ہیں کہ مراقبہ کی طرف آنے کی راہ میں یہ طوق حائل ہیں، اس لئے دیکھا گیا ہے کہ لاکھوں کی آبادی میں ذکر کے حلقے اور خانقاہیں ویران رہتی ہے، اس طرف بمشکل چند افراد کو آنے کی سعادت حاصل ہوتی ہے، حالانکہ اللہ سے دوری کے نتائج بھی سب کو بھگتنے پڑتے ہیں کہ گھروں میں لڑائی جھگڑے بڑھ رہے ہیں، دوستیاں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں، خاندانی نظام میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل جاری ہے، عورتیں، آزادی کی راہ پر گامزن ہو کر ذہنی مریض بن رہی ہیں، لیکن اس کے باوجود اللہ کی طرف رجوع ہونے کی طلب پیدا ہونے نہیں پاتی، یہ موجودہ معاشرے کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

مراقبہ جب دل کی گہرائیوں سے ہونے لگتا ہے تو فرد کا دل اللہ کے انوار حسن سے محظوظ ہونے لگتا ہے، اس پر نفس کی گرفت کا عمل رفتہ رفتہ ٹوٹنے لگتا ہے، جب دل، نفس کی قوتوں سے آزاد ہونے لگتا ہے تو وہ خالص محبوب کا ہو جاتا ہے، اس سے اس کی خوشی وسکینت میں بے پناہ اضافہ ہونے لگتا ہے۔ جب دل کے احساسات پاکیزہ ہو جائیں تو ساری زندگی پاکیزہ ہونے لگتی ہے۔ انسان تو دراصل نام ہی احساس کا ہے، احساس پاکیزہ ہے تو زندگی پاکیزگی کا نمونہ بن جاتی ہے، اگر احساس پاکیزہ نہیں ہے اور وہ حب جاہ وحب مال سے عبارت ہے تو اس کے نتیجے میں سکون وسکینت سے محرومی ہو جاتی ہے اور فرد کی زندگی سارے علم اور سارے وسائل کے باوجود اجیرن بن جاتی ہے، بدقسمتی سے اس دور میں علوم وفنون کی کثرت اور مادیت کے غلبہ کی وجہ سے یہ نکتہ نظر انداز ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے زندگی پریشانی اور اضطراب کا نمونہ بن گئی ہے۔ (مرتب)

فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَى. (سورۃ النجم، آیت نمبر ۳۲)

(اور تم اپنے آپ کو مقدس (پاکیزہ) مت سمجھا کرو، تقویٰ والوں کو وہ خوب جانتا ہے)۔

عمل سے اللہ کا قرب مقصود ہونا

زیادہ قریب تفسیر یہ ہے کہ عمل سے اصل مقصود اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا ہے اور وہ قرب غیر کے عمل سے یا کسی کی برکت سے نہیں ہوتا اور موہوب ہونا اور بات ہے۔

تشریح:

اکثر دیکھا گیا ہے کہ افراد، بزرگوں سے فیض نظر کی امید رکھتے ہیں اور ان کی دعا کی برکت سے اپنے سارے مسائل کا حل چاہتے ہیں اور یہ آرزو رکھتے ہیں کہ وہ خود تو مجاہدے نہ کریں، اور انہیں بزرگوں کے فیض نظر سے سب کچھ حاصل ہو جائے۔ عمل کی قوت بھی تو سکون وسکینت بھی، جب کہ اللہ کا قانون جدوجہد سے وابستہ ہے کہ فرد خود محنت ومجاہدوں سے کام لے گا تو اس کے حالات میں تغیر پیدا ہونا شروع ہوگا، ورنہ دوسروں کے عمل یا برکت سے زندگی میں فیصلہ کن تبدیلی واقع نہیں ہوتی، اپنے آپ کو پاکیزہ سمجھنا، ہر اعتبار سے خسارے کا سودہ ہے۔ پاکیزگی، مجاہدوں سے حاصل ہوتی ہے، جو مجاہدوں کی برکت سے پاکیزہ ہوتے ہیں یا تزکیہ کی صلاحیت کے حامل ہوتے ہیں، ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ نیکی کی اپنی ساری سعادت کو اللہ کا فضل خاص شمار کرتے ہیں۔ وہ اللہ کی شان عظمت کے سہارے اپنی شخصیت کو مٹا دیتے ہیں اور اپنے آپ کو کچھ بھی نہیں سمجھتے۔ (مرتب)

وَأَنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنتَهَىٰ. (سورۃ النجم، آیت نمبر ۴۲)

(اور یہ کہ آپ کے پروردگار کے پاس ہی پہنچنا ہے)۔

منتہی کے سیر کا مکمل ہونا

بعض نے یہ مراد لی ہے کہ یہ منتہی کی حالت ہے یعنی رب سے اس طرف سیر کی فکر ہے اور جب رب کی طرف اس کی توجہ (مستحکم) ہوئی تو اس کی سیر بند ہوگئی۔

تشریح:

طالب ابتدا میں نفس کی گرفت میں ہوتا ہے اور اس پر مادی اثرات کا غلبہ موجود ہوتا

ہے، جب وہ راہ سلوک میں مجاہدوں سے کام لیتا ہے تو وہ رفتہ رفتہ نفسی قوتوں کے اثرات سے اوپر اٹھنا شروع ہوجاتا ہے، اس پر نفسی قوتوں کی گرفت رفتہ رفتہ کمزور ہوتی چلی جاتی ہے اور وہ اللہ کی طرف آگے بڑھنا شروع کردیتا ہے اور اس کی نفسی قوتوں پر روحانی وملکوتی قوتیں بتدریج غالب ہونا شروع ہوجاتی ہیں، یہ عمل طویل عرصے تک جاری رہتا ہے اور طالب صادق کو اس کام کے لئے کافی وقت دینا پڑتا ہے۔

جب وہ غیر معمولی مجاہدوں سے اللہ کی طرف سیر کرنے میں کافی حد تک کامیاب ہوتا ہے تو اس پر نفس اور مادی قوتوں کا زور ٹوٹنے لگتا ہے، جب وہ اللہ کے قرب ووصال کے مقام کے حصول میں کامیاب ہوا تو اس کا سفر بڑی حد تک طے ہوگیا، اب اس کے غیر معمولی مجاہدوں کا باب بند ہوگیا، اب اللہ کی کشش اسے اپنی طرف کھینچنے لگتی ہے۔ اس کو حالت فنا سے حالت بقا کا سفر بھی کہتے ہیں، جب تک طالب حالت فنا کے سفر میں ہے، تب تک وہ شب وروز غیر معمولی مجاہدوں میں مصروف رہتا ہے۔ اور وہ محبوب کے ساتھ حالت سکر میں رہتا ہے۔ اس کی چاہت صرف اور صرف محبوب ہوتی ہے، جب اسے محبوب کا ایک حد تک وصال حاصل ہوگیا تو اب وہ حالت صحو میں آجاتا ہے، جہاں اس کی توجہ دنیاوی معاملات کی طرف بھی مبذول ہونے لگتی ہے۔ (مرتب)

فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ. (سورۃ الرحمٰن، آیت نمبر ۷۷)

(سوائے اہل جن وانس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے)۔

نعمتوں کا استعمال، زہد کے منافی نہیں

اس آیت کا مختلف نوعیت کے مضامین کے پیچھے آنا اور جن میں بعض کا نعمت ہونا ظاہر بھی نہیں، اس پر دلیل ہے کہ نعمت کی مختلف قسمیں ہیں۔ کوئی حسی ہے، کوئی معنوی، اسے اہل بصیرت اپنے اوقات اور حالات میں سمجھتے ہیں، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مختلف قسم کی نعمتوں سے استفادہ کرنا مطلوب ہے، یہ چیزیں زہد اور اللہ سے تعلق کی راہ میں رکاوٹ نہیں۔

تشریح:

دنیا میں اللہ کی بے شمار نعمتیں ہیں، بلکہ یہ ساری کائنات اللہ نے انسان کے لئے

بنائی ہے اور انسان کو اپنی عبادت کے لئے بنایا ہے۔ نعمتوں سے استفادہ کرنا، اللہ کی شکر ادائیگی کا ذریعہ ہے۔ لیکن سب سے بڑی نعمت تو باطنی نعمت ہے۔ جب فرد کا باطن اللہ سے جڑ جاتا ہے تو نعمتوں کی حق ادائیگی کی صحیح صورت بھی پیدا ہوتی ہے۔ مادی نعمتوں کا استعمال زہد کے منافی نہیں ہے۔ بندہ مؤمن کو اپنی صحت کے لئے اچھے کھانے کی ضرورت ہے، تاکہ وہ اپنے حقیقی محبوب ومعبود کی مستعدی سے عبادت کرسکے۔ (مرتب)

وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ أُولَٰئِكَ الْمُقَرَّبُونَ. (سورۃ الواقعہ، آیت نمبر ۱۰۔۱۱)

(اور جو اعلیٰ ہی درجہ کے ہیں وہ تو اعلیٰ درجہ کے ہیں وہ خاص قرب رکھنے والے ہیں)۔

مقربین کے رتبہ کا بلند ہونا

اس سے معلوم ہوا کہ مقربین کا رتبہ صلحاء مؤمنین سے بلند ہے اور اہل تصوف کا یہی مقصود ہے۔

تشریح:

مقربین کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ اللہ سے وصال کے لئے سراپا جہد ہوتے ہیں، انہیں محبوب کے انوار حسن نے اتنا فریفتہ کیا ہوتا ہے کہ وہ دل کے آئینہ کی مسلسل صفائی اور اس کے ذریعہ محبوب کے انوار حسن کے مشاہدہ میں رہتے ہیں، اس طرح وہ محبوب اور اپنے درمیاں فاصلہ کو کم سے کرنے کے لئے کوشاں ہوتے ہیں، ان کی ساری زندگی اسی کام میں صرف ہوجاتی ہے۔ (مرتب)

فَأَمَّا إِن كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِينَ . (سورۃ الواقعہ، آیت نمبر ۸۸)

(پھر جو شخص مقربین میں سے ہوگا)۔

اللہ کا مقرب

یہ دلیل ہے اس بات کی کہ اللہ کا مقرب وہی ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ مقرب بنالے۔

تشریح:

اہل تصوف کی ساری جدوجہد کا حاصل یہ ہے کہ اللہ سے قرب کا مقام حاصل ہو

سکے، اللہ کے اس قرب کے مقام کے حصول کی راہ میں نفسی اور مادی قوتیں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ جب نفسی قوتوں کا زور نہیں ٹوٹتا، بندے کو قرب کا مقام حاصل نہیں ہوتا تو طالب صادق نفسی قوتوں کے خلاف غیر معمولی مجاہدے کر کے، اللہ کے فضل خاص سے نفس کے زور کو توڑ دیتا ہے، اس طرح قرب کی راہ میں حائل رکاوٹ دور ہوجاتی ہے۔ صلحاء کا بھی اپنا مقام ہے، لیکن وہ چونکہ نفسی قوتوں کے مشاہداتی عمل سے پوری طرح نہیں گزرے ہوتے، اس لئے ایک تو وہ دوسروں کو تربیت کے مراحل سے گزارنے کی صلاحیت کے حامل نہیں ہوتے، دوسرے یہ کہ وہ مقربین کی فہرست میں شامل نہیں ہوتے، تاہم صلحاء کے لئے اللہ کا وعدہ ہے، اس لئے ان کی اہمیت کو کم سمجھنا صحیح نہیں۔ (مرتب)

أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَن تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ. (سورۃ الحدید، آیت نمبر ۱۶)

(کیا ایمان والوں کے لئے اس بات کا وقت نہیں آیا کہ اللہ کے ذکر اور جو دین حق نازل ہوا ہے اس کے سامنے جھک جائیں)۔

دل کی محرومی کا نتیجہ ہونا

سختی کا ذکر سے

اس میں واضح دلالت ہے خشوع کے لازم ہونے کی اور اس پر کہ دل کی سختی (ذکر سے) زیادہ غفلت سے پیدا ہوتی ہے اور اس پر کہ دل کی سختی کا علاج ذکر اللہ کی کثرت ہے۔

تشریح:

ذکر سے غفلت ومحرومی کی وجہ سے جو نقصانات ہیں، وہ اتنے زیادہ ہیں کہ جنہیں شمار کرنا مشکل ہے۔ ذکر سے محرومی خود اس دنیا میں سب سے بڑا عذاب ہے کہ اس سے عقل میں خلل واقع ہوتا ہے، فکر کی صحت متاثر ہوتی ہے۔ ہر چیز کا منفی پہلو غالب ہوکر فرد کے اضطراب اور مایوسی کا سبب بنتا ہے، ذکر سے محرومی کا جو بڑا نقصان ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ دل سخت ہوتا ہے یعنی فرد قساوت قلبی کا شکار ہوجاتا ہے، جس سے بے رحمی، سنگ دلی، انسان آزاری اور مخلوق کی حالت زار پر رحم سے محرومی پیدا ہونے لگتی ہے، فرد پر نفسانیت

غالب ہوجاتی ہے، وہ صرف اور صرف اپنی دنیا میں جینے لگتا ہے، ذکر سے محرومی کا بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اخلاق میں پاکیزگی اور بہتری پیدا نہیں ہوتی۔

دوسرا بڑا نقصان جو ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ ذہن فکری انتشار کا شکار ہوجاتا ہے اور مزاج میں جھنجھلاہٹ غالب ہونے لگتی ہے۔

ذکر سے غفلت کے کتنے بڑے نقصانات ہیں، جو فرد کو بھگتنے پڑتے ہیں۔ ذکر کے ماحول سے جڑنے کی سخت ضرورت ہے، ورنہ فرد دنیا میں مادے کی بے رحم طاقتوں کی نذر ہوجاتا ہے اور آخرت میں اللہ کے عتاب کا شکار۔ (مرتب)

اعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ. (سورۃ الحدید، آیت نمبر ۲۰)

(تم خوب جان لو کہ دنیوی زندگی محض لھو ولعب زینت اور باہم ایک دوسرے پر فخر کرنا ہے)۔

زہد کا اختیار کرنا

اس میں دنیا سے زہد اختیار کرنے کی تاکید ہے۔

تشریح:

دنیا کی زندگی کی کل حیثیت کھیل کود سے زیادہ نہیں، فرد کو ساری دنیا کی دولت بھی حاصل ہوجائے تو اس سے اسے کونسا سکون حاصل ہوگا؟ وہ جذباتِ حسن سے کیسے سرشار ہوگا، بلکہ اس سے تو اس کا سکون مزید برباد ہوگا۔ دولت سے مزید دولت پیدا کرنے، دولت کے محفوظ ہونے کی فکر، دولت کے معمولی نقصان ہونے سے ذہنی انتشار کا عذاب، یہ ساری چیزیں دولت کی خصوصیات میں شامل ہیں، دنیا کی ساری مصروفیات دراصل کھیل وکود سے زیادہ نہیں ہوتی، کوئی بھی فرد کھیل کود میں اپنا سارا وقت برباد نہیں کرتا، اس لئے دنیا سے بے رغبتی حاصل ہونا ضروری ہے، اس سے فرد پر سکینت غالب رہتی ہے (اگر ایسا فرد کثرت ذکر سے بھی کام لیتا ہوتو)۔ (مرتب)

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا. (سورۃ الحدید، آیت نمبر ۲۷)

(انہوں نے رھبانیت کو خود ایجاد کر لیا ہم نے ان پر اس کو واجب نہ کیا تھا، لیکن انہوں نے اللہ کی رضا کے لئے اس کو اختیار کیا تھا، سوانہوں نے اس کی پوری رعایت نہ کی)۔

نیک اعمال کے معمولات کو ترک نہ کرنے کی تاکید

جس رہبانیت کو انہوں نے اللہ کی رضا کی طلب کی خاطر اختیار کیا تھا، اس پر ان کی مذمت نہیں کی گئی، بلکہ اس سے معلوم ہوا کہ جو اوراد و معمولات اختیار کئے جائیں ان کو ترک کرنا ناپسندیدہ ہے، اس رعایت میں سارے اچھے اعمال واحوال آ گئے کہ وہ چھوٹنے نہ پائیں۔

تشریح:

بعض مستحب اعمال جب معمول ہوجائیں تو ان میں بہت زیادہ مصروفیت، یعنی ایسی مصروفیت کہ دوسرے ضروری اور جائز کاموں کے لئے وقت نہ مل سکے، یہ صحیح طرز عمل نہیں، بندہ مومن کو اپنی زندگی میں اعتدال پیدا کرنا چاہئے، عبادت وذکر فکر کے ساتھ ساتھ گھر کے کاموں کے لئے وقت نکالنا چاہئے، دوستوں کو بھی وقت دینا چاہئے۔ دعوتی کاموں کے لئے فکر مندی ضروری ہے، یہ سارے کام اسی وقت ہو سکتے ہیں، جب اعمال میں اعتدال کا مزاج پیدا ہوگا۔ ورنہ بہت سارے کام متاثر ہوں گے۔ اگرچہ متوسط صوفی کی حالت ایسی ہوتی ہے کہ وہ اس معمول کو قائم وبرقرار رکھنے میں کامیاب نہیں ہوتا، اس لئے کہ عشق ومحبت کا داعیہ اس کا سب سے زیادہ وقت لے لیتا ہے، چونکہ نفس کو مہذب بنانے کا عمل سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے، اس لئے متوسط صوفی کو اس معاملہ میں معذور سمجھا جائے گا، آگے چل کر اس کی زندگی میں ازخود اعتدال پیدا ہوجائے گا۔ (مرتب)

ذَٰلِكُمْ تُوعَظُونَ بِهِ. (سورۃ المجادلہ، آیت نمبر۳)

(اس سے تم کو نصیحت کی جاتی ہے)۔

غلطی کی تلافی کی صورت

جب بھی فرد سے کوئی شرعی غلطی سرزد ہوجائے تو اس کی تلافی کے لئے مالی جرمانہ

ادا کرنا چاہئے، کیونکہ یہ اسلاف طریقہ رہا ہے۔

تشریح:

اعمال کی اصلاح کے لئے بزرگوں کے اس طریقہ میں بڑی حکمت پوشیدہ ہے، اس سے نفس کو سخت انتباہ ہوتا ہے اور آئندہ اس کے لئے گناہوں سے باز رہنے کے امکانات قوی ہوجاتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ دوبارہ ایسی حرکت کرنے سے جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔ (مرتب)

ءَأَشْفَقْتُمْ أَن تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَاتٍ فَإِذْ لَمْ تَفْعَلُوا وَتَابَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ. (سورۃ المجادلہ، آیت نمبر۱۳)

(کیا تم اپنی سرگوشی سے قبل جرمانہ دینے سے ڈر گئے، سو جب تم نہ کر سکے تو اللہ نے تمہارے حال پر عنایت فرمائی)۔

انفاق پر قادر نہ ہونے پر تسلی

اس میں اس شخص پر تسلی ہے، جو انفاق پر قادر نہ ہو، اس میں وہ بھی داخل ہے، جو شیخ کو ہدیہ نہ دے سکے، شیخ کو اس کی تسلی کرا دینا زیبا ہے۔

تشریح:

جو اللہ کی راہ میں خرچ کرنا چاہتا ہے، لیکن مالی وسائل کے فقدان کی وجہ سے وہ ایسا کرنے سے قاصر ہے، اسے نیت کی وجہ سے ثواب ضرور ملے گا۔ ایسا فرد جو اپنے شیخ کو ہدیہ نہ دے سکے، شیخ کو اس کی تسلی کرانا چاہئے، اگرچہ شیخ کسی ہدیہ کا طالب نہیں ہوتا، لیکن طالب، چونکہ شیخ سے والہانہ محبت رکھتا ہے، اس لئے کہ شیخ سے محبت اور اس کی صحبت کی وجہ سے اس کی نئی اور معنوی زندگی شروع ہوجاتی ہے اور وہ ذہنی اذیت سے بڑی حد تک محفوظ ہونا شروع ہوتا ہے، اس کے لئے اشتعال کی نفسیات سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے، وہ زندگی بھر کے معاملات میں خود اعتمادی سے بہرہ ور ہونے لگتا ہے، اس میں نرمی اور شفقت پیدا ہونے لگتی ہے، یہ اہل اللہ کی صحبت اور اللہ کے ذکر کی برکت ہوتی ہے، اپنی زندگی میں ان اثرات کی وجہ سے وہ دل سے شیخ کی خدمت کرنا چاہتا ہے، جو ہدیہ وغیرہ کی صورت میں ہوتی ہے۔ طالب اپنی محبت کی بنا پر جب مالی وسائل کے فقدان سے ایسا

کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا تو وہ دل میں اذیت محسوس کرتا ہے، اس طرح کی صورتحال میں شیخ کو طالب کی تسلی کرنا ضروری ہے۔ (مرتب)

اسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَأَنسَاهُمْ ذِكْرَ اللَّهِ أُوْلَئِكَ حِزْبُ الشَّيْطَانِ. (سورۃ المجادلہ، آیت نمبر۱۹)

(ان پر شیطان نے پورا تسلط حاصل کرلیا ہے سو اس نے ان سے اللہ کا ذکر بھلا دیا یہ لوگ شیطان کا گروہ ہیں)۔

نسیان کی بیماری اور اس کا علاج

میں کہتا ہوں کہ جب تم کو نسیان محسوس ہو، اسے شیطان کے غلبہ کا اثر سمجھکر ذکر سے اس کا تدارک (علاج) کرو۔

تشریح:

ذکر ومراقبہ کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ ذہن پر پڑنے والے ہر طرح کے دباؤ سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ قوت ارتکاز کے ساتھ ساتھ ذکر کے انوار شامل ہوکر، فرد کے حافظہ کو تیز کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ نسیان کی بیماری کا بڑا سبب فکری انتشار اور دباؤ ہوتا ہے، جب کہ ذکر سے ذہنی یکسوئی پیدا ہوتی ہے، جس سے فرد بہت سارے غیرضروری خیالات، وسوسوں اور تفکرات سے بچ جاتا ہے۔

اس طرح ذکر حافظہ کی تیزی وبہتری کا ذریعہ بنتا ہے۔ بلکہ ذکر کی برکت سے طالب کے دل پر ایسے ایسے نکات کا القا ہوتا ہے، جس سے بڑے سے بڑے ذہین افراد بلکہ علماء تک قاصر ہوتے ہیں، اس لئے کہ ذکر سے سارے علوم کی خالق ہستی سے رابطہ مستحکم ہوتا ہے، اس ہستی کی طرف سے ذکر کی برکت سے دنیاوی مسائل کے حل کے سلسلہ میں نئی نئی باتیں سجھائی دیتی ہیں اور دینی وروحانی طور پر بھی قیمتی نکات کا نزول ہوتا رہتا ہے۔ البتہ متوسط صوفی پر غلبۂ ذکر کی وجہ سے کچھ وقت کے لئے دنیاوی باتوں ومسائل کے حوالے سے نسیان ہوتا ہے، تاکہ محبوب کی یاد، اس کے دل میں مستحکم ہو سکے، جب تک محبوب کے ذکر کا غلبہ اس کے دل میں غالب نہیں ہوتا، اس وقت تک اس پر نسیان کی حالت قائم رہتی ہے، لیکن اللہ تعالی ذکر کی برکت سے اس کے لئے خیر وبرکت کے راستے

کھول دیتا ہے۔ (مرتب)

أُوْلَئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ. (سورۃ المجادلہ، آیت نمبر۲۰)

(ان لوگوں کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثابت کردیا ہے اور ان کو اپنے فیض سے قوت دی ہے)۔

نور قلب

یہ روح نور قلب ہے، جس کو سکینہ اور نسبت بھی کہتے ہیں، چونکہ اس سے قلب کی زندگی وابستہ ہے، اس لئے اسے روح فرمایا گیا۔

تشریح:

نور قلب ایسی نعمت عظمٰی ہے، جس سے بڑھکر دنیا میں کوئی نعمت ہو نہیں سکتی، دل کا اصل یہ ہے کہ وہ محبوب کے لئے بے قرار رہتا ہے، وہ محبوب کی معیت کے لئے مچلتا رہتا ہے، دل کا یہ اضطراب محبوب کے انوار حسن کے بغیر دور نہیں ہوسکتا، دل کو جب کثرت ذکر کا نور ملتا ہے تو اس کو تسکین وتشفی حاصل ہوتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ دلوں کی زندگی، اللہ سے نسبت کے تعلق کے قائم ہونے سے وابستہ ہے۔ ہر فرد زندگی میں جو بھی کام کرتا ہے، وہ قلبی سکون ہی کے لئے تو کرتا ہے، لیکن اگر ساری توانائیوں کے خرچ ہونے کے باوجود قلبی سکون پیدا نہ ہو سکے تو یہ ساری توانائیاں اور وقت کا یہ سارا استعمال بیکار محض ثابت ہوتا ہے۔

دنیا میں اللہ کی سب سے بڑی نعمت قلبی سکون کی ہے، اسی سکون ہی سے دلوں کی زندگی وابستہ ہے۔ قلبی سکون کی یہ دولت مخلصانہ عبادت، ذکر وفکر اور صالح افراد کی صحبت کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ یہ ایسی اٹل حقیقت ہے کہ فرد جتنے بھی تجربات کرے، وہ اسی نتیجہ پر پہنچیگا۔

معمولی ذکر سے قلبی سکون حاصل نہ ہوسکے گا۔ ذکر کی مقدار کو آہستہ آہستہ بڑھانا پڑے گا۔ یہاں تک کہ ذکر کا ملکہ مستحکم ہو، مصروف افراد کا اگر ڈیڑھ سے دو گھنٹہ کا ذکر کا ملکہ مستحکم ہوجائے تو اس سے ان کا احساس پاکیزہ ہوگا اور انہیں سکون کے ساتھ ساتھ

اعمال صالحہ کی بھی توفیق حاصل ہوگی، روح یعنی نور قلب جس کا اس آیت میں ذکر فرمایا گیا ہے، یہ سارے اعمال صالحہ کی بنیاد ہے، صحابہ کرام کو اللہ کے رسول کی صحبت کی برکت سے نور قلب کی اعلیٰ درجہ کی حالت حاصل تھی، اس نور قلب کے حصول کے لئے جو بھی مجاہدوں سے کام لے گا، اللہ تعالیٰ اسے عطا فرمائیں گے اور وہ اس دنیا میں سکون وسکینت کی جنت میں رہنے لگے گا۔ (مرتب)

لَا تَجِدُ قَوْماً يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ۔ (سورۃ المجادلہ، آیت نمبر۲۲)

(جو لوگ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، آپ ان کو نہ دیکھیں گے کہ ایسے شخصوں سے دوستی رکھیں گے جو اللہ اور رسول کے برخلاف ہیں)۔

محبت الٰہی کے مخالفوں سے دوری

اس میں دلالت ہے کہ یہ محبت الٰہی کی ضروریات میں سے ہے کہ اس کی مخالفت کرنے والے سے اس کو نفرت ہوگی۔

تشریح:

اللہ کی محبت اس بات کی تقاضا کرتی ہے کہ اہل اللہ سے محبت کی جائے اور ان کی مخالفت کرنے والوں سے ہر صورت میں دوری اختیار کی جائے اور ان سے عدم التفاط کا معاملہ کیا جائے، اس لئے کہ ایسے لوگوں کی باتیں اتنی لچھے دار ہوتی ہیں کہ وہ فرد وافراد کو اہل اللہ سے دور کرنے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ ایسے لوگ اگر مذہبی ہوں تو وہ قرآن وسنت کے حوالوں سے اہل اللہ کی مخالفت کرتے ہیں، اہل اللہ کی مخالفت کی وجہ سے عام طور پر ان کا ذہنی سکون برباد ہوجاتا ہے، وہ خود اعتمادی سے محروم ہوتے ہیں۔ وہ تشدد کے حامل ہوجاتے ہیں اور محبت سے محرومی ان کی نفسیات کا حصہ بن جاتی ہے، اس لئے ایسے لوگوں کی صحبت اور ان سے تعلقات سے بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے، سالک کی پاکیزہ ایمانی کیفیات اور اس میں ارتقا کے لئے ضروری ہے، کہ وہ اہل اللہ کے مخالفین سے دوری اختیار کرے، دوسری صورت میں ان کی صحبت کے اثرات اس کے نور قلب کو مدھم کرنے کا باعث بنیں گے اس طرح اس سے زندگی کی حقیقی حلاوت سلب ہوجائے گی۔ (مرتب)

مَا قَطَعْتُم مِّن لِّينَةٍ أَوْ تَرَكْتُمُوهَا قَائِمَةً عَلَىٰ أُصُولِهَا فَبِإِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفَاسِقِينَ۔ (سورۃ الحشر، آیت نمبر ۵)

(جو کھجوروں کے درخت تم نے کاٹ ڈالے یا ان کو ان کی جڑوں پر رہنے دیا سو اللہ ہی کے حکم کے موافق ہے تاکہ (اللہ) کافروں کو ذلیل کرے)۔

اختلاف کا مضر نہ ہونا

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ اختلافی مسلک جو شرعی حد کے اندر ہو اور اخلاص کے ساتھ ہو، وہ نقصاندہ نہیں، اس میں صوفیہ کے مسالک کا اختلاف بھی آگیا، پس اتنا احتیاط ضرور ہو کہ ایک دوسرے کے عیوب بیان نہ ہوں۔

تشریح:

علمی افراد کا اخلاص کے ساتھ اختلاف جو اپنے دور کے حالات ومسائل کے سلسلہ میں، فقہی اعتبار سے راہیں نکالنے، دینی دعوت کے سلسلے میں اختیار کردہ حکمت عملی جیسے مسائل پر ہو، اس طرح کا اختلاف باعث رحمت ہے، نہ کہ باعث زحمت، اس لئے کہ اس سے دعوت کے سلسلے میں بہتر سے بہتر راہیں نکلتی ہیں اور اپنے دور کے حالات وچیلنج سے عہدہ برآ ہونے کے سلسلہ میں قیمتی لائین سامنے آتی ہے اور مختلف شعبوں میں کام کے لئے نئی حکمت عملیوں کی حامل شخصیتیں سامنے آتی ہیں، اس طرح کے اختلاف سے خوف زدہ ہونے کی ہرگز ضرورت نہیں، اس طرح کے اختلاف کی سب سے بڑی علامت یہ ہوتی ہے کہ اپنی تحقیق کا مثبت اظہار ہوتا ہے اور دوسرے کی تحقیق پر تنقید میں محبت شامل ہوتی ہے، جب کہ جس تنقید میں دوسروں کی شخصیت کی تحقیر شامل ہو، اس اختلاف میں نفسانیت شامل ہوتی ہے۔ ایسا اختلاف امت میں انتشار کا ذریعہ بنتا ہے، اختلاف کے سلسلہ میں دوسرا نکتہ جو پیش نظر رکھنا ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ فرد اختلاف کو نہ تو مقصود بنائے اور نہ ہی اس میں اپنا زیادہ قیمتی وقت صرف کرے، اختلاف کو جزوی حیثیت سے اختیار کرے، اس طرح کا اختلاف معاشرے میں انتشار کی بجائے خیر وبرکت کا باعث ثابت ہوتا ہے، لیکن اختلاف کو اعتدال کے دائرے میں رکھنے کے لئے مزاج میں ٹھہراؤ اور توازن چاہئے، جو صحبت اہل اللہ اور کثرت ذکر سے پیدا ہوگا۔ (مرتب)

يُبَايِعْنَكَ عَلَى أَن لَّا يُشْرِكْنَ . (سورۃ الممتحنہ، آیت نمبر۱۲)

(کہ آپ سے ان باتوں پر بیعت کریں کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے)۔

بیعت کے تقاضے

اگر کسی نے کسی (بزرگ) سے بیعت کا سلسلہ شروع کیا ہے تو اس کو سارے اعمال کی پابندی کرنا لازمی ہے، کیونکہ اگر اعمال نہیں کرے گا تو بیعت کا کوئی فائدہ نہیں، یہ بیعت رسمی نوعیت کی بیعت ہوجائے گی، نہ کہ بیعت شرعی۔

تشریح:

بیعت کا مفہوم اپنے آپ کو بیچ دینا ہے، جو فرد کسی اہل اللہ سے بیعت یا اصلاح کا تعلق قائم کرتا ہے، اسے ذکر وفکر اور اعمال کے لئے بزرگ کی ہدایتوں پر عمل کرنا پڑے گا۔ اگر وہ ذکر وفکر اور اعمال کے سلسلہ میں بزرگ کی ہدایتوں کو غیر ضروری سمجھکر، انہیں نظر انداز کرے گا تو اس کی اصلاح کے راستے مسدود ہوجائیں گے۔ بزرگ سے تعلق کا مطلب ہی نفسی اور روحانی اصلاح کے سلسلے میں اس کی ہدایات پر عمل پیرا ہونا ہوتا ہے۔ بزرگ کا اصل زور ذکر وفکر کے مجاہدوں پر ہوتا ہے، اس لئے کہ ان مجاہدوں سے اللہ کے ساتھ عشق ومحبت کے تعلق میں اضافہ ہوتا ہے اور عشق ومحبت میں اضافہ سے اللہ ورسول کی اطاعت آسان ہونے لگتی ہے اور گناہوں سے بچاؤ کی صورت پیدا ہونے لگتی ہے۔ لیکن اس دور میں اکثر افراد بیعت کو تبرک کا مسئلہ سمجھکر، ذکر وفکر اور اطاعت کے سلسلے میں بزرگ کی ہدایات پر عمل نہیں کرتے، جس کی وجہ سے وہ سخت پریشان رہتے ہیں اور نئے نئے مسائل کا شکار ہوتے ہیں، بعض افراد شدید ذہنی انتشار کا شکار ہو کر ذہنی مریض ہوجاتے ہیں۔ (مرتب)

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِیْ الْأُمِّیِّیْنَ رَسُولاً مِّنْهُمْ .الخ (سورۃ الجمعہ، آیت نمبر۲)

(وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں انہی میں سے رسول بھیجا)۔

ولایت کے لئے بہت زیادہ پڑھا لکھا ہونا ضروری نہیں

ولایت کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ فرد بہت ہی پڑھا لکھا اور سب کچھ جانتا ہو،

البتہ یہ ضروری ہے کہ فرد کی زندگی کے ساتھ جن مسائل کا تعلق ہے، ان کو جانتا ہو۔

تشریح:

ولایت کثرت ذکر کے ذریعہ آتش عشق میں جلتے رہنے اور نفسی قوتوں کو بتدریج فنا کے گھاٹ اتارنے کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے، اس سے پھر باطنی بصیرت بھی حاصل ہوتی ہے۔ دل کے مفتی کا عمل تیز سے تیز تر ہونے لگتا ہے۔ بداعمالی سے دل کا نظام درہم برہم ہونے لگتا ہے، جب تک فرد گناہ سے باز نہ آئے، دل کے نظام کی درستگی اور قلبی اضطراب کی حالت ختم نہیں ہوتی، ولایت سے فرد کو فطرت سلیمہ سے ہمہ آہنگی ہوتی ہے۔ جس سے قلب سے نور ابلنے لگتا ہے۔

البتہ ظاہری دینی علوم کا ایک حد تک حاصل ہونا بھی ضروری ہے، تاکہ ضروری دینی احکام اسے معلوم ہوسکیں۔ (مرتب)

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَن ذِكْرِ اللَّهِ وَمَن يَفْعَلْ ذَلِكَ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ . (سورۃ المنافقون، آیت نمبر۹)

(اے ایمان والو، تمہیں تمہارے مال اور اولاد اللہ کے ذکر سے غافل نہ کرنے پائے جو ایسا کرے گا ایسے لوگ ناکام رہنے والے ہیں)۔

غفلت کی مذمت

اس میں (ذکر سے) غفلت کی مذمت ہے۔

تشریح:

یہ آیت ذکر کی تاکید کے سلسلہ میں بہت اہم ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی حد تک ذکر کی عادت اور اس کے ملکہ کو راسخ کئے بغیر مال واولاد کی مصروفیت ذکر میں غفلت کا ذریعہ بن سکتی ہے اور ذکر سے غفلت ایسی بُرائی ہے، جو بہت ساری بُرائیوں کا باعث ہے۔

اس طرح ذکر کے بغیر مال واولاد میں مصروفیت سراسر خسارہ ہی خسارہ ہے، جب ذکر کا ملکہ راسخ ہوتا ہے تو اللہ سے غفلت دور ہوتی ہے، اس طرح فرد خسارے سے بچ جاتا ہے۔

ذکر کا ملکہ فرد کو معاشی سرگرمیوں میں بھی اللہ کی طرف متوجہ کرتا رہتا ہے، اس طرح

کی سرگرمیاں فرد کو بددیانتی، جھوٹ، ملاوٹ، خیانت، مکروفریب، دھوکہ دہی، دوسروں کی دل آزاری، حقوق کی ادائیگی میں ناکامی وغیرہ سے بچالیتی ہے،ذکر،اخلاص وللھیت وبے نفسی میں اضافے کا ذریعہ بنتا ہے، ذکر کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ فرد کو مادی دنیا میں مستغرق ہونے سے بچالیتا ہے، اس لئے کہ ذکر میں اللہ کا نور شامل ہوتا ہے، یہ نور فرد کو مادیت سے بلند کرنے اور اللہ سے قریب کرنے کا ذریعہ بنتا ہے، اس طرح فرد پیسوں کی ہیر پھیر اور حرص وہوس کے خرخشوں سے محفوظ ہوجاتا ہے، ذکر کے حوالے سے یہ آیت ایسی ہے، جو ہماری آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے۔ (مرتب)

وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجاً وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ. (سورۃ الطلاق، آیت نمبر۳)

(اور جو شخص تقویٰ اختیار کرتا ہے، اللہ اس کے لیے نجات کی شکل نکال دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے رزق پہنچاتا ہے، جہاں سے اس کا گمان بھی نہیں ہوتا)۔

وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مِنْ أَمْرِهِ يُسْراً. (سورۃ الطلاق، آیت نمبر۴)

(اور جو شخص اللہ سے ڈرے گا اللہ تعالیٰ اس کے کاموں میں آسانی پیدا کردے گا)۔

توکل وتقویٰ کی برکات کا
مشاہدہ ہوتے رہنا

توکل اور تقویٰ کے یہ برکات اہل طریقت (اہل تصوف) ہر وقت مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔

تشریح:

توکل اور تقویٰ اپنے ساتھ بہت ساری برکات لاتا ہے۔ توکل کی وجہ سے فرد لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بچ جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی مدد کی صورتیں نکالتا رہتا ہے۔ توکل کے ساتھ صبر وشکر کی نفسیات بھی پختہ ہوتی ہے، تقویٰ کی برکات تو اس قدر ہیں کہ بیان سے باہر۔ تقویٰ فرد کو ہر طرح کے گناہوں سے بچاکر، اللہ سے قریب تر کردیتا ہے۔ تقویٰ فرد کو دنیاوی معاملات میں اللہ رخی بنادیتی ہے یعنی اس کا رخ اللہ والا

بن جاتا ہے۔

وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مِنْ أَمْرِهِ يُسْراً (جو شخص اللہ سے ڈرے گا اس کے کاموں میں آسانی پیدا کردی جائے گی۔) مؤمن صادق کو توکل اور تقویٰ کے نتیجے میں حاصل ہونے والی برکات کا آئے دن مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، لیکن نفس کو توکل اور تقویٰ کا حامل بنانے کے لئے غیرمعمولی مجاہدوں اور مشکلات سے گذارنا پڑتا ہے۔ تقویٰ کا مقام آسانی سے حاصل نہیں ہوتا۔ (مرتب)

قَدْ أَنزَلَ اللَّهُ إِلَيْكُمْ ذِكْراً رَّسُولاً. (سورۃ الطلاق، آیت نمبر۱۰)

(تم اللہ سے ڈرو، اللہ نے تمہارے پاس ایک نصیحت نامہ بھیجا ایک رسول)۔

شیخ کی صحبت اور گفتگو کا ذکر کے منافی نہ ہونا

اگر رسولا صفت ہو ذکر کی، جو مبالغۃ دونوں کے اتحاد کی دلیل ہے تو اس میں اس طرف اشارہ ہوجائے گا کہ شیخ کی صحبت اور اس سے گفتگو ذکر کے منافی نہیں کہ ذکر کا واسطہ ہونے کی وجہ سے وہ بھی گویا ذکر ہی ہے۔

تشریح:

شیخ چونکہ نفس کو فنائیت کے مراحل سے گذار کر، اللہ کے ساتھ حالت بقا کی حالت میں ہوتا ہے، اس لئے اخلاص، للھیت، خشیت اور اللہ سے والہانہ محبت اس کی شخصیت کا حصہ بن جاتے ہیں، اس لئے شیخ کی صحبت اور اس سے گفتگو کے نتیجہ میں طالب اپنے ایمان میں اضافہ محسوس کرتا ہے، بلکہ اس کے لئے تجدید ایمان کی صورت پیدا ہوتی رہتی ہے، اس کے ذکر وفکر کے ذوق وشوق میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کی کیفیات میں بہتری کی صورت پیدا ہوجاتی ہے۔ نیز دنیا سے رغبت میں کمی آتی رہتی ہے۔ مسلسل صحبت کے نتیجہ میں اس کے ذکر کا ملکہ بھی راسخ ہوجاتا ہے اور شیخ کی شخصیت میں موجود اخلاق حسنہ بھی اس میں منتقل ہوتے رہتے ہیں، حقیقی اہل اللہ کی صحبت کے اثرات وثمرات سے ہی طالب کا کام بن جاتا ہے، البتہ دیکھا گیا ہے کہ بعض افراد شیخ کی صحبت کے باوجود ذکر کی طرف آنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، اس کا اہم سبب یہ ہے کہ وہ ذہنی طور پر مجاہدوں کے لئے تیار نہیں، وہ فیض نظر سے ہی سارے مراحل طے کرنا چاہتے ہیں، جب کہ حالات

ومقامات میں رسوخ اور تعلق مع اللہ کے استحکام کے لئے صحبت کے ساتھ ذکر کا اہتمام ناگزیر ہے، دوسری صورت میں سالک کو زندگی بھر مطلوبہ استفادہ حاصل نہ ہو سکے گا، اور وہ قرب کے مقامات طے نہ کر سکے گا۔ (مرتب)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوحاً. (سورۃ التحریم، آیت نمبر ۸)
(اے ایمان والوتم اللہ کے سامنے سچی توبہ اختیار کرو)۔

توبہ کا واجب ہونا

خالص توبہ کے واجب ہونے پر یہ قرآنی نص ہے،اس حاشیہ کو حضرت حافظ عبدالرحیم صاحب نے اس طرح پیش فرمایا ہے، گناہ ہوجائے تو توبہ پکی کرنی چاہئے اس کو توبتہ النصوح کہا گیا ہے کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے گویا اس نے گناہ کیا ہی نہیں۔

تشریح:

گناہ ہونا بشریت کا تقاضا ہے، گناہ ہوجائے تو توبہ میں تاخیر سے کام نہ لینا چاہئے۔ اس لئے کہ توبہ میں تاخیر سے دوسرے اور تیسرے گناہ میں مبتلا ہونے کا خطرہ درپیش ہوتا ہے، حدیث شریف ہے کہ اے ابن آدم، تمہارے گناہ اگر آسمان کی چوٹی تک بھی ہوں تو توبہ کرنے سے میں وہ سب گناہ معاف کروں گا۔

لیکن جان بوجھکر گناہ کرنا سخت خسارے کا سودہ ہے، اس لئے کہ ایسا کرنے سے گناہوں سے بچنے اور نیکی کی راہ پر گامزن ہونے کی توفیق سلب ہونے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ مسلسل گناہ کرتے رہنے کا جو نتیجہ ظاہر ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ اعمال صالحہ سے کراہت وبیزاری پیدا ہونے لگتی ہے، پھر عام طور پر زندگی بھر صالح اعمال کی طرف آنے کی توفیق کم ہی نصیب ہوتی ہے۔ (مرتب)

وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْ أَصْحَابِ السَّعِيْرِ. (سورۃ الملک، آیت نمبر ۱۰)
(اور قیامت کے روز کہیں گے کہ اگر ہم سنتے یا سمجھتے تو ہم اہل دوزخ میں سے نہ ہوتے)۔

فلاح کے دو طریقے
تقلید اور تحقیق

اس سے معلوم ہوا کہ فلاح کے دو طریقے ہیں، ایک تقلید دوسری تحقیق، پس مرید جس میں تحقیق کی قابلیت نہیں، اس کو شیخ سے مزاحمت (مخالفت) یا دلیل کا مطالبہ نہیں کرنا چاہئے۔

تشریح:

اصلاح کا ابتدائی طالب چونکہ نفس کی وسیع دنیا اور نفس میں موجود بت کدے اور اس کی نوعیت کو نہیں سمجھتا اور اسے اس بات کا ادراک حاصل نہیں ہوتا کہ نفس کے اندر سے خواہشات کے جو طوفان اٹھتے رہتے ہیں، ان کا مقابلہ کیسے ہو اور ان سے بچاؤ کی صورت کیا ہو، پھر وہ اسلامی شریعت پر پوری طرح عمل پیرا ہونے کی صلاحیت سے بھی بے بہرہ ہوتا ہے، اس کے اندر میں موجود منفی جذبات ہر وقت ابھرتے رہتے ہیں اور مشتعل رہتے ہیں، نیز وہ اپنے اوپر ضبط رکھنے کی صلاحیت سے قاصر ہوتا ہے، اس لئے اصلاح کے ابتدائی طالب، بلکہ مرید کے لئے نجات کی راہ اس میں ہے کہ وہ اپنی اصلاح کے لئے اپنے آپ کو مکمل طور پر شیخ کے حوالے کر دے اور اس کی تقلید اختیار کرے اور وہ جن باتوں کو اختیار کرنے کی تعلیم دے، اس پر عمل کرے، جن سے روکے، ان سے رک جائے، اگر مرید اس طرح کرے گا تو ایک وقت آئے گا کہ وہ محقق کے درجہ پر فائز ہوگا، دوسری صورت میں وہ زندگی بھر نفس پرستی کی قوتوں کے تابع ہوکر، تباہی سے دوچار ہوگا۔

محقق اور شیخ چونکہ خود طویل عرصہ تک اپنے مربی کے زیر صحبت، اصلاح کے مراحل سے گزر کر، نفس کو بڑی حد تک مہذب بنانے میں کامیاب ہو چکا ہے، وہ نفس کے مکر وفریب، اس کی ساری عیاریوں اور چھپ کر حملے کرتے رہنے کی اس کی واردات سے پوری طرح آشنا ہو چکا ہوتا ہے، اس لئے شیخ، طالب کو نفس کی گھاٹیوں سے بہتر طور پر گذارنے کی صلاحیت رکھتا ہے، شیخ کی رہنمائی و رہبری کے بغیر طالب نفس کے وسیع جنگل میں رہزنوں کے حملوں کا شکار ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا، طالب کے لئے نفس کے ان حملوں سے بچاؤ کے لئے محض ظاہری علم اس کے لئے کافی نہیں ہے، کامل شیخ اور محقق کی تقلید سے

دوری اور اس سے عار کی عمومی روش (جو اس دور کا وتیرہ ہے) وہ فرد وافراد کو نہ صرف بہتر اور اچھا انسان بنانے میں ناکام رہتی ہے، بلکہ اسے خوداعتمادی کے بحران سے بھی دوچار کردیتی ہے اور آخرت میں نجات کے حوالے سے اسے بے فکر کردیتی ہے، آخرت کی حقیقی فکرمندی، نفسی خواہشات کی تہذیب اور اس کی دستبرداری کے بعد ہی پیدا ہوتی ہے اور مستحکم ہوتی ہے۔

تقلید سے عار ہونا، سب سے زیادہ خسارے کا سودا ہے، اور یہ تکبر کی علامت بھی ہے، ہر فرد جو بھی علم وفن سیکھتا ہے، اس کے لئے اسے پہلے اپنے آپ کو اس فن کے ماہر استاد کے سپرد کرنا پڑتا ہے، علوم وفنون کے سیکھنے کا یہی فطری طریقہ ہے، لیکن تہذیب نفس، ضبط نفس اور باطنی وروحانی بیماریوں کی اصلاح کے لئے ایسا نہ کرنا، اپنے آپ کو دنیا وآخرت میں محروم کرنے کے مترادف ہے۔ (مرتب)

وَإِن يَكَادُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَيُزْلِقُونَكَ بِأَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُولُونَ إِنَّهُ لَمَجْنُونٌ . (سورة القلم، آیت نمبر ۵۱)

(اور یہ کافر جب قرآن سنتے ہیں تو ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ گویا آپ کو اپنی نگاہوں سے پھسلا کر گرادیں گے اور کہتے ہیں کہ یہ مجنون ہے)۔

اہل باطل کا تصرفات کے ذریعہ
اہل حق پر اثر انداز ہونا

اس میں دلالت (دلیل) ہے کہ اہل باطل میں بھی تصرفات ہو سکتے ہیں، وہ ان تصرفات کے ذریعہ اہل حق کی طبیعت پر (اثر انداز ہو سکتے ہیں) غالب ہو سکتے ہیں، پس یہ تاثیر نفسانی نوعیت کی ہوتی ہے، اس کا ولایت سے کوئی تعلق نہیں۔

تشریح:

اہل باطل مشقوں کے ذریعہ اپنی نگاہوں میں ایسی تاثیر پیدا کرلیتے ہیں کہ وہ اہل حق کے مزاج کو وقتی طور پر متاثر کرسکتے ہیں، اس آیت میں اہل باطل کی اس تاثیر کی نشاندہی فرمائی گئی ہے، نظروں میں تاثیر کا ہونا، عملیات کے اثرات کا ہونا اور جادو کے اثرات، یہ سب مشقوں کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں، جس سے مقصود دوسروں پر نفسیاتی طور

پر اثر انداز ہونا ہے، ہپناٹزم کی مشقوں میں تو یہاں تک تاثیر ہے کہ مشقوں کا ماہر فرد ایک شخص کی تصویر کو دیکھ کر، اس تصویر کو ڈراتا دھمکاتا ہے تو وہ شخص اپنے گھر پر بیٹھے ہوئے خوف زدگی کا شکار ہوجاتا ہے، بدقسمتی سے اس دور میں بعض بزرگ نما افراد نے بھی ہپناٹزم کی مشقوں کے ذریعہ مرید بنانے کی روش اختیار کرلی ہے، یا عملیات کے ذریعہ لوگوں کو تسخیر کرنا شروع کردیا ہے، ذلیل دنیا کی خاطر اس طرح کی چیزوں کا استعمال سخت خسارے کا سودہ ہے۔ (مرتب)

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ . (سورة الحاقة، آیت نمبر ۴۴-۴۵)

(اور اگر یہ ہمارے ذمہ کچھ باتیں لگادیتے تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے)۔

ولایت کے مصنوعی دعویدار
کا ہلاکت سے دوچار ہونا

اسی طرح ولایت کا دعویدار ہلاک کیا جاتا ہے، مگر نبوت ایک ظاہری امر ہے، اس کا جھوٹا مدعی ظاہراً بھی ہلاک ہوتا ہے اور ولایت باطنی معاملہ ہے، اس کا جھوٹا مدعی باطناً ہلاک ہوتا ہے، اہل باطن (حقیقی اہل اللہ) کو اس کا ادراک ہوتا ہے، اس کے آثار ظلمات اور رسوائی ہے، پس جب کسی اہل اللہ کو کسی ولایت کے دعویدار سے نفرت کرتے ہوئے دیکھو تو اس سے بچو۔

تشریح:

اللہ کی معرفت یعنی ولایت ایسی چیز ہے، جو زندگی کا بڑا عرصہ نفس کے خلاف مجاہدوں میں صرف کرنے کے نتیجہ میں اللہ کے فضل خاص سے عطا ہوتی ہے، غیرمعمولی مجاہدوں اور اہل اللہ کی طویل صحبت کے بغیر ولایت کا منصب عطا نہیں ہوتا، ایسا فرد، جو نفس کی فنائیت سے پہلے ولایت کے منصب پر فائز ہو اور اس میں تسخیری نوعیت کی صلاحیتیں بھی موجود ہوں، تو ایسا فرد تیز رفتاری سے مریدوں کا مجمع جمع کرلیتا ہے، اس کی دوسری علامت یہ ہے کہ وہ مالدار سے مالدار تر بن جاتا ہے اور اس کے لئے منصوبہ بندی کرتا رہتا ہے، اس کی تیسری علامت یہ ہے کہ وہ شہرت کا طالب ہوتا ہے اور شہرت کے

ذرائع اختیار کرنے لگتا ہے، اس کی چوتھی علامت یہ ہے کہ اس کے پاس عام لوگوں سے ملنے کے لئے وقت موجود نہیں ہوتا، جب کہ مالداروں کے لئے وہ ہر وقت دستیاب ہوتا ہے، بزرگی کا ایسا دعویدار حب مال اور شہرت وغیرہ کے جذبات کے زیر اثر باطنی طور پر شدید خلفشار کا شکار ہوتا ہے اور وہ اللہ کے عتاب کی زد میں آتا ہے۔

حقیقی اہل اللہ، اس طرح کے ولایت کے دعویدار کو پہنچان لیتے ہیں، ان کی اداؤں کو دیکھکر ان کا دل اس کے بارے میں واضح فتویٰ دیتا ہے کہ ولایت کا یہ مصنوعی دعویدار ہے، اس لئے کہ حقیقی اہل اللہ کی سب سے بڑی علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ طالبوں کی تربیت وتزکیہ کے لئے فکرمند ہوتا ہے، وہ ان کے ساتھ بیٹھنے کو اپنے آپ کو پابند بناتا ہے، اس کی دوسری علامت یہ ہوتی ہے کہ اس کا دل دنیا کے حوالے سے سرد ہوجاتا ہے، نیز اس کے دل سے مادی خوشحالی اور راحت کی زندگی گذارنے کی فکرمندی ختم ہوجاتی ہے، اس کی چوتھی علامت یہ ہوتی ہے کہ ذکر اسے کسی اور طرف جانے ہی نہیں دیتا، وہ دل سے اللہ کی محبت کے علاوہ ساری محبتوں کو نکال چکا ہوتا ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں حقیقی اہل اللہ اور مصنوعی اہل اللہ کے درمیان فرق کرنے کی صلاحیت عطا فرمائے اور جعلی اہل اللہ سے بچانے کی بھی۔ (آمین) (مرتب)

وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا(سورۃ نوح، آیت نمبر ۲۳)

(اور جنہوں نے کہا کہ تم اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور نہ ود کو، نہ سواع کو، نہ یغوث کو، نہ یعوق اور نسر کو چھوڑنا)۔

صلحاء کی تصاویر رکھنے کا انجام

صلحاء کی تصویریں رکھنے کا یہ انجام ہوا، جو اس وقت جائز تھی، اس سے معلوم ہوا کہ صلحاء کے آثار اور تبرکات کا زیادہ اہتمام کرنا، جب کہ اس میں دینی خرابی موجود ہو، ترک کرنا واجب ہے۔

تشریح:

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم جن شخصیتوں کی پوجا کرتی تھی، وہ اپنے دور کے صلحاء

اور نیک بخت انسان تھے، ان کے وصال کے بعد پہلی نسل نے ان کی تصویریں رکھکر ان تصویروں سے محبت کرنا شروع کی، آہستہ آہستہ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ ان کے مجسمے بنا کر، ان کی پوجا کرنے لگے، اس لئے بزرگوں کی تصاویر اور تبرکات کا زیادہ اہتمام خطرے سے خالی نہیں، اس دور میں بھی بعض بزرگوں سے اندھی محبت کی وجہ سے ان کی تصاویر اور تبرکات کو مقصود کا درجہ دے دیا گیا ہے اور ان کے نام کے وظیفہ تک کو معمول بنالیا گیا ہے، جو توحید کے سراسر منافی اور سراسر جہالت ہے۔ (مرتب)

وَأَنَّهُ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْإِنسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوهُمْ رَهَقًا . (سورۃ الجن، آیت نمبر ٦)

(اور لوگوں میں بہت سے ایسے تھے جو جنات میں سے بعض لوگوں کی پناہ لیا کرتے تھے، سو ان لوگوں نے جنات کی بدماغی بڑھادی)۔

جنات سے مدد مانگنا اور اس کا مذموم ہونا

بعض لوگ جو زبردستی صوفیہ میں شمار کئے جاتے ہیں اور وہ ایسے ایسے تعویذات وعملیات میں مشغول ہیں، جن میں جنات وموکلات کو پکارنا اور ان سے مدد طلب کرنا وغیرہ شامل ہے، اس آیت سے اس کا مذموم ہونا ثابت ہے۔

تشریح:

ہمارے ہاں تصوف کے نام پر جو خرافات موجود ہیں، ان میں سے ایک بڑی خرافت یہ ہے کہ تصوف کو اصلاح نفس اور تعلق مع اللہ کا ذریعہ بنانے کی بجائے تعویذات وعملیات کا ذریعہ بنالیا گیا ہے اور عملیات کے ذریعہ لوگوں کو معطل کرنے یا موکلات سے کام لینے کو ایک بڑے فن کے طور پر اختیار کیا گیا ہے، اس کام کو تقدس کا روپ دینے کے لئے اسے تصوف وبزرگی کا نام دیا گیا ہے، حالانکہ یہ خالص دکانداری ہے، اس کا بزرگی سے کوئی تعلق نہیں، عملیات کے فن کو اگر لوگوں کی خدمت کے طور پر استعمال کیا جائے تو اس کے لئے گنجائش کی صورت نکل سکتی ہے، لیکن اس طرح کی عملیات کا حقیقی تصوف اور بزرگی سے تعلق نہیں۔ (مرتب)

عَلِمَ أَن لَّن تُحْصُوهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ. (سورۃ المزمل، آیت نمبر ۲۰)

(اس کو (اللہ کو) معلوم ہے کہ تم اس کو ضبط (برداشت) نہیں کر سکتے تو اس نے تمہارے حال پر عنایت کی)۔

مجاہدے میں سہولت کا ہونا

اس میں مجاہدہ واوراد کے سلسلہ میں رعایت ہے سہولت کی، اور طالبین وسالکین کے ساتھ محققین (یعنی اہل اللہ) کی یہی روش ہوتی ہے۔

تشریح:

نفس کے خلاف مجاہدوں اور اللہ سے تعلق مستحکم کرنے کے لئے طالبوں وسالکوں کی سہولت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے، دوسری صورت میں تحمل وبرداشت کے فقدان اور صحت کی کمزوری کی وجہ سے نقصان کا خطرہ لاحق رہتا ہے، اس لئے کمزور صحت کے حامل افراد یا مصروف افراد کے لئے بزرگان دین کم مجاہدے تجویز کرتے ہیں، البتہ جو زیادہ مجاہدے کرنے کی استعداد رکھتے ہوں، ان کے لئے کثرت مجاہدہ تجویز کرتے ہیں، تاکہ معاشرے کو تزکیہ وتربیت کے لئے مردان کار مہیا ہوسکیں، لیکن اپنے جسم پر جبر کرکے، زیادہ سے زیادہ مجاہدوں سے کام لینا، یہ طلبہ کی صحت کے لئے نقصاندہ ہے، اس سے یہ خطرہ دامنگیر ہوتا ہے کہ کہیں وہ زندگی بھر سخت اعصابی وذہنی تکان (تھکاوٹ) کا شکار نہ ہوجائے، اس لئے مجاہدوں کے سلسلہ میں احتیاط ضروری ہے۔ (مرتب)

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ . (سورۃ المدثر، آیت نمبر۶)

(اور کسی کو اس غرض سے مت دو کہ زیادہ معاوضہ چاہو)۔

تعلیم اخلاق

بعض نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ زیادہ چاہنے کے خیال سے لوگوں کو (مال وغیرہ) مت دو، بعضوں نے کہا ہے کہ دے کر زیادہ مت سمجھو، بعض نے کہا ہے کہ اپنے احسانات کو زیادہ سمجھکر مت جتلاؤ، یہ ساری تعلیم اخلاق وطریقت کی ہے۔

تشریح:

اسلام کے تربیتی پہلو میں پاکیزہ اخلاق کو فیصلہ کن اہمیت حاصل ہے، اس آیت

میں اخلاق کی بہترین تعلیم دی گئی ہے، جس سے افرادِ معاشرہ میں محبت ورواداری کے تعلقات فروغ پذیر ہوتے ہیں۔

کسی کی اس خیال سے مدد کرنا کہ اس سے زیادہ مل جائے یا وصول کیا جائے، یا اپنے احسانات کو جتلاتے رہنا، یا تھوڑے سے احسان کو بہت بڑا احسان سمجھنا، یہ ساری چیزیں ایسی ہیں، جو اخلاقی طور پر معیوب ہیں، اس سے بہتر معاشرے کی تیاری میں مدد نہیں ملتی۔

اسلام جس مزاج کے حامل افراد پیدا کرنا چاہتا ہے، وہ مزاج یہ ہے کہ محض اللہ کی رضا کی خاطر جس کی جتنی بھی مدد کی جاسکتی ہے، کی جائے، اس میں اپنے مفاد کو ذرہ بھر شامل نہ کیا جائے، اس طرح کی روش سے ہی سیرت وکردار میں پاکیزگی اور بلندی پیدا ہوگی، اس طرح کے اخلاق سے ہی آخرت میں صالح اعمال کا پلڑہ زیادہ بھاری ہوگا، اس طرح کی ایک حدیث شریف موجود ہے، لیکن اخلاق میں اتنی پاکیزگی اور بے غرضی اللہ سے والہانہ محبت اور ذکر وفکر کے ذریعہ ہی پیدا ہوسکتی ہے، مفاد پرست اور خود غرض معاشرے میں جہاں دوسروں کی بے غرضانہ مدد کو وبال سمجھا جاتا ہو، ایسے معاشرے میں اس طرح کے اخلاق کے حامل افراد کا موجود ہونا، یہی افراد معاشرہ کی کریم ہیں اور انہی کی وجہ سے معاشرہ مکمل طور پر تباہی سے بچا ہوا ہے۔

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنفِرَةٌ (سورۃ المدثر، آیت نمبر۴۹۔۵۰)

(تو ان کو کیا ہوا کہ اس نصیحت سے روگردانی کرتے ہیں کہ گویا وہ وحشی گدھے ہیں)۔

کاملین کی اتباع سے عار کرنے کی مذمت

یہاں عارفین کی اتباع سے عار کرنے اور اپنے نفس کے لئے واردات اور احوال کی توقع رکھنے کی مذمت ہے۔

تشریح:

کاملین (جسے اہل اللہ بھی کہتے ہیں) ان کی اتباع نہ کرنا، ان کی نصیحت کی باتوں کو

اہمیت نہ دینا اور اصلاح کے سلسلہ میں ان کی فکرمندی، دردمندی اور اضطراب کو نہ سمجھنا، اس پر دھیان نہ دینا اور اپنے نفس کے لئے بہتر واردات، کیفیات اور حالات تجویز کرنا، محبوب، طالب کو جس حال میں رکھے، اس پر چوں چرا کرتے رہنا، یہ ایسی روش ہے، جو حقیقی طالبوں اور محبوں کے لئے زیبا نہیں، یہاں اس کی مذمت کی گئی ہے، حقیقی طالب اپنے لئے کوئی چیز تجویز نہیں کرتا، محبوب اسے جس حال میں رکھے، وہ اس پر صبر وشکر کا مظاہرہ کرتے ہوئے راہ محبت میں چلتا رہتا ہے، وہ بہتر کیفیات کے لئے بہت زیادہ فکرمند اور غمگین نہیں ہوتا۔

شیخ اس کے لئے جو تجویز کرتا ہے، وہ اسے اپنے لئے تریاق سمجھتا ہے، وہ شیخ کے اخلاق کی اتباع کرتا ہے، ذکر وفکر اور شرعی امور کے سلسلہ میں بھی وہ اس کی اتباع کرتا ہے، وہ خودرائی سے کام نہیں لیتا، اس لئے کہ مبتدی ومتوسط طالب کا نفس کے حوالے سے مشاہدہ اور علم ومعلومات محدود ہوتی ہے اور عمل کی صلاحیت بھی کم ہوتی ہے جب کہ شیخ، نفس کی ساری واردات سے آشنا ہوتا ہے اور وہ نفس شناس ہوتا ہے، وہ صاحب عمل بھی ہوتا ہے تو صاحب حال بھی۔ شیخ جو بھی نصیحت کرتا ہے، وہ طالبوں کی خیر خواہی کے لئے ہی ہوتا ہے، جب طالب خودرائی چھوڑ کر، شیخ کی مکمل طور پر تقلید میں راہ محبت میں چلتا رہتا ہے تو وہ نوازا جاتا ہے، اور محبوب کی طرف سے اسے ایسی باطنی نعمتیں عطا ہونا شروع ہوتی ہیں، جو دنیا میں طالب کی ہر طرح کی تسکین وتشفی کا موجب ثابت ہوتی ہیں۔ (مرتب)

وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ . (سورۃ القیامۃ، آیت نمبر ۲)

(اور قسم کھاتا ہوں ایسے نفس کی جو اپنے اوپر ملامت کرے)۔

نفس لوامہ کی تعریف

نفس لوامہ وہ ہے، جو ہر طرح کی بُرائی پر اس طرح نادم ہو کہ یہ بُرائی کیوں ہوئی اور وہ خیر کے بارے میں اس احساس کا حامل ہو کہ وہ کیوں نہیں ہوا، نفس امارہ شر پر اکساتا رہتا ہے، جب کہ نفس لوامہ خیر پر قرار پکڑے (یعنی خیر پر خوشی حاصل کرے)۔

تشریح:

نفس کی تین حالتیں ہیں، نفس امارہ، نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ۔

نفس امارہ، وہ نفس ہوتا ہے، جس میں ہر وقت بُرائی اور شیطان گیری کے خیالات واحساسات وجذبات کا غلبہ ہوتا ہے اور فرد مادیت کی دلدل میں مبتلا ہوتا ہے، اِس وقت عالمگیر کی سطح سے مادیت کا جو طوفان اٹھا ہے، اس کے زیر اثر معاشرے میں بہت بڑی اکثریت نفس امارہ کے چنگل میں مبتلا ہے، جس کی وجہ سے صالح سوچ اور عمل کی صلاحیت سلب ہوگئی ہے۔

نفس لوامہ، نفس کی وہ حالت ہے، جس میں فرد کے لئے خیر کا احساس موجود ہو اور وہ نیکی پر خوشی محسوس کرے اور بُرائی پر اپنے آپ کو تنبیہ کرتا رہے اور جب تک بُرائی سے باز نہ آئے، اسے سکون حاصل نہ ہو۔

ذکر وفکر، صحبت اور صالح اعمال کی مسلسل عادت کی وجہ سے جب نفس لوامہ کی حالت مستحکم ہونے لگتی ہے تو فرد نفس مطمئنہ کے دائرے میں داخل ہوتا ہے، جہاں ایسے ہر شر سے نفرت اور ہر نیکی سے محبت پیدا ہوتی ہے اور صالح اعمال کی سرانجامی میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔

اللہ نے نفس لوامہ کی قسم کھائی ہے، نفس لوامہ بڑی نعمت ہے، اس نعمت کی قدر کرنی چاہئے اور نفس لوامہ کو مزید طاقتور بنانا چاہئے، یہی نفس لوامہ، فرد کو نفس مطمئنہ تک پہنچانے کا ذریعہ بنتا ہے۔

انطَلِقُوا إِلَى ظِلٍّ ذِى ثَلَاثِ شُعَبٍ (سورۃ المرسلات، آیت نمبر ۳۰)

(ایک سائبان کی طرف چلو جس کی تین شاخیں ہیں۔)

نفس کا حجاب اور اس کے آلات

روح میں ہے کہ تین کے خاص ہونے کا سبب یہ ہے کہ اللہ کے انوار سے (روکنے والی چیز) نفس کا حجاب ہے، جو حس، خیال اور وہم کے ذریعہ کام کرتا ہے (اور یہ علم میں رکاوٹ ہے) یا وہم، غضب اور شہوت کی قوت ہے، (اور یہ عمل کی راہ میں رکاوٹ ہیں)۔

تشریح:

یہاں نفسی قوتوں کی طرف سے اللہ کی معرفت کی راہ میں پیدا کردہ حجابات کا ذکر ہے کہ ذہنی، فکری اور علمی طور پر تو نفس مادی حسوں، خیال اور وہم کی صورت میں سامنے آتا

ہے اور فرد کو یہ بات سجھاتا ہے کہ اللہ کی معرفت اس قابل ہی نہیں ہے کہ اسے اہمیت دی جائے، خیالی قوت تو نفس کا طاقتور حربہ ہے، یہ خیالی قوت جب نفس کی آلہ کار بن جاتی ہے تو وہ وہم کی صورت اختیار کرلیتی ہے، یہی وہم فرد کی ساری شخصیت کا احاطہ کرلیتا ہے، مثلاً یہ وہم کہ میرے زندگی بھر کے سارے مسائل کا حل دولت میں مضمر ہے، اگر مجھے دولت حاصل ہوجائے تو میں سارے تفکرات سے نکلنے اور مسائل سے عہدہ برآ ہونے میں کامیاب ہوجاؤں گا، یا مثلاً یہ وہم کہ معاشرے میں میری توقیر وعزت عہدوں اور منصب سے وابستہ ہے، اگر مجھے منصب مل جائے تو اس سے میری شخصیت میں موجود جذبات واحساسات کی تسکین کی صورت پیدا ہوسکتی ہے، یہ خیالی قوت عام طور پر اسی طرح کے وہم کی صورت میں سامنے آتی ہے، اسی خیالی قوت سے کام لے کر نفس معاشرے میں فساد برپا کرنے، فرد کی شخصیت میں داخلی بحران پیدا کرنے، اللہ سے اس کے رشتے کو منقطع کرنے اور باطنی حسیں (جو پردوں کے پیچھے موجود ہوتی ہیں) ان سے دور کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔

نفس کی طرف سے پیدا کردہ عملی حجاب یہ ہے کہ جب تہذیب نفس معرفت اور ذکر وفکر کے مجاہدوں کی بات سامنے آتی ہے تو وہم، غضب اور شہوت کی قوتیں غالب آکر، فرد کے لئے اس راہ پر گامزن ہونے میں شدید مزاحم ثابت ہوتی ہیں۔

غضب اور شہوت کی قوتیں آتشیں قوت ہیں کہ غضب شخصیت میں ایک طرح سے آگ برپا کردیتا ہے جس سے داخلی وخارجی زندگی میں دنگا فساد برپا ہوتا ہے، اور افرادِ معاشرہ میں تہلکہ برپا ہونے لگتا ہے، جذبہ شہوت سے فرد میں عفت، حیا وشرم اور نیکی کے احساسات رخصت ہوجاتے ہیں، شہوت کا غلبہ فرد کے عقل میں فتور پیدا کردیتا ہے، یہ دونوں جذبات شخصیت کے باطن کو خراب کرنے، اس میں فساد برپا کرنے اور معاشرے کو افراتفری میں مبتلا کرنے کا جو کردار ادا کرتے ہیں، اس وقت سے محلے اور قومی سطح سے لے کر انسانی سطح تک اس کا جو بدترین مظاہرہ ہورہا ہے، اس کا آئے دن مشاہدہ ہورہا ہے۔

چونکہ عام طور مادی حسوں، ظاہری علم اور وہم کا غلبہ ہوتا ہے، بلکہ اس سلسلہ میں نفسی حجابات فرد کے سامنے علم، مادی مشاہدات اور استدلال کا ایک انبار کھڑا کردیتے ہیں

کہ اللہ کی محبت ومعرفت کی کوئی اہمیت اور حقیقت نہیں ہے، یہ صوفیوں کی گھڑی ہوئی چیزیں ہیں، اسلام تو بس ظاہری تعلیمات یا کچھ ظاہری اعمال کا نام ہے، باطن کی گہرائیوں سے اس کا کیا تعلق؟

مادی حسوں (جس میں دیکھنے، سننے اور چھونے وغیرہ کی حسیں شامل ہیں) عقل محض اور وسوسے یہ نفس کے ایسے مؤثر ہتھیار ہیں کہ ان ہتھیاروں سے کام لے کر ہی نفس فرد کو معرفت کی راہ سے دور کردیتا ہے اور جو افراد اس راہ پر آنے کے لئے کوشاں ہوتے ہیں، انہیں وہ طرح طرح کے وسوسوں، غیض وغضب اور شہوت کے جذبات سے مغلوب کرکے انہیں اس راہ سے روک لیتا ہے، اکثر مبتدی طالب نفس کے ان ہتھیاروں کا شکار ہوکر، اللہ سے حالت پردہ میں آجاتے ہیں۔

نفس کے یہی حجابات وخواہشات ہیں، جو جہنم کی سزا کی صورت میں سامنے آئیں گے، آخرت کے جہنم سے پہلے اس دنیا میں بھی فرد وافراد ان حجابات وخواہشات کی مناسبت سے جہنمی انگاروں سے دوچار ہوتے ہیں کہ یہ سزا انہیں بے سکونی، بے قراری، شدید ذہنی دباؤ، نیند کے خاتمے، حرص وہوس، انتقام اور حسد وغیرہ کی آگ میں جلتے رہنے کی صورت میں ملتی ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوا لَا يَرْكَعُوْنَ. (سورۃ المرسلات، آیت نمبر ۴۸)

(جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جھکو تو نہیں جھکتے)۔

نخوت کا قبول حق کی راہ میں رکاوٹ ہونا

یعنی خشوع اور تواضع اختیار کرو اور نخوت جو قبول حق کی راہ میں رکاوٹ ہے، اسے چھوڑ دو۔

تشریح:

نخوت وتکبر ایسی چیز ہے، جو فرد وافراد کو ہر طرح کی حق بات کو قبول کرنے سے روکنے کا کردار ادا کرتی ہے۔ بندہ، بندہ ہے، اسے عبدیت وعاجزی کی راہ اختیار کرنی چاہئے، تکبر ونخوت اس کے لئے سم قاتل ہے۔

متکبر کا انجام ہر صورت میں بُرا ہی ہوتا ہے، بالخصوص جب یہ تکبر اللہ کے مقابلہ

میں ہو تو اس کی سنگینی بڑھ جاتی ہے، اگرچہ اللہ کے بندوں کے معاملہ میں بھی تکبر کا انجام بُرا ہی ہوتا ہے، لیکن اپنی سب سے بڑی محسن ہستی کے سلسلہ میں تکبر تو ساری بُرائیوں کی جڑ ہے۔ تواضع، عاجزی اور اپنی عبدیت کا اظہار یہ ایسی چیز ہے، جس سے قبولیت حق کی توفیق عطا ہوتی ہے، ہر صورت میں عاجزی کی روش ہی کو اختیار کرنا ہے، اسی سے بندہ پر اللہ کی طرف سے نوازشوں کی بارش ہوتی ہے، جب کہ تکبر سے نحوست پیدا ہوتی ہے اور تکبر کا لازمی نتیجہ محرومی کی صورت میں ہی ظاہر ہوتا ہے، ایسے فرد کو ڈھیل ضرور دی جاتی ہے، لیکن جب پکڑ ہوتی ہے تو وہ سخت ہوتی ہے اور بچ نکلنے کے سارے راستے مسدود ہوجاتے ہیں۔ (مرتب)

عَبَسَ وَتَوَلّٰی أَن جَاءَهُ الْأَعْمَى . (سورۃ عبس، آیت نمبر ۱۔۲)

(پیغمبر چیں بجبیں ہوئے اور متوجہ نہ ہوئے، اس بات سے کہ ان کے پاس نابینا آیا، اور آپ کو کیا خبر کہ شاید وہ سنور جاتا)۔

عذر کی وجہ سے بے تمیزی کے صادر ہونے سے ناراض نہ ہونا

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص سے عذر یا ناواقفی کے سبب کوئی بے تمیزی صادر ہوجائے، اس سے روگردانی یا ناراضگی اختیار نہ کرے۔

تشریح:

سورۃ عبس کی یہ ابتدائی آیات ایک تو تزکیہ کے سلسلہ میں فیصلہ کن ہیں کہ اللہ کے نزدیک اصل اہمیت تزکیہ کی ہے، اگر قوم کے سردار تزکیہ کی طلب سے محروم ہیں اور ایک غریب اور نابینا فرد تزکیہ کی طلب رکھتا ہے تو سرداروں کے مقابلہ میں وہ غریب نابینا زیادہ توجہ کا مستحق ہے۔

مولانا نے سورۃ کی ابتدائی دو آیتوں سے یہ مفہوم نکالا ہے کہ اگر داعی الی اللہ کے پاس آنے والے فرد سے ناواقفی یا عذر کی وجہ سے آداب کی بجا آوری میں عدم احتیاط ہوجائے یا بدتمیزی صادر ہوجائے تو داعی کو بے پرواہی اور ناراضگی اختیار نہ کرنا چاہئے۔ بالخصوص ایسا طالب جو اصلاح وتزکیہ کی حقیقی طلب رکھتا ہے، اس سے دل میں ناراضگی کا احساس نہ ہونا چاہئے۔ یہ نکتہ ایسا ہے، جو ہر دور کے داعی الی اللہ کے لئے اہم نکتہ ہے،

جسے دعوتی کام کے وقت پیش نظر رکھنا چاہئے، ایسے مالدار افراد جو حق کی طلب سے محروم ہیں، انہیں زیادہ اہمیت نہ دینا چاہئے۔ (مرتب)

کلا بل ران علیٰ قلوبھم بما کانوا یکسبون. (سورۃ المطففین، آیت نمبر ۱۴)

(اور ہرگز ایسا نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کا زنگ بیٹھ گیا ہے۔)

قلب کی ظلمت

یہ آیت قلب کی ظلمت کے سلسلہ میں واضح ہے اور لوگوں کی گفتگو میں اس کا بکثرت استعمال بھی ہوتا ہے۔

تشریح:

اعمال بد کی ایک خراب ''خصوصیت'' یہ ہے کہ وہ اپنے ساتھ ظلمات لاتے ہیں، اس طرح یہ گناہ قلب کو زنگ آلود کردیتے ہیں، جس کی وجہ سے گناہوں سے بچاؤ کے سلسلہ میں قلب کی حس مردہ ہونے لگتی ہے، قلب کی ظلمات کے اثرات دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک باطنی گناہوں کے حوالے سے، دوسرے ظاہری گناہوں کے سلسلہ میں، بعض افراد ظاہری دینداری کے باوجود باطنی گناہوں میں مبتلا ہوتے ہیں، حرص وہوس، حسد، جلن اور کینہ جیسی برائیوں میں مبتلا ہوتے ہیں اور ان سے ان بُرائیوں کا ادراک سلب ہوجاتا ہے، یہ باطنی بُرائیاں بھی دراصل قلبی ظلمات ہی کا نتیجہ ہوتی ہیں، اس لئے قلب کی حفاظت اور اس کی سلامتی کی فکر کا ہونا ضروری ہے، اس لئے کہ سارے پاکیزہ اعمال کی سرانجامی کا دارومدار قلب کی سلامتی پر منحصر ہے، قلب کے بگڑنے سے یا تو اعمال میں جان اور روح مفقود ہوجاتی ہے یا پھر رسمی نوعیت کے اعمال سرانجام ہوتے ہیں، جس سے شخصیت کی زندگی میں نہ تو نکھار پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی قلبی سکوں کی دولت عطا ہوتی ہے۔

مشہور حدیث ہے کہ انسان جب گناہ کرتا ہے تو قلب پر ایک سیاہ نقطہ چڑھ جاتا ہے، اگر گناہ سے باز آجاتا ہے تو یہ سیاہ نقطہ صاف ہوجاتا ہے، لیکن اگر بار بار کرتا رہتا ہے تو یہ سیاہ نقطہ پھیل جاتا ہے، یہاں تک کہ قلب سیاہی سے عبارت ہوجاتا ہے۔

پھر اس طرح کے قلب کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اس پر نصیحت کی باتیں اثر انداز نہیں ہوتی، اس لئے کہ قلب ظلمات سے بھر گیا ہے اور ظلمات کے حامل قلب میں عبرت

وموعظت کی باتیں قبول کرنے کی صلاحیت مفقود ہوجاتی ہے، چنانچہ اہل اللہ کے ہاں قلب کے مفتی کی بیداری پر سب سے زیادہ زور دیاجاتا ہے، اور اعمال اور اپنی عادتوں کی نگرانی کرنے کی تاکید کی جاتی ہے، بلکہ اہل اللہ کے یہاں ذکر وفکر کا ایسا نورانی ماحول موجود ہوتا ہے کہ سیاہ قلب کا حامل فرد بھی اگر طلب کے ساتھ اس ماحول کا حصہ بنتا ہے تو اس کے قلب کی مادیت تبدیل ہونے لگتی ہے اور خود احتسابی پیدا ہوکر، اس کی نئی پاکیزہ عملی زندگی شروع ہوجاتی ہے، لیکن اہل اللہ تک رسائی کی توفیق کا ملنا، اللہ کے فضل خاص پر منحصر ہوتا ہے، اس لئے کہ ایک بار قلب کی سیاہی کے بعد پاکیزہ اعمال پر مشتمل نئی زندگی شروع کرنے کی طلب باقی نہیں رہتی۔

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقاً عَن طَبَق. (سورۃ الانشقاق، آیت نمبر ۱۹)

(تم لوگوں کو ضرور ایک حالت کے بعد دوسری حالت پر پہنچنا ہے)۔

قرب کے مقامات میں ترقی پر ترقی کا ہونا

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے تو اس سے مراد قرب کے مقامات میں ترقی ہے اور یہی شان ہے قرب کے مراتب واحوال کے سلسلہ میں آپ کے ورثہ عارفین کی۔

تشریح:

اللہ کی راہ محبت میں طالب صادق زندگی بھر ایمانی کیفیات، اللہ کے قرب کے حالات اور اللہ کی تجلیات سے بہرہ وری کے معاملہ میں مسلسل ارتقا پذیر ہوتے ہیں اور ان پر لگاتار ایک حالت کے بعد دوسری حالت، دوسری حالت کے بعد تیسری حالت طاری ہوتی رہتی ہے، جب سالک کو نئی ایمانی حالت نصیب ہوتی ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی یہ نئی حالت پچھلی حالت سے زیادہ بہتر ہے، عارف کے ساتھ مستقلاً یہ سلسلہ جاری رہتا ہے، جو موت تک جاری رہتا ہے، موت کے بعد قرب کے مقامات میں تو ان شاء اللہ اضافہ پر اضافہ ہی ہوگا۔ (مرتب)

قَدْ أَفْلَحَ مَن تَزَكَّى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى. (سورۃ اعلیٰ، آیت نمبر ۱۴)

(بامراد ہوگیا وہ شخص جو پاک ہوگیا، اور اپنے رب کا نام لیتا رہا اور نماز پڑھتا

رہا)۔

کامیابی کا معیار

یہ آیت اہل طریقت (واہل تصوف) کے اعمال کا مقصود ہے۔

تشریح:

تزکیہ کے بغیر کامیابی کے راستے مسدود ہیں، اس سلسلہ میں قرآن کی یہ آیت غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے، تزکیہ اخلاق رزیلہ سے پاکیزگی اور اللہ ورسول کی اخلاص کے ساتھ اطاعت کا ذریعہ ہے، تزکیہ نفس کے حوالے سے یہ نکتہ بیان ہونا بھی ضروری ہے کہ مشائخ کا کہنا ہے کہ انسان میں سات لطیفے رکھے گئے ہیں اور ہر لطیفہ میں دس ہزار پردہ نور رکھے گئے ہیں، جب تک یہ ستر ہزار حجاباتِ نور دور نہ ہوجائیں خطرہ ہی خطرہ ہے۔

راہ سلوک میں تزکیہ سے پہلے تصفیہ نفس (یعنی نفس کی صفائی) کا عمل جاری ہوتا ہے۔

تزکیہ نفس کا یہ عمل ایسا ہے، جو ستر ہزار حجابات کو دور کئے بغیر طے نہیں ہوتا، اس سے پہلے فرد تصفیہ نفس (یعنی نفس کے صفائی) کے عمل سے گزرتا ہے۔

تصفیہ نفس ایسی چیز ہے، جس میں کیفیات اور حالات کا ورود، شکل وصورت میں کچھ بہتری وتبدیلی، دوسری دنیا کا مشاہدہ، قبل از وقت باتوں کا علم ہونا، دوسروں کو متاثر کرنے اور ان کو اپنی طرف کھینچنے کی صلاحیتوں کا حاصل ہونا، نظروں میں کشش کا ہونا، اچھل کود کے عمل کا ہونا، بے خودی کی کیفیات کا طاری ہونا، وغیرہ شامل ہے، یہ چیزیں تصفیہ نفس، (نفس کی صفائی) سے تعلق رکھتی ہیں، جو نہ تو مطلوب ہیں اور نہ مقبولیت کی دلیل، یہ چیزیں تزکیہ کے سلسلہ میں ابتدائی نوعیت کی حامل ہوتی ہیں، تزکیہ اس سے آگے کی چیز ہے۔

تزکیہ میں جو چیزیں شامل ہیں، ان میں راہ محبت میں استقامت سے چلتے رہنا، حب جاہ، حب مال اور جملہ باطنی بیماریوں سے بچاؤ کی صورت کا پیدا ہونا، اوصاف حمیدہ کا حامل ہونا، زہد، فقر، توکل، تقویٰ اور رضا باالقضا کی صفات کا حاصل ہونا، اللہ کی مخلوق سے محبت کا ہونا، اللہ سے نسبت کا تعلق قائم ہونا، اسلامی شریعت کا عزیز تر ہونا، اللہ ورسول کے ہر حکم پر عمل پیرا ہونے کے لئے حساسیت کا ہونا، ہر قسم کی دعوئ سے دستبرداری کا ہونا،

دنیا واہل دنیا سے بے نیازی کا ہونا، دینی حمیت کا حاصل ہونا، مادی دنیا کے نفع ونقصانات کو زیادہ اہمیت نہ دینا، ہرقسم کے حالات میں صبر وشکر سے کام لینا، نفس کے خلاف معرکہ آرائی میں استقامت کا مظاہرہ ہونا، آخر وقت تک اپنی اصلاح وتزکیہ سے بے پرواہ نہ ہونا اور''احسان'' کا ہونا یہ ساری چیزیں تزکیہ میں شامل ہیں۔

جب کہ تصفیہ نفس، (نفس کی صفائی) میں اچھل کود، کیفیات واحوال، انوار اور مختلف رنگوں کے مشاہدے وغیرہ ہوتے ہیں اور اوصاف حمیدہ، رزائل سے بچاؤ اور اسلامی شریعت پر استقامت اور باطن کی پاکیزگی نہیں ہوتی اور دنیا کی محبت سے بچاؤ کی صورت بھی پیدا نہیں ہوتی۔

اگر تصفیہ نفس، (نفس کی صفائی) اور تزکیہ نفس، (نفس کی پاکیزگی) کے درمیاں اس فرق کا پوری طرح ادراک حاصل ہوجائے تو ایسے عامل نما بزرگ جو تزکیہ کے لئے مجاہدوں کے مراحل سے نہیں گزرے ہوتے اور اوراد ووظائف کی ریاضتوں یا سلوک کے جزوی عمل سے بزرگی کی مسند پر فائز ہیں اور جو مشقوں سے دوسروں کو متاثر کرنے، انہیں اپنی طرف کھینچے اور ان میں کچھ کیفیات واحوال پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، ان کی اصلیت کو سمجھا جا سکتا ہے، اس طرح حقیقی اہل اللہ تک رسائی کی راہ میں حائل حجابات دور ہوسکتے ہیں، جو سالکوں کو نفس کے حجابات سے اوپر اٹھاکر، ان کے لئے تزکیہ، احسان اور اللہ سے نسبت کے تعلق کو قائم کرنے کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

دین میں مقصود تزکیہ ہے، نہ کہ کیفیات واحوال وواردات اور اچھل کود اور تزکیہ کی سب سے بڑی علامت حسن اخلاق اور اسلامی شریعت پر اخلاص سے عمل پیرا ہونا اور دنیا واہل دنیا سے بے نیاز ہوجانا ہے، تصفیہ نفس اگرچہ نسبتا بہتر حالت ہے، لیکن تزکیہ نفس کے مقابلے میں اس کو کوئی قابل ذکر حیثیت حاصل نہیں۔

اسلام نے نجات کو تزکیہ نفس سے وابستہ کیا ہے، بدقسمتی سے اس دور میں تزکیہ نفس پس پردہ چلا گیا ہے، اصل اہمیت احوال وواردات، بہتر خواب، کشف اور دوسری دنیا کے مشاہدوں کو حاصل ہوگئی ہے، جو تزکیہ نفس اور تصفیہ نفس کی نوعیت کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے، اس کی وجہ سے دیکھا گیا ہے کہ افراد عام طور پر زندگی بھر انہی حالات میں الجھے رہتے ہیں اور تزکیہ نفس کی طرف آنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، یہ اس دور کے تصوف کا بڑا المیہ ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ راہ سلوک کے دوراں سالکوں کو تصفیہ نفس (نفس کی صفائی) کے نتیجے میں بعض کیفیات حاصل ہوتی ہیں، جن میں انوار، کشف، بہتر خواب اور بہتر احوال وغیرہ شامل ہیں، یہ ان کے لئے محبوب کی طرف سے ایک طرح کی تسلی وانعام ہوتا ہے، لیکن سالک کی اصل منزل اس سے آگے ہے اور وہ منزل تزکیہ ہے، جس میں اللہ سے نسبت کا تعلق قائم ہوتا ہے اور حجابات نفس کا بڑی حد تک قطع ہوجاتا ہے۔ اس کو ''یادداشت'' اور''احسان'' بھی کہتے ہیں۔

لیکن چونکہ تزکیہ کے حصول کے لئے غیرمعمولی ریاضتوں کی ضرورت ہوتی ہے اور عرصہ تک شب وروز چلنا پڑتا ہے، اس لئے تزکیہ،''احسان'' اور نسبت مع اللہ کے اس مقام تک رسائی عام طور پر مشکل ہوتی ہے، سالک، نفس کی صفائی کے عمل تک اکتفا کر لیتے ہیں اور تصفیہ نفس کے نتیجہ میں عام طور پر انہیں خلافت بھی ملنے لگتی ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ معاشرے کو تزکیہ، احسان اور نسبت مع اللہ کے حامل افراد بہت کم ملنے پاتے ہیں، چنانچہ نہ صرف یہ کہ معاشرے کی اسلامی بنیادوں پر تشکیل کام متاثر ہوا ہے، بلکہ تصوف واحسان کے ادارے یعنی خانقاہی نظام کی حیثیت بھی بہت زیادہ مجروح ہوئی ہے، علمی حلقوں میں تصوف کا نام لینا ہی جرم سمجھا جانے لگا ہے، اگرچہ اس میں اہل علم کے علمی حجابات کو بھی عمل دخل حاصل ہے۔

ضرورت ہے کہ تصفیہ نفس اور تزکیہ نفس کے درمیاں اس فرق کو پوری طرح سمجھا جائے،اسے نہ سمجھنے کی وجہ سے تزکیہ نفس کے نام پر دکانداری کا سسٹم مستحکم ہوا ہے، اس دکانداری سسٹم سے لاکھوں افراد وابستہ ہیں، جو کیفیات، حالات، احوال، بہتر خوابوں وغیرہ کو تصوف واحسان کا مقصود سمجھکر ، زندگی بھر بس انہی کیفیات میں رہنے کو حاصل سمجھتے ہیں۔

قرآن کی تصریح کے مطابق تزکیہ کے بغیر نجات نہیں ہوسکتی، چنانچہ تصوف واحسان کے نام پر دکانداری سسٹم نے افراد کو عام طور پر انوار وکیفیات واحوال میں مبتلا کر کے انہیں تزکیہ سے دور کر دیا ہے، جو سب سے زیادہ خسارے کی بات ہے۔

اخلاق میں پاکیزگی، سیرت وکردار میں نکھار، تزکیہ سے ہی پیدا ہوگا، نہ کہ تصفیہ نفس (یعنی نفس کی صفائی) سے اور قرآن کی تصریح کے مطابق تزکیہ انبیاء کرام کرتے تھے، اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ کرام کا تزکیہ کیا، جس کی وجہ سے صحابہ کرام کی ایمانی حالت اتنی

مستحکم ہوئی کہ وہ وقت کی بڑی طاقتوں سے ٹکرائے اور ان کو شکست سے دوچار کیا، یہ تزکیہ کے نتیجے میں حاصل ہونے والی قوت کا نتیجہ تھا، اس کے بعد تزکیہ کا یہ عمل علمائے ربانی کے حوالے ہوا ہے، حقیقی اہل اللہ کی مسلسل صحبت سے ہی تزکیہ کی استعداد حاصل ہوسکتی ہے، یہ امت کا تسلسل ہے۔

وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۔ (سورۃ الغاشیہ، آیت نمبر۲-۳)

(اس روز بہت سے چہرے ذلیل اور مصیبت جھیلتے خستہ ہوں گے)۔

اہل باطل کی ریاضتوں کا لاحاصل ہونا

روایات سے اس کا اہل باطل عابدین کے بارے میں ہونا معلوم ہوتا ہے کہ محنت ہی محنت کرنی پڑتی ہے اور انجام صرف جہنم، جو شخص ضلالت وبدعت کی حالت میں عبادت کرے، وہ بھی اس میں داخل ہے۔

تشریح:

عقائد کی خرابی اور بدعات کے ساتھ ہونے والی عبادت اور ذکر وفکر کے مجاہدے سب آخرت میں رد کردیئے جائیں گے اور وہ فرد وافراد کے لئے رسوائی کا موجب ہوں گے، اس لئے کہ توحید، رسالت اور آخرت کے عقائد کے بغیر عبادت کی بنیاد منہدم ہے، قرآن وسنت کے مطابق عقائد کا ہونا اور قرآن وسنت سے ثابت عبادت اور ذکر وفکر کا ہونا اصل ہے، اللہ کے لئے اس طرح کے ہونے والے مجاہدے ہی قابل قبول ہوں گے، ورنہ عقائد میں خرابی اور بدعات کے ساتھ ہونے والی عبادت فرد کے لئے غارت کا ذریعہ بنے گی۔ (مرتب)

فَأَمَّا الْإِنسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ كَلَّا ۔ (سورۃ الفجر، آیت نمبر۱۵-۱۶)

(سو فرد کو جب اس کا پروردگار آزماتا ہے یعنی اس کا اکرام کرتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے میری قدر بڑھادی، اور جب اس کو آزماتا ہے یعنی اس کی روزی اس پر تنگ کردیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے میری قدر گھٹادی، ہرگز ایسا نہیں۔)

سلسلہ میں داخل ہونے سے مال ودولت کی نفی

اس سے معلوم ہوا کہ بعض جاہل جو یہ کہتے ہیں کہ ہم جب سے فلاں سلسلہ میں

داخل ہوئے ہیں، اس وقت سے مال ودولت میں ترقی ہوگئی ہے تو یہ دلیل ہے اس سلسلہ کے مقبول ہونے کی، یہ محض جہل ہے۔

تشریح:

کسی بھی سلسلہ کے مقبول ہونے کی دلیل اس سلسلہ سے وابستہ افراد کی مادی خوشحالی ہرگز نہیں، بلکہ مقبولیت کا معیار تعلق مع اللہ میں اضافہ، اخلاق وکردار وسیرت میں پاکیزگی اور زہد وفقر کے مزاج کا پیدا ہونا ہے، روزی کی خوشحالی وتنگی یہ دونوں اللہ کی طرف سے افراد پر آزمائش کی حیثیت رکھتی ہیں، اللہ، خوشحالی وتنگی دونوں حالتوں میں رکھ کر یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ افراد حد اعتدال میں رہتے ہیں یا نہیں، صبر وشکر سے کام لیتے ہیں یا نہیں، خوشحالی سے سرکش تو نہیں ہوتے، غربت سے بے صبرے تو نہیں ہوتے، غرض کہ مقبولیت کی دلیل مادی خوشحالی ہرگز نہیں۔ (مرتب)

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۔ (سورۃ البلد، آیت نمبر۱۱)

(سو وہ شخص گھاٹی میں سے ہوکر نہ نکلا)۔

پہاڑ کی گھاٹی طے کرنے کی ضرورت

عقبہ کہتے ہیں پہاڑ کی گھاٹی کو، پس اس میں مجاہدے کی ترغیب ہے، اگرچہ اس میں ایک طرح کی تکلیف ہے۔

تشریح:

انسانی نفس میں موجود گھاٹی ایسی پیچیدہ اور دشوار گزار ہے کہ اسے ہمت وحوصلہ اور استقامت سے طے کرنے کی ضرورت ہے، اس گھاٹی کو مجاہدوں کے ذریعہ طے کئے بغیر اس میں انسانیت کے حقیقی بنیادی اوصاف اور محبوب سے وفاداری کا رشتہ مستحکم نہیں ہوتا، ذکر وفکر کے مجاہدوں سے منفی نوعیت کی عادتوں کی تبدیلی اور اس کے لئے سخت مشقت کی ضرورت ہے، انسانوں کی بہت بڑی اکثریت اس معاملہ میں اس لئے ناکام ہے کہ وہ نفس سے معرکہ آرائی کی خاطر مجاہدوں کے لئے تیار نہیں، دنیا میں موجود سارا فساد اس گھاٹی کو طے نہ کرنے کی وجہ سے درپیش ہے۔ (مرتب)

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۔ (سورۃ الشمس، آیت نمبر۸)

(پھر اس کی بدکرداری اور پرہیزگاری (دونوں باتوں کا) اس کو القا کیا)۔

نفس کو ہونے والا الہام

اضافت نفس کی طرف ہے، بعض (اہل علم کا کہنا ہے کہ) اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ نفس کو جس فجور وتقویٰ کا الہام ہوتا ہے، وہ وہ ہے جس کی اس میں پہلے سے استعداد تھی۔

تشریح:

انسانی شخصیت کی تخلیق میں گناہ اور تقویٰ دونوں رکھ دیئے ہیں، یعنی اس میں ان دونوں کی استعداد موجود ہے، روح ودل کی چاہت تقویٰ کے ذریعہ محبوب سے قریب ہونے کی ہے، اس اعتبار سے تقویٰ اور محبوب سے محبت کا داعیہ انسان کی اصل شخصیت کا طاقتور داعیہ ہے، جب کہ نفس انسانی کی ساخت میں دنیا سے محبت اور مادی حسن پر فدائیت کی ادائیں غالب ہیں، اس طرح گناہ اور تقویٰ دونوں داعیے انسانی شخصیت میں موجود ہیں، فرد کے لئے دونوں میں سے کسی بھی ایک طرف جانے کا موقعہ ہے اور اسے اس کی پوری آزادی ہے۔

روح کی چاہت تقویٰ اور اللہ سے خالص محبت اور اس کی اطاعت ہے، جب کہ نفس کا داعیہ مادہ پر ٹوٹ کر گر پڑنے کا ہے، فرد کی شخصیت میں یہ دونوں داعیے رکھ کر، اسے موقعہ دیا گیا ہے کہ وہ کس راستہ کو اختیار کرتا ہے، روح اور دل کی طمانیت کے راستے کو یا خواہشات کی تسکین کی راہ کو، محبوب سے محبت کی راہ کو یا دنیا کی محبت کے راستے کو۔

وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ. (سورۃ الضحیٰ، آیت نمبر ۴)

(اور آخرت آپ کے لئے دنیا سے بدرجہا بہتر ہے)۔

ہر حالت کا پہلی حالت سے بہتر ہونا

دونوں الف لام میں یہ بھی احتمال ہے کہ استغراق کے لئے ہوں، یعنی آپ کو لاحق ہر حالت پہلی حالت سے زیادہ افضل واکمل ہے، پس وحی جو بند ہوگئی تھی، جس کو اصطلاح میں قبض کہتے ہیں، وہ پہلے بسط سے زیادہ اکمل تھی اور پھر جب وحی جاری ہوگئی تو یہ اس

قبض سے افضل تھی، عارف کو بھی اسی پر راضی رہنا چاہئے تو اس سے وہ قبض سے غم زدہ نہ ہوگا۔

تشریح:

عارف کو راہ محبت میں قبض وبسط کے حالات سے گزرے بغیر چارہ کارنہیں، عارف پر طاری ہونے والا ہر قبض اس کے لئے پہلے سے زیادہ بسط کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے، ہر قبض کے بعد جب اس پر بسط کی حالت طاری ہوتی ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ ہر نیا قبض تو اس پر محبوب کی طرف سے ایک طرح کی نعمت تھی، اس لئے کہ ہر قبض کو ہمت وحوصلہ سے برداشت کرنے کے نتیجہ میں اس پر قرب کی راہیں کھول دی جاتی ہیں، چونکہ اللہ کے قرب کے درجات بے حد وحساب ہیں، اس لئے ہر قبض (بے چینی) کے بعد عارف قرب کے مقامات میں آگے ہی بڑھتا رہتا ہے، طالب صادق کے ساتھ اللہ کا یہ معاملہ موت تک جاری رہتا ہے، ہر بسط (خوشی) کے بعد وہ محسوس کرتا ہے کہ اس سے پہلے والے بسط کی حالت میں کمی موجود تھی، ہر نیا بسط اس کے دل وسینہ کی مزید کشادگی کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔

قبض کی اس نوعیت کو سمجھنے کے بعد طالب صادق کو مطمئن ہونا چاہئے کہ یہ ساری صورتیں اسے محبوب سے مزید قریب کرنے کا موجب ہیں۔ (مرتب)

الم نشرح لک صدرک ووضعنا عنک وزرک الذی انقض ظهرک ورفعنا لک ذکرک فان مع العسر یسریٰ ان مع العسر یسریٰ. (سورۃ الم نشرح، آیت نمبر ۶)

(کیا ہم نے آپ کی خاطر آپ کا سینہ کشادہ نہیں کردیا، جس نے آپ کی کمر توڑ رکھی تھی اور ہم نے آپ کی خاطر آپ کا آوازہ بلند کردیا، سو بیشک موجودہ مشکلات کے ساتھ آسانی ہے، بیشک موجودہ مشکلات کے ساتھ آسانی ہے۔)

اللہ کی محبت کے رازدان کے کچھ حالات

(اللہ سے) وصول سے پہلے سالک کو قلبی طور پر جو تنگی، بوجھلپن اور حیرت درپیش ہوتی ہے، جو اس کی کمر کو توڑ ڈالتی ہے، وہ وزر میں داخل ہے، اس کے بعد جب حالت

وصول ہوتا ہے تو اسے وسعت، خوشی واطمینان نصیب ہوتا ہے، اس وقت خلق کی طرف توجہ، توجہ الی اللہ کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتی، وہ شرح صدر میں داخل ہے، پھر ارشاد کی مصلحت سے کبھی اسے شہرت عنایت ہوتی ہے تو وہ رفع ذکر میں داخل ہے اور عادۃً مجاہدہ کرنے والا ان دونوں سے مشرف ہوتا ہے، ان مع العسر یسریٰ میں اس طرف اشارہ ہے۔

تشریح:

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل عالم ربانی بھی قبض وبسط کے غیر معمولی حالات سے گزرتا ہے، جب اس کے دل پر اسم ذات کے ذکر کا شدت سے ورود ہوتا ہے تو اس کا دل بے ساختہ ہوجاتا ہے اور وہ ذکر کے اثرات سے محوحیرت ہوجاتا ہے، جب اس پر قبض کی حالت طاری ہوجاتی ہے تو وہ ہیبت زدہ ہونے کے ساتھ ساتھ سراپا مضطرب ہوجاتا ہے، اس لئے کہ اللہ کی جلالی صفت کا عکس اس کی کمر کو توڑ کر رکھ دیتا ہے، کافی طویل عرصہ تک ذکر وفکر میں محویت، قبض وبسط کے بے شمار مراحل سے گذرنے کے بعد ایک وقت آتا ہے کہ اسے اس سارے بوجھل پن اور اضطراب سے بڑی حد تک محفوظ کردیا جاتا ہے اور اسے حالتِ وصال نصیب کردی جاتی ہے، حالتِ وصال میں وہ محبوب کے ساتھ حالتِ بقا میں رہنے لگتا ہے اور ساتھ ساتھ خلق کی طرف بھی متوجہ ہوتا ہے، اب خلق کی طرف توجہ اس کے لئے متوجہ الی اللہ ہونے کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتا، دعوتی کام، تربیتی کام اور ارشاد کا کام اس کے اہداف میں شامل ہونے لگتا ہے، اس کام کے دوران مصلحت کی خاطر اللہ کی طرف سے اسے شہرت بھی دے دی جاتی ہے، لیکن اس شہرت سے اس کے باطنی اور عملی حالات میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا، یعنی وہ بڑے پن سے محفوظ رہتا ہے، فقر وزہد کے اس کے حالات میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی، وہ اللہ کے طالبوں کے لئے ہر وقت دستیاب ہوتا ہے۔

فاذا فرغت فانصب والیٰ ربک فارغب (سورۃ الم نشرح، آیت نمبر ۷-۸)

(تو جب آپ فارغ ہوجایا کریں تو محنت کیا کیجئے اور اپنے رب کی طرف توجہ

رکھئے)

شیخ کا فکر اور مناجات سے بے نیاز نہ ہونا

اس میں اشارہ ہے کہ جب شیخ افادہ وارشاد (لوگوں کی تربیت اور تلقین) کے کام سے فارغ ہوجائے تو خلوت میں اسے فکر ومناجات میں مشغول رہنا چاہئے، وہ اپنے کو مجاہدہ سے مستغنیٰ نہ سمجھے۔

تشریح:

عالم ربانی اور شیخ جو لوگوں کی تربیت وتزکیہ کے مقام پر فائز ہوتا ہے، وہ اگرچہ زندگی کا بڑا حصہ ذکر وفکر کے مجاہدوں میں صرف کرچکا ہوتا ہے، ان مجاہدوں کی برکت سے اس کا نفس سنور جاتا ہے اور وہ دوسروں کے نفس کے سنوارنے کے کام میں مصروف ہوتا ہے، اس مصروفیت کے دوران بھی اسے ذکر وفکر اور اللہ کی تسبیح وتعریف کے کام سے بے نیاز ہرگز نہ ہونا چاہئے، اس لئے کہ دعوتی، علمی وتربیتی کاموں کی وجہ سے توجہ ان کاموں کی طرف مبذول ہونے لگتی ہے اور کچھ وقت کے بعد یعنی دو چار گھنٹے کے بعد دل اور روح کی محبوب کے لئے ذکر کی تشنگی پیدا ہونے لگتی ہے، دل اور روح کو روزانہ ذکر وفکر کی خوراک دیتے رہنا ناگزیر ہے، اس کے بغیر شیخ کی تعلیم وتربیت کے کاموں میں برکت واثرات میں کمی واقع ہوگی، یہ اہم نکتہ ہے، جسے سمجھ کر اس کا اہتمام ہوتے رہنا چاہئے۔

وَمَا اُمِرُوا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَاء . (سورۃ البینہ، آیت نمبر ۵)

(حالانکہ ان کو یہی حکم ہوا تھا کہ اللہ کی اس طرح عبادت کریں کہ عبادت کو اسی کے لئے خالص رکھیں)

اخلاص اور اس کے تکمیلی مراحل کی اہمیت

اس میں اخلاص اور اس کے تکمیلی مرتبے کا ذکر ہے، اس کو حقیقت سے تعبیر کیا گیا ہے، یہ نص ہے۔

تشریح:

دین میں اخلاص کو فیصلہ کن اہمیت حاصل ہے، اخلاص کے بغیر سارے دینی کاموں کے ضیاع کا خطرہ لاحق رہتا ہے، ریا، دکھاوا، تکبر، شیخی، دین کے نام پر مال کے حصول کی کوششیں، یہ ساری چیزیں ایسی ہیں، جو اخلاص کے منافی ہیں، اس کی وجہ سے سارے اعمال غارت ہوسکتے ہیں، پھر اخلاص کے درجات ہیں، اگر شروع میں اعلیٰ درجہ کا اخلاص نہ بھی ہو تو کم ازکم اخلاص کے قابل ذکر اجزاء تو ضرور موجود ہونے چاہئے۔

اخلاص کے بارے میں یہ حقیقت واضح ہونی چاہئے کہ اخلاص، اہل اخلاص کی صحبت سے حاصل ہوتا ہے، اہل اخلاص کی صحبت کے بغیر اپنے طور پر اخلاص کے مقامات طے کرنا اور اخلاص کے بہتر سے بہتر مقام پر فائز ہونا محال ہے۔

پہلے ہمارے یہاں سالک اخلاص سیکھنے کے لئے پندرہ بیس سال تک شب وروز مجاہدوں سے کام لیتے تھے اور اہل اللہ کی زیر صحبت یہ مراحل طے کرتے تھے، اخلاص کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ نفسی قوتیں ہیں، جب تک نفسی قوتوں سے جان خلاصی نہیں ہوتی، للھیت پیدا نہیں ہوسکتی، پاکیزہ اخلاقیات کا تعلق بھی اخلاص سے ہے، اخلاص ہوگا تو اچھے اخلاق پیدا ہونگے۔

بدقسمتی سے اس دور میں دوسرے سارے کاموں کو اہمیت حاصل ہے، ان کے لئے وقت بھی موجود ہے، لیکن اخلاص کے حصول کی کوششوں کے لئے نہ تو وقت ہے اور نہ ہی اس کے لئے فکرمندی، چنانچہ دنیا دار لوگوں کی بات ہی الگ ہے، خود دنیدار لوگ اخلاص کے حصول کے کام کو قابل ذکر کام نہیں سمجھتے، چنانچہ اس کے لئے وقت نہیں نکالتے، جس کی وجہ سے دینی کاموں میں وہ خیر وبرکت موجود نہیں رہی، جو اخلاص کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ (مرتب)

والعصر ان الانسان لفی خسر. (سورۃ العصر، آیت نمبر۱-۲)

(قسم ہے زمانہ کی کہ انسان بڑے خسارہ میں ہے)

وقت کی قدر وقیمت

ابن عباس نے دہر (وقت) سے اس کی تفسیر بیان فرمائی ہے، پس اس میں تنبیہ

ہے وقت اور عمر کی نعمت کے ضایع ہونے پر اور اس پر اہل اللہ خوب متنبہ ہوئے ہیں کہ وہ ایک لمحہ ضایع نہیں کرتے یا کمال حاصل کرتے ہیں، جس کا ذکر امنوا وعملوا میں ہے، یا تکمیل میں مشغول رہتے ہیں، جس کا ذکر تواصوا میں ہے۔

تشریح:

عمر اور وقت بے بہا دولت ہے، بلکہ سب سے بڑا سرمایہ ہے، اس سرمائے کے صحیح استعمال کے ذریعہ آخرت میں پونجی جمع کرنا، سب سے بڑی دانشمندی ہے، عمر برف کی طرح پگھلتی جارہی ہے، اسے اگر آخرت کے مقاصد کے لئے صرف نہ کیا گیا تو سراسر گھاٹے کا سودہ ہے اور فرد کو آخرت میں خون کے آنسو بہانے پڑیں گے، اس لئے وقت کی قیمتی دولت کو اصل مقصد کے استعمال کے بجائے اسے ضایع کردیا گیا تو سب سے بڑا خسارہ ہے، اہل اللہ پر اللہ کا سب سے بڑا فضل یہ ہے کہ وہ وقت کے ایک ایک لمحہ کے صحیح استعمال کے لئے فکرمند ہوتے ہیں، وہ وقت کے غلط استعمال کے متحمل ہی نہیں ہوتے، وہ یا تو وقت کو دعوتی وتربیتی کاموں کے لئے صرف کرتے ہیں یا پھر محبوب کے ساتھ راز ونیاز میں۔

غیر ضروری کاموں میں وقت کے استعمال سے وہ شدید اذیت محسوس کرتے ہیں، ہمیں وقت کے صحیح استعمال کا سلیقہ اہل اللہ سے سیکھنا چاہئے، اہل اللہ کی صحبت سے جب اللہ کی محبت پیدا ہونے لگتی ہے تو اللہ کی یہ محبت، فرد وافراد کو زندگی کے سارے رازوں، آداب اور سلیقہ زندگی سے آشنا کردیتی ہے اس لئے یہ کہنا بجا ہوگا کہ ساری دنیا کی دولت خرچ کرکے بھی، اگر اہل اللہ کی صحبت حاصل ہو تو سستا سودا ہے، دنیا کی ساری مصروفیات ترک کرکے بھی اگر یہ نعمت حاصل ہو تو بڑی سعادت شمار ہوگی۔ (مرتب)

الذی جمع مالا وعدده. (سورۃ الھمزۃ، آیت نمبر۱-۲)

(بڑی خرابی ہے ہر ایسے شخص کے لئے جو مال جمع کرتا ہو اور بار بار گنتا ہو)

مال سے محبت کا بڑی خرابی ہونا

اس میں ذکر ہے کہ ایسا مال جمع کرنا، جس میں محبت وشغف ہو، اور جس کے آثار

میں بار بار گننا شار ہو، وہ مال مذموم ہے۔

تشریح:

مال کے لئے کوششوں کا حصول بجائے خود غلط نہیں، بلکہ ایک حد تک دینی فریضہ ہے، تاکہ معاشی ضروریات کے لئے لوگوں کی محتاجی نہ ہو، لیکن مال جمع کرنے کا جنون ہونا، اس کا حریص ہونا، مال سے محبت کا ہونا، وقت اور عمر کا بڑا حصہ مال جمع کرنے میں صرف ہونا، اس نیت سے مال کو بار بار گنتے رہنا، دل میں مستقل طور پر مال کی طرف توجہ اور کھٹکہ کا ہونا، یہ ساری چیزیں ایسی ہیں، جو ہلاکت کا سبب ہے، مال کی اس محبت کی وجہ سے جتنی بھی خرابیاں پیدا ہوں، کم ہیں، البتہ اگر مال کی محبت نہ ہو اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا طاقتور تقاضا موجود ہے تو اس طرح کی کوششیں نہ صرف غلط نہیں، بلکہ ایسا مال باعث خیر وبرکت ہے کہ اس سے دینی کاموں کو تقویت ملتی ہے اور اللہ کی مخلوق کی مدد کی صورت پیدا ہوتی ہے، لیکن اس دور میں عام طور پر مال جمع کرنے کی حرص، مال کی محبت کی وجہ سے ہے، جو سب سے بڑی آفت ہے، مال کی یہی محبت معاشرے میں سب سے زیادہ فساد کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

لایلاف قریشِ ایلافھم رحلة الشتاء والصیف فلیعبدوا رب ھذاالبیت .
(سورۃ قریش، آیت نمبر۳)

(چونکہ قریش خوگر ہوگئے ہیں، یعنی جاڑے اور گرمی کے سفر کے ساتھ خوگر ہوگئے ہیں تو ان کو چاہئے کہ اس خانہ کعبہ کے مالک کی عبادت کریں)

دینی حوالے سے حاصل ہونے والے منصب کا تقاضا

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی فرد کو دینی معاملہ کے سبب مال ومنصب نصیب ہو، جیسا قریش کو بیت اللہ سے تعلق کے واسطہ سے تھا، جس کا ذکر اس (سورہ) میں ہے، اس کا حق یہ ہے کہ وہ فخر اور دعویٰ کے استحقاق کے بجائے اللہ تعالیٰ کا شکر اور اس کی اطاعت کا زیادہ اہتمام کرے۔

تشریح:

دینی خدمت کے کاموں کی وجہ سے معاشرے میں مقام کا حاصل ہونا، یہ اللہ کی بڑی نعمت ہے، اس نعمت کی حق ادائیگی کی صورت یہ ہے کہ دعویٰ پیدا ہونے کی بجائے عجز اور تواضع پیدا ہو اور اللہ کی طرف رجوع ہونے اور اس کی اطاعت کی کوششوں میں مزید اضافہ ہو، انعام کی شکر ادائیگی کی یہی صورت ہے، ورنہ خطرہ درپیش ہوتا ہے کہ کہیں یہ نعمت سلب نہ ہوجائے، یا دینی خدمت کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے مقام کو فرد اپنے مقاصد شہرت اور حصولِ دولت وغیرہ کے لئے استعمال نہ کرنے لگے، سخت احتیاط کی ضرورت ہے۔

ان شانئک ھوالابتر. (سورۃ الکوثر آیت نمبر۳)
(بالیقین آپ کا دشمن ہی بے نام ونشان ہے)

اللہ کے رسول اور اہل اللہ کی مخالفت کے نتائج

اس میں دلیل ہے کہ آپ کا ہر مخالف ہر خیر (کے کام) سے منقطع ہے کہ نہ اس کی زندگی میں برکت ہے کہ اس سے آخرت کا سامان تیار کرے، نہ اس کے قلب میں خیر ہے کہ حق بات کو سمجھے یا اس میں حق تعالیٰ کی محبت ومعرفت پیدا ہو، نہ اعمال میں برکت ہے کہ توفیق واخلاص حاصل ہو، اور یہی حالت ہوتی ہے آپ کے ورثہ کے مخالف کی، جیسا حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص میرے ولی سے دشمنی اختیار کرے، میں اس سے اعلان جنگ کرتا ہوں۔

تشریح:

اللہ کے رسول کی مخالفت کے بعد زندگی میں خیر وبرکت پیدا ہوسکے، آخرت کی فکر نصیب ہوسکے، اللہ کی محبت ومعرفت حاصل ہوسکے، ممکن نہیں، اس لئے کہ اللہ نے سارے خیر کا منبع اپنے رسول ہی کو بنایا ہے، ان کی مخالفت کے بعد فرد وافراد سارے خیر سے محروم ہوجاتے ہیں، یہی حالت اللہ کے رسول کے وارثوں یعنی علمائے ربانی کی مخالفت کے نتیجہ

میں پیدا ہوتی ہے، تزکیہ کا عمل عالم ربانی سرانجام دیتا ہے، اللہ کی محبت ومعرت کے اسرار ورموز سے وہی آشنا کرتا ہے، نفسی قوتوں کے مد وجزر سے نکال کر اصلاح کا فریضہ وہی سرانجام دیتا ہے، یہ اس کی منصبی ذمہ داری ہے۔

عالم ربانی کی مخالفت کے نتیجہ میں بھی فرد زندگی میں خیر وبرکت اور محبت ومعرفت سے عام طور پر محروم رہتا ہے۔

یہ ایسا نکتہ ہے، جو عقلیت کی تیزی کی وجہ سے اس دور میں سب سے زیادہ نظر انداز ہوا ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ علوم وفنوں عام طور پر خیر وبرکت سے خالی ہوگئے ہیں، پاکیزہ الفاظ کا استعمال تو بہت زیادہ ہوگیا ہے، لیکن ان الفاظ میں موجود کارفرما اصلیت سے محرومی ہے۔ (مرتب)

اذا جاء نصرالله والفتح ورئيت الناس يدخلون فى دين الله افواجا فسبح بحمد ربک واستغفره انه كان توابا. (سورۃ النصر، آیت نمبر ۱-۳)

(جب اللہ کی مدد اور فتح آپہنچے اور آپ لوگوں کو اللہ کے دین میں جوق در جوق داخل ہوتا ہوا دیکھ لیں تو اپنے رب کی تسبیح وتحمید (حمد) کیجئے اور اس سے مغفرت طلب کیجئے، وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے)

داعی کی زندگی کا اللہ کے ذکر وتسبیح سے وابستہ ہونا

اس کا حاصل حسب روایات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے کہ دعوت وتبلیغ کے کام سے فارغ ہونے کے بعد اللہ سے لقاء (ملاقات) کے لئے خاص طور پر سامان کرنا چاہئے، اس طرح اہل طریقت (اہل تصوف) کو بھی چاہئے کہ جب دعوت کے کام سے فارغ ہوں تو اپنے رب کی عبادت کے لئے فارغ ہوجائیں۔

تشریح:

اللہ کی تسبیح وتحمید کا کام ایسا ہے، جس سے اخلاص، للھیت اور اللہ سے قربت پیدا ہوتی ہے اور اللہ سے راز ونیاز سے قلب کو تسکین اور تشفی ہوتی ہے، یہ کام بجائے خود دینی

مقاصد میں شامل ہے، جب اللہ کے رسول کو اس کی تاکید ہے تو دوسرے دعوتی کام کرنے والوں کو تو اس کا مزید اہتمام کرنا چاہئے۔

بات یہ ہے کہ دین کا دعوتی، علمی اور عملی کام کرنے میں ایمانی قوت خرچ ہوتی ہے، اور تھوڑی دیر کے دعوتی کام کے بعد دل میں تشنگی محسوس ہونے لگتی ہے اور اخلاص متاثر ہونے لگتا ہے، اس طرح کے سارے احساسات کا علاج اللہ کے ذکر اور اس کی تسبیح وتعریف بیان کرنے سے وابستہ ہے، اس لئے کہ اس سے دل میں نئی ایمانی طاقت اور انوار اور معنوی حسن کے طاقتور اجزاء داخل ہوتے ہیں، جس سے داعی مستحکم سے مستحکم تر ہوتا ہے، داعی کی زندگی اللہ کے ذکر وتسبیح سے ہی وابستہ ہے۔ (مرتب)

من شرالوسواس الخناس. (سورۃ الناس، آیت نمبر۴)

(پناہ مانگتا ہوں)(وسوسہ ڈالنے والے پیچھے ہٹ جانے والے کے شر سے۔)

قلبی ذکر کے وقت شیطان کا بھاگ جانا

حدیث میں ہے کہ (شیطان) غفلت کے وقت ہی وسوسہ ڈالتا ہے، جب کہ قلبی ذکر کے وقت وہ بھاگ جاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ غفلت کا علاج ذکر سے ہوتا ہے۔

تشریح:

حکیم الامت نے اس حاشیہ میں قلبی ذکر جسے (اصطلاح میں مراقبہ کہتے ہیں) اس کی اہمیت واضح فرمادی ہے، قلبی ذکر اغوائے شیطانی اور اغوائے نفسانی سے بچاؤ کا سب سے بڑا ہتھیار ہے اور جملہ مصائب اور ناپاکیزہ احساس کا حل بھی، اس لئے کہ قلبی ذکر کے ذریعہ جب فرد کا اللہ سے تعلق قائم ہوتا ہے تو نہ صرف یہ کہ شیطان بھاگ جاتا ہے، بلکہ نفسی قوت بھی مضمحل ہونا شروع ہوجاتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ قلبی ذکر کے اتنے فوائد وثمرات ہیں کہ افراد معاشرہ کو اگر شدبد ہوجائے تو وہ سارے کاموں اور ساری مصروفیات کو اوپر نیچے کرکے، اس ذکر پر ٹوٹ پڑیں۔

ایک بزرگ جس نے قلبی ذکر پر بیس سال تک مجاہدے کئے، اس نے اپنی ایک

کتاب میں لکھا ہے کہ نفس کی مثال اس غار کی سی ہے، جس میں نفس وشیطان رہتے ہوں، اوراد ووظائف کی مثال غار کے دروازے پر زور سے لاٹھیاں برسانے کے مترادف ہے، ان لاٹھیوں کی آواز سے غار میں موجود نفس اور شیطان میں کوئی زیادہ ہلچل یا تہلکہ مچ جائے، دشوار بات ہے، (یہاں اوراد ووظائف کی کم، اہمیت کا تاثر پیدا ہونا صحیح نہ ہوگا، بلکہ مقصود صرف اللہ کے اسم ذات کے قلبی ذکر کی اہمیت کو اجاگر کرنا ہے) قلبی ذکر اتنا طاقتور ہے کہ اس کے کرنے سے گویا آپ نے غار کے اندر گرم ترین پانی کا فوارہ چھوڑ دیا، جس سے وہ راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں، قلبی ذکر کی یہ ایسی مسلمہ اہمیت ہے، جو ہر اس فرد پر واضح ہوجاتی ہے جو یہ ذکر کرتا ہے، اس لئے ایک حدیث شریف میں قلبی ذکر کو جہری ذکر سے ستر گنا افضل قرار دیا گیا ہے۔

قلبی ذکر شروع میں اگرچہ دشوار ہوتا ہے کہ نفس وشیطان سے ایک طرح کی معرکہ آرائی شروع ہوجاتی ہے اور وسوسے بھی آنے لگتے ہیں، لیکن نفس اور شیطان کو راہ فرار اختیار کرنے کا راستہ بھی یہی ہے، قلبی ذکر کے نفس اور شیطان سے معرکہ آرائی کے سلسلہ میں فیصلہ کن کردار کا راز یہ ہے کہ اس میں ساری ذہنی اور قلبی توانائیاں اللہ کے انوار حسن کے اخذ میں صرف ہوتی ہیں، اس ارتکاز قوت کی وجہ سے جہاں فرد کی شخصیت میں اللہ کے انوار کی شعائیں بکھرنے لگتی ہیں، وہاں شخصیت اللہ کے انوار حسن سے بھی فیضیاب ہونے لگتی ہے، جس کی وجہ سے دل میں مادی حسن کی کشش باقی نہیں رہتی، لیکن ذکر کا یہ فائدہ مستقل مزاجی سے ذکر کرتے رہنے کے نتیجہ میں ہی حاصل ہوتا ہے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے غار حرا میں اللہ کے اسم ذات کا قلبی ذکر کرتے تھے، اس لئے قلبی ذکر کے بارے میں مغالطہ پیدا کرنے کی کوششیں اللہ کی معرفت سے نا آشنائی کا نتیجہ ہیں۔

قلبی ذکر ویسے تو ہر دور میں بندہ مؤمن کے لئے ناگزیر رہا ہے، لیکن موجودہ دور میں جب کہ مادی حسن اور دنیا کی رونق اور زیب وزینت کا سامان خوبصورتی کے ساتھ

ظاہر ہوکر عریاں ہوکر، لگ بھگ ہر فرد کو مسحور کرنے کا موجب بن چکا ہے، اس دور میں قلبی ذکر کے بغیر فرد وافراد، جتنے بھی مسائل ومصائب اور ان کی شدتِ احساس کا شکار ہوں، وہ کم ہے، اس دور میں قلبی ذکر کے بغیر فرد کے ذہنی توازن کا قائم رہنا اور اعصاب ونفسیات کے تناؤ سے بچنا امر محال ہے۔

قلبی ذکر کوئی علمی اور استدلالی چیز نہیں ہے کہ الفاظ میں اس کی حقیقت بیاں ہوسکے، بلکہ یہ تو خالص مشاہداتی چیز ہے، جو عملاً کر کے اس کے فوائد وثمرات سے فیضیاب ہوا جاسکتا ہے اور زندگی کو جنت کے منظر میں تبدیل کیا جاسکتا ہے، یہ سعادت عظمیٰ خوش نصیب افراد ہی کو حاصل ہوتی ہے، ورنہ بڑے بڑے صاحبان علم اس کے جواز وعدم جواز اور قیل وقال کا شکار ہوکر، زندگی بھر اس سعادت سے محروم رہ جاتے ہیں، اس لئے کہ شیطان ذکر سے غفلت کے وار سے دل سے ذکر کی اہمیت کو مجروح کر چکا ہے جس کی وجہ سے علم سے نور ونورانیت سلب ہوجاتی ہے، یہ ذکر سے غفلت کا لازمی نتیجہ ہے، حالانکہ علم کو تو ہر اعتبار سے باعث خیر وبرکت اور رجوع الی اللہ کا ذریعہ ہونا چاہیے، قلبی ذکر یعنی مراقبہ میں فرد مادی حسوں اور ظاہری دنیا سے یکسو ہوکر، باطن میں ڈوب جاتا ہے، جس سے رفتہ رفتہ روح کی لطافتیں نفس کی کثافتوں پر غالب آنا شروع ہوجاتی ہیں، نفس اور شیطان کی جملہ شرارتوں سے بچاؤ کی صورت بھی پیدا ہوجاتی ہے اور فرد کا فطرت سلیمہ سے رشتہ منسلک ہونے لگتا ہے، چنانچہ فرد کے باطن پر معرفت کے علوم کا القا ہونے لگتا ہے، یہ علوم ایسے ہیں، جو قرآن وسنت میں موجود نور سے مطابقت رکھتے ہیں، قرآن وسنت میں موجود نور تک رسائی کی راہ میں اصل رکاوٹ نفسی قوتیں ہوتی ہیں، اللہ کے قلبی ذکر یعنی مراقبہ سے اندر میں غوطہ زنی کے ذریعہ نفسی قوتوں کی پامالی ہونا شروع ہوجاتی ہے، یہ پامالی جب آخری مرحلہ پر پہنچ جاتی ہے تو اندر سے علوم کا چشمہ پھوٹ نکلتا ہے، جسے حدیث میں "استفت قلبک" فرمایا گیا ہے، یعنی ہر معاملہ میں اندر کے مفتی سے پوچھا کرو۔

مذکورہ حاشیہ میں غفلت کا علاج ذکر بتایا گیا ہے، اس اعتبار سے جائزہ لیا جائے تو

معلوم ہوگا کہ ذکر اور ہمارے درمیاں اتنے حجابات پیدا ہوچکے ہیں کہ ہمارے پاس دنیا کے ہر کام کے لئے وقت موجود ہے، جب کہ ذکر کے لئے وقت موجود نہیں، اور اس کے لئے سو بہانے تراشے جاتے ہیں، یہ دراصل مادی دنیا میں محویت کا نتیجہ بلکہ اس کی سزا ہوتی ہے، محبوب حقیقی کو بھلا دینے اور اس کے ذکر کو اہمیت نہ دینے کی جتنی بھی سزا ملے، وہ کم ہے۔

ذکر سے غفلت اتنی بڑی مصیبت ہے کہ وہ اپنے ساتھ وسوسوں اور مادی زندگی کے مستقبل کو بہتر بنانے کے خیالات کا طوفان لاتی ہے، اس لئے ذکر سے غفلت کو معمولی ہرگز نہ سمجھنا چاہیے، جب تک ذکر کی مشقوں سے متوجہ الی اللہ ہونے کا ملکہ راسخ نہ ہو، اس وقت تک وسوسوں اور مادی نوعیت کے خیالات کے ہجوم سے بچنے کی صورت کا پیدا ہونا امر محال ہے، ذکر سارے تفکرات سے بچاؤ اور دل اور ذہن پر پڑنے والے ہر قسم کے بوجھ کو ہلکا کرنے کا مؤثر ترین نسخہ ہے، ذکر سے غفلت شیطان کا سب سے بڑا وار ہے، جس کے ذریعہ وہ فرد وافراد کو مادیت کی دلدل میں مبتلا کرنے کا موجب بن جاتا ہے، ذکر سے غفلت کی یہی سزا کوئی کم سزا نہیں ہے کہ فرد حرص وہوس کے عذاب میں مبتلا ہوجاتا ہے اور چھوٹے سے چھوٹے معاملہ پر آگ بگولہ ہوجاتا ہے، مزاج کے خلاف ہونے والے واقعات پر شدید ذہنی خلفشار کا شکار ہوجاتا ہے اور اپنے اس مشتعل، غیر معتدل اور مریضانہ مزاج کی وجہ سے وہ اپنے اہل خانہ اور دوست واحباب کے لئے وبال بن جاتا ہے۔

ذکر سے غفلت کے سلسلہ میں اصل رکاوٹ دنیا کے اپنے بھرپور حصہ سے دستبردار نہ ہونا اور دنیادار دوستوں کی صحبت کے ماحول میں رہنا ہے اور یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں جس سے فرد ہمت حوصلہ کے مظاہرے سے بچ سکتا ہے اور ذکر کی دنیا میں آ کر، اس کے فوائد وثمرات سمیٹ سکتا ہے، اس طرح وہ سعادت دارین کی راہ پر گامزن ہوسکتا ہے، دوسری صورت میں دونوں جہانوں کی سعادت سے محرومی ہی محرومی ہے، خود احتسابی سے کام لینے کی ضرورت ہے، ساٹھ ستر سال کی عمر کا دھوکہ ایسا ہے، جو فرد وافراد میں یہ مغالطہ

پیدا کرتا ہے کہ ابھی تو بہت وقت ہے، اپنے وقت پر ذکر بھی کرلیں گے، یہ مغالطہ فرد کو مادی دنیا میں اتنا مستغرق کردیتا ہے کہ وہ عام طور اس دلدل سے زندگی بھر نکلنے نہیں پاتا۔

اس مغالطہ کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ جس زندگی کو ہم ساٹھ ستر سال کی زندگی سمجھ رہے ہیں، یہ اصل میں ساٹھ ستر سال نہیں، بلکہ ساٹھ ستر لمحے ہوتے ہیں، جو افراد، زندگی کے ساٹھ ستر سال گزار کر قبر کے کنارے پر کھڑے ہیں، ان سے پوچھکر دیکھا جائے تو وہ یہی کہیں گے کہ زندگی کی یہ کل عمر اس طرح گزر گئی کہ پیچھے مڑکر دیکھتے ہیں تو یہ کل زندگی ساٹھ ستر لمحات ہی نظر آتے ہیں، قرآن تو یہ کہتا ہے کہ دنیا کی یہ ساری زندگی اور قیامت تک کا دور یہ آنکھ جھپکنے کے برابر ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ قریب (**وما امر الساعة الا کلمح البصر او هو اقرب**) اتنی ناپائدار زندگی کو اللہ کے ذکر سے غفلت ودوری میں صرف کرنا سخت خسارے کا سودہ ہے، یہ اغوائے شیطانی اور اغوائے نفس کی سب سے بُری صورت ہے۔